(ناول)

ناصر ملک

آرٹ لینڈ

گرلز کالج روڈ چوک اعظم (لیہ) فون: 0606-372557

کتاب ارتقائے علم کا زینہ ہے
اِس کی حفاظت کیجئے

عنوان کتاب:	جنت
مصنف:	ناصر ملک
اہتمام:	آرٹ لینڈ، چوک اعظم
سرورق:	ناصر ملک
تاریخ اشاعت:	یکم ستمبر ۲۰۰۹ء

امازون ایڈیشن

تفہیم

- استعارہ؛قسمت کا دل چسپ احوال،طفلانِ کم فہم کے ہاتھوں میں تھرکتے دھڑکتے انسانوں سے درپیش واقعات کے عجیب تانے بانے
- سچ بیانی؛اَشولال فقیر(ڈاکٹر،مفکر،سرائیکی شاعرونثرنگار)کے مکمل حالاتِ زندگی
- افسانہ؛ایک تارکِ دُنیااورجنت کی فلاسفی پر بحث کناں شخص کی داستانِ پُرالم
- فلاسفی؛سندھوسائیں(دریائے سندھ)کے پناہ گزیں،اَلم زدگانِ معاشرتِ نو خانماں خراب وبے سپر غریبوں کوسانسیں فراہم کرنے کا تقاضائے ناگزیر
- شاعری؛دریائے اُردو میں گرتی ہوئی ایک نئے''سرائیکی''میں اَشولال کا پُرعرفان کلام(شعر،نظم،کافی اورلوک گیت)،اُردوترجمہ کے ساتھ
- کہانی؛خارزارِسیاست کے فرعونوں کی طرزِوارداتِ قلب وجگر کی عکاسی
- منظرنگاری؛سندھوسائیں(دریائے سندھ)کے اطراف میں جیتے جاگتے مناظر کی زندہ عکاسی،رہن سہن،قریب المرگ وسیب کا سرافگندہ تہذیب وتمدن
- تغزل؛رواں،شائستہ اور پُراسلوب طرزِ نگارش
- کردار؛اَشولال،شناں،ہنس اورمزارخان کے علاوہ فرضی اوراستعاراتی
- واقعات؛اَشولال کی بائیوگرافی کے علاوہ قطعی تصوّراتی

قابلِ صد احترام جناب

شکیل عادل زادہ

کے نام!

جنت

(ناول)

ناصر ملک

''اے!''

''ہاں! کیا بات ہے؟''

''تمہارا نام کیا ہے؟'' اُس نے اپنی ڈھیلی الاسٹک والی نیکر اوپر کی جانب کھینچتے ہوئے پوچھا۔

گول گول متجسس آنکھوں والی گڑیا کے چمکتے ہوئے ہونٹوں میں جنبش پیدا ہوئی، ''قسمت!''

''قسمت؟ یہ بھی کوئی نام ہے؟'' اُس کے لب سکڑ گئے۔

وہ منہ بنا کر بولی، ''تمہارا نام کیا ہے؟''

وہ اپنی ننھی سی چھاتی پھلا کر فخر سے بولا، ''میرا نام ہنس ہے۔''

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ وہ زِچ ہو کر بولا، ''تم تو نِری بور لڑکی ہو۔''

''تم بھی نِرے فول ہو۔''

ہنس نے اُس کے دھوپ میں تمتماتے گالوں کو دیکھتے ہوئے ہاتھ اُٹھایا، مارنا ہی چاہتا تھا کہ مما کا حکم ذہن میں گونجنے لگا۔ مما نے کہا تھا، ''ہنس! تم ہمیشہ ہنسنے کیلئے پیدا ہوئے ہو، ہنسا کرو، ہنسایا کرو۔

کسی سے لڑنا جھگڑنا نہیں ورنہ شام کا کھانا نہیں دوں گی۔''

سامنے کھڑی گڑیا تنبیہی انداز میں انگلی اُٹھا کر کہہ رہی تھی، ''میری ماما کہتی ہیں کہ قسمت پر ہاتھ اُٹھانے والا زندہ نہیں رہتا۔ مجھ پر ہاتھ نہ اُٹھانا۔''

''تمہارا نام قسمت ہے، تم قسمت نہیں ہو۔''

''میرا نام قسمت ہے، میں قسمت ہوں۔'' اُس نے زور دے کر کہا۔

''کس کی؟''

''تمہاری! اِس پورے زمانے کی۔''

ہنس نے نفی میں سر ہلایا، ''تم جھوٹی ہو۔''

دونوں سرکاری کوارٹروں کے بیچ بنے ہوئے گراسی پلاٹ میں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ ہنس جنوبی سمت میں واقع چار نمبر کوارٹر سے نکل کر یہاں آیا تھا جبکہ قسمت اپنے ماما اور پاپا کے ساتھ تین نمبر کوارٹر میں رہتی تھی۔ وہ چھ برس کی تھی۔ ڈیڑھ ہفتہ قبل اُس کے پاپا کا یہاں ٹی ایچ کیو ہسپتال میں تبادلہ ہوا تھا۔ ہنس ساتویں برس میں تھا۔ اُس کا باپ محکمہ صحت کا اعلیٰ عہدے دار تھا۔ دونوں کی پہلی ملاقات نوک جھونک کی نذر ہو گئی۔

شام کے دھندلکے میں دونوں سوئے اتفاق ایک ہی وقت میں کھیلنے کیلئے پلاٹ میں آئے۔ قسمت نے کہا، ''اے! پاپا کہتے ہیں کہ تم بڑے افسر کے بیٹے ہو، تمہارے ساتھ بدتمیزی نہ کیا کروں۔ میں نے کوئی بدتمیزی کی ہے؟''

اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ پھر اثبات میں ہلا دیا۔

وہ چیخی، ''یہ کیا بدتمیزی ہے، سیدھی طرح بتاؤ۔''

وہ جواباً کچھ کہنا چاہتا تھا کہ پیروں تلے پانی کا احساس ہوا۔ نیچے دیکھا تو پتہ چلا کہ پلاٹ کی شمالی جانب بنی ہوئی پانی کی نالی ٹوٹی ہوئی تھی اور اگلے پلاٹ کو سیراب کرنے والا پانی اِسی پلاٹ میں بہنے لگا تھا۔ تقریباً ایک سو فٹ لانبے پلاٹ کا قلب چیرتے ہوئے انتہائی جنوبی سمت میں واقع ایک گڑھے میں گر رہا تھا۔ یہ گڑھا ایک درخت کو اکھاڑنے کے نتیجے میں رونما ہوا تھا۔

اُسے ایک خیال سوجھا۔ بولا، ''قسمت! چلو دریا دریا کھیلیں۔''

''وہ کیسے؟''

ہنس نے قسمت کا ہاتھ تھاما۔ دونوں پانی کی نالی پر پہنچے۔ بے ترتیبی سے نکلنے والے پانی کو ہاتھوں سے سپر بنا کر باقاعدہ کیا۔ پانی کی مقدار کم ہوگئی۔ گھاس نے پلاٹ میں کہیں کہیں سے جگہ خالی چھوڑ دی تھی۔ کہیں سے سبز، کہیں سے مٹیالے میدان کے وسط میں دریا بہنے لگا۔ ہنس بولا، ''اِس کا نام سندھو سائیں ہے۔ جانتی ہو؟''

اُس نے معصومیت سے نفی میں سر ہلایا۔ ہنس نے کہا، ''بابا کہتے ہیں کہ سندھو سائیں سب سے بڑا دریا ہے۔''

''ہوگا!'' قسمت نے لاپرواہی سے کندھے اُچکائے۔

دونوں کافی دیر تک دریا کا جائزہ لیتے رہے۔ ہنس کو خیال سوجھا۔ بھاگ کر اپنے کوارٹر میں پہنچا۔ اپنی ماما کے ہاتھ میں ایک کورا کاغذ تھماتے ہوئے بولا، ''ماما! ایک سوہنی سی کشتی بنا دو۔''

ماما کچن میں مصروف تھی۔ اُس نے ٹال دیا۔ وہ بابا کے پاس آ گیا۔ بابا کو لکھنے میں مشغول دیکھا تو منہ بنا کر کھڑا ہوگیا۔ بابا نے پوچھا، ''میرے پیارے سے ہنس کا موڈ خراب کیوں ہے؟''

''مجھے ماما نے کشتی بنا کر نہیں دی۔''

''لاؤ! میں بنا دیتا ہوں۔''

کشتی بن گئی تو بابا نے پوچھا، ''اِسے کس پانی میں ڈالو گے؟''

''سندھو سائیں کے پانی میں!''

بابا کی آنکھیں پھیل گئیں۔ تعجب سے بولا، ''ہائیں! یہ سندھو سائیں کہاں ہے؟''

اُس نے ہاتھ کے اشارے سے بتلایا۔ بابا نے اپنی نوٹ بک رکھ دی۔ اُس کے ساتھ چلتا ہوا باہر آیا۔ بیٹے کے کارنامے کو دیکھا۔ بیٹے کی دوست کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ نام پوچھا۔ پھر بولا، ''واقعی ہنس بیٹا! تم لوگوں نے بالکل ٹھیک ٹھاک سندھو سائیں بنا دیا ہے۔''

بابا کے جانے کے بعد ہنس نے ایک نسبتاً گہری جگہ پر کشتی پانی میں ڈالی۔ کشتی بہنے لگی۔ بہاؤ کو

روکنے کیلئے اُس نے ایک نوکیلا تنکا پانی کے نیچے والی زمین میں اُڑس دیا۔ کشتی کا ایک کونہ اُس میں ٹانک دیا۔ وہ ٹھہر گئی۔ قسمت بڑے انہماک سے یہ کاروائی دیکھ رہی تھی۔ کشتی رُکی تو اُس نے فوراً بجری کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اُس میں ڈال دیا۔ بولی، ''بھلا ڈرائیور کے بغیر کشتی کیسے چلے گی؟''

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ایسے میں نہ جانے کیا ہؤا کہ قسمت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ہنس گھبرا گیا۔ رونے کا سبب دریافت کرنے لگا۔ وہ روتے روتے بولی، ''ماما کہتی ہے کہ میں قسمت ہوں۔ میں نے تمہاری کشتی میں پتھر ڈال دیا ہے۔ ہائے اللہ! اَب یہ پتھر کون نکالے گا؟''

ہنس کے لبوں پر مسکراہٹ اُبھر آئی۔ معصومیت سے بولا، ''یہ تو میری کشتی کا ڈرائیور ہے، میں اِسے نکالنا ہی نہیں چاہتا۔''

ہنس کو یہ علم نہیں تھا کہ بجری کا ننھا سا ٹکڑا نہ جانے کہاں سے ٹھوکریں کھاتا ہؤا یہاں پہنچا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی، ''میں اِس پتھر کی جگہ پر اپنا پوڈوا اُٹھا لاؤں گی اور یہاں بیٹھا دوں گی۔ ٹھیک ہے ناں ہنس!''

اُس نے کندھے اُچکائے اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

ہنس کا باپ، ڈاکٹر اَشولال، دریائے سندھ کا سچا عاشق تھا۔ بیٹے کے جینز میں بھی شاید یہی عشق سرایت کر گیا تھا۔ اُس نے ہنس اور اُس کی دوست قسمت کی غیر معمولی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے ایک چھوٹا سا لکڑی کا گھر بنوایا، اُسے کشتی میں فٹ کروایا اور دونوں کو گفٹ دے دیا۔ اس کے ساتھ ہی ہسپتال کے مالی کو خصوصی تاکید کر دی کہ بچے جب بھی کہیں، وہ اُن کا دریا پانی سے بھر دے۔ اتوار کے دِن علی الصبح قسمت اور ہنس نے اپنی گھر نما کشتی کو پانی میں ڈالا۔ اُسے پانی میں گڑی ہوئی لکڑی کی شاخ کے ساتھ باندھ دیا۔ ایسے میں قسمت بھاگ کر اپنے گھر گئی۔ چھوٹے چھوٹے گڈے اور گڑیائیں اُٹھا لائی۔ ہنس کو مخاطب کر کے بولی، ''اپنی کشتی میں ڈرائیور کو بیٹھاؤ ناں!''

اُس نے ایک گڈا منتخب کیا۔ اُسے کشتی میں بیٹھایا۔ قسمت کا منہ پھول گیا۔ بولی، ''یہ گڈا تو بڑا فضول سا ہے۔ یہ کسی گڑیا کے ساتھ کھیلنا اور ملنا جلنا پسند نہیں کرتا۔ پتہ ہے، میری اِس گڑیا کی برتھ ڈے پر منہ پھلا کر دور بیٹھا رہا، نزدیک ہی نہیں آیا تھا۔ سچی ہنس! اس نے برتھ ڈے کیک بھی نہیں

کھایا تھا......''

نہ جانے کس وقت اُس کی نازک مزاج بلی، ''مانو'' پاس آ کر بیٹھ گئی تھی۔ غیر معمولی خاموشی کے ساتھ بیٹھ کر دونوں کی حرکات کا جائزہ لے رہی تھی۔

...۞...

بار ہا سنا ہے کہ آنکھیں مہنگے داموں بکتی ہیں، خریدی جاتی ہیں مگر یہ آج تک سننے دیکھنے میں نہیں آیا کہ کوئی اپنے منتخب خواب کو خریدنے کیلئے کمر بستہ ہو کر منڈی میں نکلا ہو۔ خواب دُنیا کے کسی بازار میں بکنے کیلئے نہیں رکھے جاتے کیونکہ دیکھنے والی آنکھیں تول کر خریدے ہوئے خواب نہیں دیکھا کرتیں۔ ہمیشہ کھلی مگر بے بصارت آنکھیں ہی دماغ کو من چاہے مناظر دکھاتی ہیں۔ کہیں بھی خواب دیکھنے پر آمادہ دماغ نہیں بکتا اور نہ ہی بے بصارت آنکھوں کا کوئی طلبگار سامنے آتا ہے۔ سیانے اِس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ قسمت بھی انسانی خوابوں کو اہمیت نہیں دیتی مگر وسیم بزدار، جو اردو کا لیکچرر رہا تھا مگر پروفیسر کے طور پر مشہور تھا، نے اندھا دھند دولت لٹانے کے ساتھ ساتھ بے انتہا مشقت کا مسلسل عذاب جھیلنے کے بعد اپنے خواب کو تکمیل کی حتمی شکل دے ہی لی۔ گزشتہ تین سالوں میں اُس نے اپنے عجیب اور ناقابل عمل خواب کو جیتا جاگتا منظر بنا کر دریائے سندھ کے گہرے پانی کی سطح پر یوں سجا دیا کہ دُنیا بے یقین نظروں کو یقین دینے کیلئے جوق در جوق وہاں پہنچنے لگی۔

نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی ٹولیاں قلقاریاں مارتے ہوئے عارضی اور غیر مستعمل پتن پر آتیں، دوربینوں کی مدد سے پروفیسر وسیم بزدار کی بنائی ہوئی جنت کا نظارہ کرتیں اور آنکھوں میں پُرستائش بے یقینی بھر کر کہتیں، ''ہائے! دُنیا میں کوئی تو ایسا شخص دکھائی دیا جس نے جو چاہا، بنا لیا۔ سچ کہتے ہیں انسانی محنت اور لگن کے مقابلے میں خواب تو خواب رہے، ماورائیت بھی ٹھہر نہیں سکتی۔''

ڈھلتے سورج کی روپہلی کرنوں تلے چمکتے پانی پر تیرتی ہوئی پروفیسر وسیم بزدار کی ''جنت'' پر نظریں جمائے پانچ سات نوجوانوں کی ٹولی گنگ کھڑی تھی۔ ایسے میں ایک تعجب آمیز آواز اُبھری، ''آج

تک اِن آنکھوں نے دیکھا نہ کانوں نے سنا۔آج دیکھ رہا ہوں تو یوں لگ رہا ہے جیسے کوئی ٹرانس پے رنسی ہے جو دھیرے دھیرے مجھے میری سائیکالوجی سمیت اپنے حصار میں لیتی جاتی ہے...... دوستو! جو میں دیکھ رہا ہوں، کیا تم بھی وہی دیکھ رہے ہو؟''

کوئی جواب سنائی نہیں دیا۔ایسے میں آفتاب نے گہرا سانس حلق میں اُتار کر تھکے تھکے لہجے میں کہا،''دماغ صرف آنکھوں کے دیکھے پر تکیہ کئے بیٹھا ہے۔زبان ہے،نہیں ہے......اُسے کوئی پرواہ نہیں۔ہم وہی آبی جنت دیکھ رہے ہیں جو تمہیں دکھائی دے رہی ہے مگر افسوس! ہم پروفیسر کی بنائی ہوئی جنت میں قدم نہیں رکھ سکتے۔''

کالج میں حسن کی تمازت پر چمکتی جوان آنکھیں خوابوں سے بھری رہتی ہیں۔ہر خواب کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔کوئی ایسی شکست کو اپنی آنکھوں میں سجائے رکھتا ہے جسے پانے کے بعد شکست و فتح کے مابین کوئی فرق حائل نہیں رہتا۔کوئی ایسی فتح کیلئے تمام رات جاگتا رہتا ہے جو فتحیابی کے بعد اپنا آپ گروی رکھ دیتی ہے......ان میں کئی ایسی جوانیاں بھی ہوتی ہیں جو سمجھتی ہیں کہ زندگی کی تمام تر رعنائیاں سونے اور چاندی کی چمک اور سکوں کی کھنک سے جُڑی ہیں۔اُنہیں محبوب کی آنکھوں کی خیرہ کن چمک اور چوڑیوں کی کھنک پر اعتبار نہیں ہوتا۔اِنہی ملی جلی اَن گنت جوانیوں کے بیچ پروفیسر وسیم بزدار کی ادھیڑ عمری نے ایک عجب خواب بن لیا جس نے اُسے کالج بھر میں تضحیک کا نشانہ بنا کر رکھ دیا تھا۔

فرسٹ ڈے فول کی سیڑھی پر قدم رکھنے والے نو آموز شکاریوں سے لے کر پرنسپل تک ہر کوئی اُسے سنکی اور فاتر العقل قرار دینے پر تلا ہوُا تھا۔وہ سب سے بے نیاز اپنی من چاہی دُنیا کی تعمیر میں مگن رہا......اُس کا تین سالہ انہماک آج ایک واضح اور نظریاتی لباس پہن کر کالج کے نوجوانوں کے تنفس کو تہس نہس کر رہا تھا۔ہر کوئی خود کو اِس لباس میں فٹ کر کے دیکھ رہا تھا......کوئی اکیلا......کوئی اپنی محبوبہ کے ساتھ تو کوئی نوٹوں کے ڈھیر پر بیٹھا ہوا۔ادھیڑ عمری نے خوابوں کی عمر کو ہلچل دینے کے ساتھ ساتھ حقیقت پسندوں کے کاز کو بھی للکار کر دَم بخود کر دیا تھا۔

آفتاب کے کندھے سے کندھا ملا کر وجدان پانی میں چند قدم اندر تک بڑھے ہوئے خشکی کے

ٹکڑے پر کھڑا تھا۔ وہ سائنس کا طالب علم تھا۔ زندگی کے ہر پہلو کو سائنسی نقطہ نظر سے دیکھنے کا عادی ہو چلا تھا۔ دوربین میں پورے انہماک سے دیکھتے ہوئے خود کلامی کے سے انداز میں بولا، ''بہت حیران کن! میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ صرف چونتیس لاکھ روپے میں انجینئرنگ کا اتنا بڑا شاہکار تیار ہوسکتا ہے۔ دیکھو آفتاب! پروفیسر نیکر پہنے کتنے مزے سے ایزی چیئر میں بیٹھا ہے۔ اُس کے خال و خد دکھائی نہیں دیتے مگر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اِس سمے وہ دُنیا کی سچی خوشی سے ہم کنار ہورہا ہے۔ اُس نے اپنی مرضی کی دُنیا تخلیق کر لی ہے۔ ویری ایکسی لینٹ!''

آفتاب نے دوربین آنکھوں سے ہٹا کر گلے میں لٹکا لی۔ ٹھنڈی ریت پر پاؤں پسار کر بیٹھ گیا۔ اُس سے چند قدموں کے فاصلے پر شرٹس اُتارے نذیر، شہزاد اور ارشد چاروں شانے چت ریت پر لیٹے ہوئے تھے۔ آفتاب نے ایک نظر اُن پر ڈالی۔ دوربین کے بغیر دریا کے وسط میں کھڑے بڑے سے خود ساختہ آبی بیڑے کے دھندلے سے عکس کو دیکھا اور کہا، ''تم ٹھیک کہتے ہو وجدان! پروفیسر دُنیا کے شور اور ہیجان سے تنگ آچکا تھا۔ وہ انسانی دُنیا سے کامل فرار چاہتا تھا، بہترین طریقہ ڈھونڈنے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ وہ زمین پر رہتے ہوئے بھی زمین کا نہیں، پانی کا حصہ بن گیا ہے۔ پانی نقش بناتا نہیں، مٹاتا ہے۔ پروفیسر نے اِسی لئے بہتے پانی پر مکان تعمیر کیا ہے...... کوئی دخل نہ دے...... کوئی اپنا وجود ثابت کرتے ہوئے اُس کے وجود کو جھٹلانے کی جرأت نہ کر سکے۔ واقعی پروفیسر بہت عظیم انسان ہے۔''

لیٹے ہوئے تینوں دوست خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ اُنہیں آفتاب اور وجدان کی حیرت سے کوئی سروکار نہیں تھا کیونکہ وہ استعجاب کا یہ مرحلہ چند منٹوں میں ہی عبور کر کے لاتعلق ہو چکے تھے۔

وجدان کہہ رہا تھا، ''دیکھو آفتاب! وہ اُردو کا پروفیسر ہونے کے ساتھ ساتھ کتنا بڑا سائنس دان ثابت ہوا ہے۔ سیلولر رابطہ، بجلی، انٹرنیٹ اور ڈش ریسیور سمیت دُنیا کی ہر قابلِ ذکر پُرآسائش ایجاد اُس کے پاس ہے اور اُسے یوٹیلٹی بلوں کی ادائیگی کا بھی کوئی تفکر نہیں ہے۔ کتنا خوش نصیب ہے۔ جنگل میں منگل سنتے آئے ہیں، دریا میں منگل کی تابنا کی پہلی مرتبہ دیکھ رہے ہیں۔''

آفتاب نے پوچھا، ''پروفیسر نے بجلی کہاں سے حاصل کی ہے؟''

وجدان مسکرانے لگا۔ دل ہی دِل میں آفتاب کی کم عقلی پر ہنستے ہوئے سوچنے لگا، ''یہی تو سائنس ہے، پڑھ لیتے تو ایسا احمقانہ سوال نہ کرتے۔''

بولا، ''دوربین لگاؤ، میں تمہیں بجلی کا سورس دکھاتا ہوں۔''

آفتاب نے گلے میں لٹکتی ہوئی دوربین آنکھوں سے لگائی۔ وجدان نے کہا، ''بیڑے کے اگلے دائیں کونے کوغور سے دیکھو۔ تمہیں پانی میں نصف ڈوبے ہوئے بڑے بڑے فولادی پر دکھائی دیں گے۔ اِن پروں کے ساتھ جدید ترین الیکٹرک جنریٹر منسلک ہے۔ اِسی کونے میں اوپر کی طرف دیکھو۔ بڑا سا پول دکھائی دیتا ہے۔ وہ کنکریٹ کا بناہؤا ہے اور زمین میں چالیس پینتالیس فٹ کی گہرائی تک گڑا ہؤا ہے۔ یہ نہ صرف بیڑے کو یہاں مستقل قیام دیتا ہے بلکہ جنریٹر کی تنصیب میں بھی بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ اِس ستون کے اوپر تمہیں کچھ چیزیں دکھائی دے رہی ہیں مگر شناخت میں نہیں آرہیں۔ یہاں ایک واٹر پمپ نصب ہے جو ستون کے اندر ہی اندر زیرِ زمین تک جانے والے پائپ کے ذریعے صاف پانی کھینچ کر بیڑے کو سپلائی کرتا ہے۔ پمپ کے ساتھ ہی تین بیٹریاں پڑی ہیں جو نہ صرف برقی رو کو ہموار کرتی ہیں بلکہ جنریٹر میں اچانک پیدا ہونے والی کسی خرابی کی صورت میں آٹھ سے دَس گھنٹوں تک بجلی کی سپلائی بحال رکھتی ہیں......''

''کنکریٹ کا اتنا لمبا پول دریا کے وسط میں کیسے نصب کیا گیا؟''

''پروفیسر کا ایک شاگرد دریاؤں پر پل بنانے والی ایک معروف کنسٹرکشن کمپنی میں اہم پوسٹ پر کام کر رہا ہے۔ اُس کی ذاتی درخواست پر کمپنی کے انجینئرز نے اِس پول کو دریا میں نصب کیا ہے۔ یہ بہت مضبوط ہے۔ کسی بھی درجے کے سیلاب میں اُس کے ٹوٹنے یا زمین سے باہر نکل آنے کا اندیشہ نہیں ہے۔'' وجدان نے تفصیل سے بتلایا۔

''اِس کی تعمیر میں کتنا عرصہ لگا؟''

''تین چار ماہ تو لگے ہی ہوں گے۔''

''خرچ بھی کافی آیا ہوگا۔'' آفتاب جوں جوں سوچتا جاتا تھا، حیرت کے سمندر میں اُترتا جاتا تھا۔

’’کمپنی نے صرف اڑھائی لاکھ روپے پروفیسر سے لئے تھے۔‘‘

’’اڑھائی لاکھ؟‘‘ آفتاب کی آنکھیں پھٹنے کو آ گئیں۔

’’تو اور کیا؟‘‘ وجدان نے اپنی معلومات کا دبدبہ جمایا، ’’تم کیا سمجھتے ہو، یہ عام سا پول ہے...... بھائی جی! اگر پروفیسر کا شاگرد اُس کمپنی میں نہ ہوتا تو یہی کام کمپنی بیس پچیس لاکھ کے عوض بھی کرنے پر تیار نہ ہوتی۔‘‘

’’یہ طلسماتی بیڑہ کس نے تیار کیا ہے؟‘‘ آفتاب نے پوچھا۔

’’دریا کے اطراف کی بستیوں میں کئی کاریگر موجود ہیں جو کشتیاں اور بیڑیاں بنا کر روٹی روزی کرتے ہیں۔ یہ اُن غریب ہنرمندوں کے ہنر کا شہکار ہے۔ پروفیسر لاکھوں روپے میں کچی لکڑی بالائی علاقوں سے خرید کر یہاں لایا تھا۔ یہ دِنوں کی بات نہیں، سالوں کی اَن تھک محنت کا قصہ ہے۔‘‘

’’پروفیسر کے بیڑے کے بارے میں تم اتنا کیسے جانتے ہو؟‘‘ آفتاب کی حیرت بجا تھی۔

وجدان نے وضاحت کی، ’’میرا حقیقی کزن افتخار بیگ پروفیسر سے بہت محبت کرتا ہے۔ اُس نے بیڑے کی تیاری میں بھرپور معاونت کی ہے بلکہ یوں سمجھو کہ پروفیسر کی آئیڈیالوجی کو مظہری شکل دینے میں بنیادی کردار اُسی نے ادا کیا ہے۔ وہ انجینئر ہے۔ اُس نے بجلی کے کام سے نابلد ہونے کی بدولت ایک الیکٹریکل انجینئر دوست کی خدمات بھی حاصل کر رکھی تھیں۔ مجھے گاہے بگاہے تفصیلات سے آگاہ کرتا رہتا تھا۔ مجھے پروفیسر کے اِس منصوبے کو مکمل ہوتا دیکھنے کا بہت زیادہ اشتیاق تھا مگر پروفیسر نے افتخار کے علاوہ کسی بھی شخص کو بیڑے میں اُترنے کی اجازت نہیں دی۔ یوں میں اِس شاہکار کو بنتا دیکھتا رہا، کام کرتا دیکھنے کی حسرت دل میں لئے کڑھتا رہتا ہوں۔‘‘

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ کالج کے پرنسپل سمیت تمام کولیگز نے پروفیسر کا شاہکار دیکھنے کا اصرار کیا تھا مگر پروفیسر نے سب لوگوں کو نہائت بے رخی کے ساتھ پتن پر سے ہی ناکام لوٹا دیا تھا۔ اُس نے موبائل فون پر سختی سے انکار کرتے ہوئے کہا تھا، ’’دنیا پہاڑوں، دریاؤں اور شہروں کا نام نہیں، زمین کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے انسانوں کے تحرک اور موجودگی کا نام ہے۔ میں اِس سے نفرت کرتا ہوں۔ میں زندگی کی ہویت کی ہر نوعیت سے نفرت کرتا ہوں۔ اپنی غیر معمولی نفرت کے سبب میں

نے تم لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کی ہے۔ مجھے ملنے اور میری جنت کو دیکھنے کیلئے مت آیا کرو، تمہارے پلید اور ناپاک قدموں سے میری جنت کا قالین خراب ہوتا ہے اور میں یہ برداشت نہیں کرسکتا......''

اتنے درشت اور پُرنفرت انکار کے بعد کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ دریا کے گہرے پانی کو لانچ، کشتی یا بیڑی کے ذریعے عبور کرکے پروفیسر کی جنت کے دروازے پر جا کر دستک دیتا اور خشک مزاج پروفیسر کی جھڑکیاں سُن کر الٹے قدموں لوٹ آتا۔

آفتاب کی حیرانی نیا رُخ اختیار کرگئی۔ بولا،''یار وجدان! پروفیسر نے اتنی بڑی کشتی کو دریا میں لانچ کیسے کیا ہوگا؟''

وجدان ہنسنے لگا۔ سمجھانے لگا،''ارے بے وقوف انسان! جنت کی فاؤنڈیشن دریا کے باہر تیار کی گئی تھی جو تین بڑے بڑے پارٹس کی شکل میں تھی۔ اُسے دریا کے پانی میں اُتار کر جوڑا گیا اور پھر اُس پر بقیہ تعمیر کاری کا کام مکمل گیا گیا۔''

''سیلاب کے دنوں میں اِس کے ڈوب جانے کا خطرہ تو بہر حال ہوگا ہی......''

''جنت، کنکریٹ کے پول کے ساتھ ایک سٹیل روپ اور فولڈنگ کلپ کے ذریعے بندھی ہوئی ہے۔ پانی کی کمی بیشی پر جنت اوپر نیچے ہوجاتی ہے، ڈوبتی نہیں ہے۔ فاؤنڈیشن کی لکڑی پر کوئی خاص کیمیکل لگایا گیا ہے جو لکڑی کو دھوپ اور پانی کے مضمرات سے بچائے رکھتا ہے۔ میرا نہیں خیال کہ یہ کبھی ڈوبے گی۔ ویسے بھی اس پر کبھی اضافی وزن نہیں لادا جائے گا اور نہ ہی کبھی دریائی طغیانی میں سفر کرے گی۔ اتنی بہترین حفاظتی تدابیر کی موجودگی میں اِس کے ڈوبنے یا تباہ ہونے کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں۔'' وجدان نے بتلایا۔

''اوہ......ہوں!'' آفتاب کے منہ سے استعجاب آمیز مہمل آواز برآمد ہوئی اور وہ خاموش ہوگیا۔

وجدان کی آنکھوں سے لگی ہوئی دوربین ایک جگہ ٹھہر گئی۔ پانی کی سطح سے فٹ ڈیڑھ فٹ اوپر سرخ پینٹ شدہ لکڑی کے حروف دکھائی دے رہے تھے۔ زیر لب بڑبڑایا''جے، اے، ڈبل این، اے، ٹی۔ جنت...... ہاہ! یہ تم نے بڑھاپے میں کیسی ویران جنت بنا ڈالی ہے سنکی پروفیسر! اِس میں

کوئی جوانی موجود نہیں، یہاں کوئی حور دکھائی نہیں دیتی، شراب بھی نہیں ہے...... یہ کتنی عجیب جنت ہے!''

وجدان کے ساتھی کچھ کھانے پکانے کی تیاریاں کرنے لگے۔ شام ڈھلنے کو تھی۔ اندھیرا پھیلنے کو تھا۔ وجدان نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا، ''آفتاب! تم نے ٹھیک کہا تھا۔ اندھیری رات ہے، ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے گا۔ کسی چاندبھری رات میں یہاں پکنک منانے کیلئے آتے تو دیر تک انجوائے کرتے...... خیر! ویسے بھی ہم جنت کو دیکھنے کیلئے آئے تھے، وہ گھپ اندھیرے میں کتنی روشن اور نظر کش دکھائی دیتی ہے، دیکھ لیتے ہیں۔''

سہ پہر کو ایک کانٹے میں کوئی سیر سوا سیر کی مچھلی پھنسی تھی۔ اُسے چھیل بنا کر نمک لگا کر رکھ دیا گیا تھا تاکہ شام کو پکائی جا سکے۔ دریا کا گمنام پتن آباد ہو گیا۔ لڑکوں نے جھٹ پٹ میں سالن تیار کیا۔ اِس دوران نذیر قریبی گاؤں کے ایک تنور سے روٹیاں لگوا لایا۔ دسترخوان سجنے تک ماحول بالکل سیاہ ہو چکا تھا۔ موم بتی کی ناکافی روشنی میں وہ کھانا کھانے کے دوران بار بار ''جنت'' کی طرف دیکھتے رہے اور انتظار کرتے رہے کہ کب پروفیسر وسیم بزدار اپنے بیڑے کو روشن کرتا ہے۔ فلموں میں دیکھتے آئے تھے کہ سطح سمندر پر پھسلتا چلتا بحری جہاز رات کو روشن شہر کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ آج وہ ایک گھر پر مشتمل شہر کو رنگ و نور میں نہایا ہوا دیکھنا چاہتے تھے مگر شاید پروفیسر اَبھی تک جنریٹر کے بڑے بڑے آہنی بازوؤں سے چند فٹ کے فاصلے پر عجیب ساخت کی بنی ہوئی سیڑھی کے زینے پر براجمان تھا۔ یہاں بیٹھنے پر دریا کا پانی پروفیسر کے گھٹنوں تک چڑھ جاتا تھا۔

نذیر اپنے سفری بیگ سے کوک کی بوتل نکال لایا۔ باری باری نوش کر رہے تھے کہ اچانک جیسے دریا جاگ پڑا ہو۔ پروفیسر کی جنت میں رات کا پرنور استقبال ہو رہا تھا۔ صحن نما عرشے پر سفید انرجی سیور جل اُٹھے۔ عرشے کے پیچھے بنے دونوں چوبی کمروں کی کھڑکیوں سے سرخ اور نیلی روشنی جھانکنے لگی۔ عقبی سمت میں بھی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ آفتاب کے منہ سے کلمہ تحیر نکلا، ''واو...... کتنا خوبصورت منظر ہے۔ رواں پانی پر اوپر نیچے ہوتی جنت اور پانی میں مرتعش روشنیوں کے عکس...... دیکھو وجدان دیکھو...... زندہ باد پروفیسر......''

...❀...

پلاٹ کی سراؤنڈنگ میں آگے آگے ''مانو'' دوڑتی جاتی تھی، پیچھے پیچھے منحنی وجود والا ہنس کا چہیتا ''ڈوگی'' لڑھکتا جاتا تھا۔ وہ ڈوگی کے ہاتھ نہیں لگ رہی تھی۔ جھکائی دے کر صاف نکل جاتی، کبھی آگے آگے دوڑتے اچانک رُک کر ایک آدھ پنجہ ڈوگی کے منہ پر جڑ دیتی۔

ہنس اور قسمت کے اردگرد بہت سے لوگ جمع تھے۔ وہ سب اُس کی کشتی کی تعریفیں کر رہے تھے۔

ہنس کی ماما نے کہا، ''بیٹا! مجھے اپنی کشتی میں بیٹھنے دو۔''

قسمت جھٹ سے بولی، ''نہیں آنٹی! پوڈو کسی کو کشتی میں بیٹھنے کی اجازت نہیں دیتا۔''

قسمت کی ماما نے تعجب سے پوچھا، ''یہ پوڈو کون ہے؟''

''آپ کو کشتی میں بیٹھا ہوا نظر نہیں آ رہا؟'' وہ منہ بنا کر بولی۔

''یہ کسی کو کشتی میں کیوں بیٹھنے نہیں دیتا؟''

قسمت نے مدد طلب نگاہوں سے ہنس کو دیکھا۔ ہنس نے کہا، ''اِسے بندے اچھے نہیں لگتے ناں۔ اِس نے قسم بھی کھا رکھی ہے۔''

ہنس کے بابا نے مسکرا کر پوچھا، ''یہ اکیلا سارا دِن کیا کرتا رہتا ہے یہاں بیٹھ کر؟''

قسمت نے بلاجواز جھینپ کر کہا، ''یہ فینی کا انتظار کرتا رہتا ہے۔''

''افوہ! یہ فینی کون ہے؟''

قسمت نے کن اکھیوں سے ہنس کی طرف دیکھا پھر بڑی معصومیت سے بولا، ''یہ اُس کی دوست کا نام ہے۔''

''دکھاؤ۔ ہم بھی دیکھیں کہ فینی کیسی ہے؟''

''وہ یہاں نہیں ہے۔''

''کہاں ہے؟''

''وہ اُدھر ہے، دُور!'' قسمت نے اپنے گھر کی طرف اشارہ کیا۔

ہنس نے اچانک کہا، ''پوڈو نے قسم اُٹھا رکھی ہے کہ اپنی کشتی میں کسی کو سوار نہیں ہونے دے گا۔

پھر وہ فینی کو کشتی پر کیوں چڑھنے دے گا؟''

قسمت کا چہرہ بجھ سا گیا۔ اپنے ننھے ننھے ہونٹوں پر انگلی پھیرتے ہوئے کھوئے کھوئے انداز میں بولی، ''جب میں فینی کو کشتی پر چڑھادوں گی تو پوڈو کون ہوتا ہے اُسے نیچے دھکا دینے والا؟''

شام کے دھندلکے میں پلاٹ میں قہقہوں کا ملا جلا شور اُبھرنے لگا۔ بچوں کی نہ سمجھ میں آنے والی باتوں پر حظ اُٹھانا بڑوں کا محبوب مشغلہ ہوتا ہے۔

...(☼)...

دریا کی خاموش اور نم فضا میں سریلی اور بلند آواز میں پروفیسر وسیم بزدار کسی نادیدہ وجود سے مخاطب تھا۔

بھٹی نال کتھاں ایں راوے دے
ساکوں لوک پرانے مِلدے ہن
نئیں پتہ جو کیہڑے پتن اُتے
اوہے مور مُہانے مِلدے ہن

ہموار آواز میں لرزش محسوس ہونے لگی۔ وہ تھم گیا۔ یوں، جیسے غریب کے گھر میں کڑا وقت تھم جاتا ہے۔ بڑبڑایا، ''ظالموں نے سندھ کے پرانے وسنیک ملاح مور مُہانوں سے اتنی نفرت کی ہے کہ وہ اپنی شناخت بدلنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ جب قوم کے لوگ اپنی شناخت اور عنوان بدلنا شروع کر دیں، قوم مٹنے لگتی ہے۔ سندھوسئیں کے قاتل بھی مرنے والے ہیں......''

کچھ دیر بہکے بہکے انداز میں سوچتا رہا، پھر سر جھٹک کر اپنی جنت کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اپنے غم و غصہ کے اظہار کیلئے اُس کے پاس اَبھی بہت وقت پڑا تھا۔

سراؤنڈنگ میں لگی ہوئی نفیس آہنی پائپ کی ریلنگ کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اُس نے فاخرانہ انداز میں جنت کے گرد چکر کاٹا۔ عادتاً ہر چیز کا جائزہ لیا۔ دس ضرب دس فٹ کے دونوں چوبی کمروں کے دروازے کھول کر اندر جھانکا اور لائٹس روشن کر دیں۔ بڑی کھڑکیوں کے طاقوں میں لگے

ایکریلک گلاس سے روشنیاں رنگ بدل بدل کر جھانکنے لگیں۔ وہ دونوں کمروں کے بیچ میں واقع تین دروازوں والے باتھ روم میں داخل ہوا۔ عین وسط میں کھڑا ہو کر تعریفی نظروں سے گھوم کر چاروں طرف دیکھتا رہا پھر زیرِ لب مسکراتا ہوا باتھ روم سے نکل کر ایلومنیم کی بنی ہوئی کم وزنی سیڑھیاں چڑھ گیا۔ کمروں کی چھت پر اُس کے بیٹھنے کا پر تعیش سامان رکھا ہوا تھا۔

اُس کا دماغ خاصا صحت مند واقع ہوا تھا۔ اُس نے ''جنت'' میں ضرورت کی ہر چیز اِس ترتیب سے رکھی تھی کہ بارش یا آندھی وغیرہ جیسی ہنگامی حالت میں اُسے کوئی شئے بھی سنبھالنی نہ پڑے۔ فقط اپنے تن کو سمیٹ کر کمرے میں جا کر ہر فکر سے آزاد ہو سکتا تھا۔ چھت کے اطراف میں ایلومنیم کی ریلنگ لگی ہوئی تھی۔ وہ ایک گوشے میں پڑی چار پائی پر بیٹھ گیا۔ دریا کے پانی سے ٹکرا کر اوپر اُٹھنے والی نم اور ٹھنڈی ہوا جسم میں فرحت اور نیا پن بھر رہی تھی۔ ایسے میں اُس نے بلند آواز میں خود کلامی کی، ''اے ہوا! اے دریا! مل کر میری محنت کی داد دو کہ میں نے تم جیسی بے رنگ اور بے عشق چیزوں کو بھی بولنے پر مجبور کر دیا ہے۔ تمہیں اپنی جنت کا حصہ بنا دیا ہے۔''

اُس نے اطراف میں نظر دوڑائی۔ جہاں تک جنت کی روشنیوں کا عمل دخل واقع ہو رہا تھا وہاں تک پانی کی سطح چمک رہی تھی۔ اُس سے آگے گھپ اندھیرا طاری تھا۔ ایسی ہی زندگی وہ گزار کر یہاں پہنچا تھا۔ اُس کے ماضی میں بھی فقط وہیں تک اجالا تھا جہاں تک جنت کی روشنی پہنچ رہی تھی۔ اُس سے آگے بالکل ایسا ہی گھپ اندھیرا ہر جذبے، ہر واقعے اور ہر رشتے کو نگل چکا تھا۔ وہ سوچنے لگا، ''آدم کو جنت سے نکال کر دُنیا میں پھینک دیا گیا تھا۔ مجھے دُنیا نے اپنے رویوں سے دلبرداشتہ کر کے میری بنائی ہوئی جنت میں ڈال دیا ہے۔ آج اگر دُنیا کے جہنم میں رہنے والے یہاں آ کر دیکھیں تو تأسف سے اپنا سر پیٹ لیں۔ اُنہیں دکھا دوں کہ جنت کیا ہوتی ہے تو وہ کبھی گھروں کو نہ لوٹ سکیں مگر میں اُن سے سخت نفرت کرتا ہوں، اُنہیں جلتے مرتے دیکھ کر جشن تو منا سکتا ہوں مگر اُنہیں اچھی چیز دیکھنے کی اجازت نہیں دے سکتا......''

جنت چھوٹے چھوٹے ہلکورے لے رہی تھی۔ ہلکوروں کی تان پر وہ بے خود ہوتا جا رہا تھا۔ چار پائی پر نیم دراز ہو گیا۔ سوئے فلک تاحدِ نگاہ اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ ذہن پر نیند کی غنودگی طاری ہو رہی تھی

کہ اچانک اُس کی نیکر کے بیلٹ سے بندھے چرمی بٹوے میں رکھا ہوُا موبائل فون کا بزر بج اُٹھا۔ اُس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھر آئے۔ کروٹ بدل کر کنکریٹ کے پول پر لگے دو رَنگے انرجی سیور کو دیکھنے لگا۔ پیٹھ کر لینے سے فون خاموش نہیں ہوا۔ بے جان تھا۔ جاندار ہوتا تو بے رُخی پر روٹھ کر خاموش ہو جاتا۔ کافی دیر تک بیل بجتی رہی۔ اُس نے فون چرمی پرس سے باہر نہیں نکالا۔ ایک بار خاموش ہونے والا فون دوبارہ چیخنے لگا۔ اُس نے زیرِ لب گالی دے کر فون نکالا۔ سکرین پر وجدان کا نمبر دیکھ کر وہ مزید کوفت زدہ ہو گیا۔

با دلِ نخواستہ فون آن کر کے بولا، ''وجدان! میں افتخار بیگ سے بات کروں گا۔ اُسے بتلاؤں گا کہ تم نے مجھے تنگ کرنے کا سلسلہ چلا رکھا ہے۔ پہلے بھی کہا تھا، اَب بھی کہتا ہوں، تم اور تمہارے دوست حتیٰ کہ تمہاری دُنیا میں رہنے والے سبھی لوگ مجھ سے شدید نفرت کرتے ہیں، میں بھی نفرت کرتا ہوں۔ اگر تم لوگوں کے ساتھ رابطے کی کوئی گنجائش ہوتی تو میں یہاں کیوں چلا آتا؟ پلیز! پکنک پر آئے ہو، موج مستی کرو اور واپس چلے جاؤ۔ اور اگر میری جنت کا نظارہ کرنے کیلئے آئے ہو تو خاموشی سے دیکھو اور حسرت بھری آہیں سینے میں اُتار کر دفعان ہو جاؤ وگرنہ...... مجھے اپنی تنہائی اور جنت کی حفاظت کرنا آتی ہے۔''

وجدان نے اُس کی بلا توقف گفتگو کے بیچ میں اُسے مؤدبانہ انداز میں ٹوکنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ بات ختم ہونے پر ملتجیانہ انداز میں بولا، ''سر! آپ غلط سمجھے ہیں۔ آپ ہمیشہ ہمارے آئیڈیل رہے ہیں اور آپ کی جنت کا ماحول بھی آپ کی طرح ہمارا آئیڈیل ہے۔ پلیز! ہمیں ایک مرتبہ، صرف ایک بار چند منٹوں کیلئے جنت میں آنے کی اجازت دیجئے۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ ہم وہاں کوئی سوال نہیں کریں گے، تعریف و تبصرہ بھی نہیں کریں گے۔ پلیز سر!''

پروفیسر کے چہرے پر عجیب سی طمانیت پھیل گئی۔ اوپر والے ہونٹ کو دانتوں کے بیچ میں سے باہر کھینچتے ہوئے اُس نے جواب دیے بغیر فون بند کر دیا۔ جانتا تھا کہ اُس کی خاموشی کو انکار سمجھ لیا گیا ہے۔ وجدان کو دوبارہ فون پر رابطہ کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

جون کے مہینے میں بھی دریائی ہوا نے جنت میں سردی اُتار دی تھی۔ پروفیسر سوچنے لگا، ''ٹھنڈی

ہوا......دُنیا ساز مفت چلاتا ہے۔ چیونٹی سے لے کر ہاتھی تک ٹھنڈے ٹھار ہو جاتے ہیں۔ دُنیا کے فرعون چند کیو بک فٹ ٹھنڈی ہوا دیتے ہیں۔ صرف اتنی سی ہوا جو پورا مہینہ چل کر جسم کو اتنا ٹھنڈا نہیں کر پاتی کہ اُس کا بل ادا کرتے وقت دماغ چند لمحوں کیلئے ہی ٹھنڈا رہ سکے۔ اے سندھ ساگر کی بانکی ہوا! ذرا تھم تھم کے چل کہ تجھے اپنی روح میں جذب کرنے کیلئے میں ساگر کی پُرعافیت گود میں اپنی جنت بنائے بیٹھا ہوں۔''

وہ من چاہی جذبی کیفیت میں پور پور ڈوبا ہوا تھا۔ بڑبڑایا،''اے دُنیا! اے وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم کا شکار جہنم کے رہائش پذیرو! دیکھو۔ جب تک سندھ ساگر کا پانی چلتا رہے گا، مجھے مفت بجلی ملتی رہے گی۔ میرا دَس انچ کا ٹی وی چلتا رہے گا، سیٹلائٹ ریسیور تیرہ چودہ چینلز کی رنگینیاں مجھ تک پہنچاتا رہے گا اور میرا کمپیوٹر میرے سٹڈی روم میں گلوبل ویلیج کا استعارہ بن کر میرا دُنیا جہان سے رابطہ بحال رکھے گا۔ وولٹیج کی کمی بیشی نہیں ہوگی، فریج، پنکھے اور بلب کسی خرابی کے بغیر ہمیشہ چلتے رہیں گے۔ یہاں کوئی ناانصافی نہیں ہے، یہاں کوئی دُکھ نہیں ہے......تمہارے پاس سوائے دُکھ کے کچھ بھی نہیں ہے۔ جیسے میں تمہارے مقابل میں آئینہ رکھے بیٹھا ہوں، ایسے ہی تمہارے پاس اگر کچھ موجود ہے تو سامنے لے آؤ۔''

سنتے آئے ہیں کہ جنت کی چاردیواری نہیں ہوتی، دروازے بند کرنے اور کھولنے کا عذاب بھگتنا نہیں پڑتا، کچھ سنبھالنا نہیں پڑتا، کسی کو خراج یا جرمانہ نہیں دینا پڑتا، کبھی کسی ادائیگی پر دل کو دُکھ کا احساس نہیں ہوتا...... جب جی چاہے سو جاؤ، جب جی چاہے جاگو اور جو چاہے کرتے پھرو۔ لباس پہننے کی کوئی مجبوری نہ اِس کے پھٹنے گھسنے کا واہمہ۔ کوئی روکنے والا نہیں، کوئی ٹوکنے والا نہیں۔ سنے ہوئے میں کچھ مبالغہ بھی شامل کر لیا جائے تب بھی تسلیم کرنا پڑتا تھا کہ پروفیسر وسیم بزدار واقعی ایک انسان پر مشتمل جنت تعمیر کر چکا تھا۔ جنت سے حظ کشید کرتے ہوئے خوشی سے لہرا رہا تھا، بل کھا رہا تھا اور گام بہ گام دُنیا والوں پر قہقہے لگا رہا تھا۔ اُسے یہ احساس طمانیت بخشتا تھا کہ اُس کے سوا بھری دُنیا میں کسی کو جنت بنانے کا خیال نہیں آیا تھا۔ ہر کوئی بلند و بالا کوٹھیاں اور دہشت ناک محل تیار کرنے میں سرگرداں دکھائی دیتا تھا۔

شب کے پچھلے پہر میں ہوا نے غیر معمولی خنکی پکڑ لی تھی جس کے باعث پروفیسر کی آنکھ کھل گئی۔ پائنتی کی جانب دیکھا، سوتی کھیس دکھائی نہیں دیا۔ یاد آیا کہ وہ پچھلی رات سے بیڈ روم میں ہی پڑا ہے۔ بادلِ نخواستہ اُٹھا۔ رات دیکھنے کی چیز نہیں ہوتی مگر اُس نے ریلنگ کو تھام کر بڑے غور سے چہار اطراف میں دیکھا۔ جنت میں آنے سے پہلے اگر کبھی رات کو آنکھ کھل جاتی تو بقیہ رات واہموں اور اندیشوں میں کروٹیں بدلتے گزرتی۔ وہ رات کی تنہائی میں ڈرتا تھا۔ کوئی پتہ، کوئی کھڑکا یا کوئی آہٹ اُس کے دل کو دہلانے کیلئے کافی ثابت ہوتی تھی۔ آج دِل میں طمانیت بھرتی جارہی تھی۔ نصف شب کے عمل میں بھی اُسے کسی قسم کا خوف لاحق نہیں ہو رہا تھا۔

اُس نے دونوں بانہیں فضا میں پوری وسعت میں کھول دیں۔ حلق پھاڑ کر قہقہہ لگایا۔ پھر بلند آواز میں پکارا، ''او......اے......اے سندھ ساگر......تو میرے قدموں تلے بے بس لیٹا ہوُا ہے اور میں تمہارے سینے پر مونگ دلتے ہوئے قہقہے لگا رہا ہوں۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ ایسا کیونکر ہوا؟ مگر تم کیا سمجھو گے۔ تم صرف نگلنا، کاٹنا اور دھکیلنا جانتے ہو۔ اگر پہاڑوں سے لے کر سمندروں تک کہیں، کسی جگہ، کیسا بھی دِل تمہارے پاس دھڑکتا تو تم اپنے کناروں سے اپنی جولانی بھری مستی کو باہر نہ دھکیلتے، کسی غریب کی جھونپڑی کو نہ نگلتے۔ تم کیا ہو؟ میں جانتا ہوں۔ تمہاری شوخیوں میں میرا بچپن گزرا، تمہاری مستیوں کے قصے سنتے سنتے میری جوانی کے ایام گزرے اور ہاں......تم نے ہی تو میرے اَن پڑھ باپ اور سادہ لوح ماں کی میتوں کو نگلا تھا۔ میرے دکھوں نے ایک ہی عافیت بھری پناہ ڈھونڈ رکھی تھی، تم نے وہ بھی اُجاڑ دی تھی۔ آج میرے پیروں تلے مُردوں کی طرح لمبے لیٹے ہوئے ہو، اپنے بچاؤ کیلئے کوئی فریاد بھی نہیں کر سکتے ہو۔''

دریا کبھی جواب نہیں دیتا۔ اونٹ کی طرح مناسب وقت کا انتظار کرتا ہے۔ پتن پر خیمہ زن نوجوانوں میں سے کسی نے دریا کی ترجمانی کا بیڑا اُٹھالیا۔ نہائت یاس بھری آواز سناٹے کا جگر چیر کر پروفیسر کی سماعت میں اُتری۔ اُسے شبہ ہوُا کہ وجدان گا رہا ہے۔

''پتن اُتے بیڑی، بیڑی وِچ ہِک پھل رَتا جیا......آ بوہ میرے سامنے، ایہو پئی منگاں دُعا......''

پروفیسر نے بارہا مرتبہ سرائیکی زبان میں گایا گیا قمر اقبال کا گیت اپنی پوری معنویت سمیت

سماعت میں اُتارا تھا۔ یہاں کا مشہور لوک گیت تھا۔ اُس کے قہقہے تھم گئے۔ وجدان کی دُکھ آمیز آواز کے سحر میں کھو گیا۔ پہلے سنتا تھا تو مزہ آتا تھا، آج سن کر دل مضمحل ہونے لگا تھا۔ اُس نے دونوں ہاتھوں کا بھونپو بنا کر منہ پر رکھا اور چیخ کر کہا، ''اوئے احمق! رات کے اِس سمے تو مینڈک بھی ٹرانا بند کر دیتے ہیں۔ تم بھی خدا کیلئے چپ ہو جاؤ......''

گانے والا یا تو اُس کا چنگھاڑتا ہوا حکم سن نہیں رہا تھا یا سن کر ماننے کو تیار نہیں تھا۔ چند لمحے اُس کے چپ ہونے کا انتظار کرتا رہا پھر بڑبڑاتا ہوا زینے اُتر کر عرشے پر آ گیا۔ بیڈروم میں اپنے آرام دہ بستر پر لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ کھلی چھت کے برعکس یہاں کافی سکون انگیز حدت تھی جس نے چند ہی منٹوں میں سماعت میں اُتر کر اپنی جگہ بناتی ہوئی مترنم آواز سے غافل کر دیا۔

صبح دم اُٹھا۔ کیکر کی مسواک دانتوں پر پھیرتے ہوئے اپنی جنت کا احاطہ کرنے کے بعد دریا میں اُترنے والی چوبی سیڑھیوں پر آ بیٹھا۔ نچلی سیڑھی پر پاؤں رکھ کر بیٹھنے سے وہ کمر تک سرد پانی میں بھیگ گیا۔ الوہی مستی پورے بدن میں سرایت کر گئی۔ برش والا سرا تھام کر مسواک کو پانی پر مارتے ہوئے سوچنے لگا، ''زمین اور آسمان کے بصری اتصال سے پھوٹنے والے سورج کا نظارہ کتنا پرکیف ہوتا ہے مگر وجدان اور اُس کے احمق ساتھیوں کی وجہ سے میں اتنے خوبصورت نظارے کو آنکھوں میں اُتارنے سے محروم ہو رہا ہوں۔ تف ہو دُنیا والوں پر، تف ہو مجھ جیسے مردم بیزار شخص کو تنگ کرنے والوں پر......''

نظر اُٹھا کر سامنے دیکھا۔ طب کہتی ہے کہ علی الصبح درختوں کا قدرتی سبز رنگ دیکھنے سے بصارت تیز ہوتی ہے۔ اُس کی آنکھوں کو بصارت کی تندی کی نہیں، ٹھنڈک کی ضرورت تھی۔ زندگی میں چند مواقع ایسے آئے تھے جنہوں نے اُس کی آنکھوں میں لاوے بھر دیے تھے۔ آتش فشاں پھٹنے پر دھماکے کے ساتھ نکلتے تو جلد جان چھوٹ جاتی مگر وہ رستے رہتے تھے۔ گالوں سے لے کر سینے تک آگ بھر دیتے تھے۔ جنت کی سیدھ میں اڑھائی سو فٹ کے فاصلے پر دریا کا کنارہ واقع تھا جو سطح آب سے کم وبیش دس گیارہ فٹ بلند تھا۔ ایکڑ یا کچھ کم وبیش زمین بالکل ہموار تھی اور اُس پر کوئی درخت اُگا ہوا نہیں تھا۔ بائیں ہاتھ پر پانی کے جاتے رُخ پر گنجان درختوں کا سلسلہ پانی تک چلا آیا

تھا۔ یہاں دھرتی پانی سے بلند نہیں تھی۔

پُرخطر بیلا دریا کے ساتھ ساتھ آٹھ نو کلومیٹر تک پھیلا ہوُا تھا۔ مور، کیھل اور مُرغابیوں کے علاوہ کسی بھی انسان کا یہاں گزر نہیں تھا۔ وہ بھی اپنی خود مرتبہ ہجرت کے موقع پر اپنی کشتیوں میں اِدھر اُدھر جاتے دکھائی دیتے تھے۔ پروفیسر کو یہ خوبی علم تھا کہ طول وعرض پر پھیلا ہوُا بیلا جرائم پیشہ لوگوں اور اشتہاریوں کی محفوظ پناہ گاہ بن چکا ہے۔ یہاں اعلیٰ نسل کے انسانوں نے اپنے پالتو درندے چھپا رکھے تھے جنہیں وقت پڑنے پر منگوا لیتے اور خس وخاشاک میں کمر کمرا ٹے ہوؤں کو ملیا میٹ کروا کر اِنہیں واپس بیلے میں بھیج دیتے تھے۔ پروفیسر کو یہ توقع بھی رہی تھی کہ آنے والے وقت میں کبھی وہ اُس کے مقابل سینہ تان کر کھڑے ہو سکتے ہیں۔ اُن درندوں کو مار بھگانے کیلئے اُس نے اپنی جنت میں نہائت معقول انتظام کر رکھا تھا۔

اُس نے مسواک رکھ دی۔ پانی میں چھلانگ لگا دی۔ دو تین ڈبکیاں لگائیں۔ غوطہ زنی کا شوق پورا کیا۔ شرٹ پہن کر بیڈ روم سے ملحقہ اسٹڈی روم میں آ کر نماز ادا کی۔ وہ عمومی طور پر نماز پڑھنے کے بعد خالی الذہنی کی کیفیت میں جائے نماز پر ہتھیلیاں پھیلا کر بیٹھ جاتا تھا۔ بند آنکھوں سے آنسوؤں کا ریلا بہہ نکلتا۔ آج بھی آنکھوں نے چہرہ تر کر دیا۔ کافی دیر تک ہونٹ کپکپاتے رہے، مہمل سی آوازیں حلق سے خارج ہوتی رہیں۔ پھر لفظوں نے معنویت اختیار کر لی۔ وہ بڑبڑا رہا تھا، ''اے مجھے پیدا کرنے والے! اے پیدا کر کے گناہ آلود چیتھڑے کی طرح دُنیا کی بے ثباتیوں کے حوالے کرنے والے! مجھ پر رحم کر، نہ کر، تمہاری مرضی مگر تمہیں اپنی تخلیق کا واسطہ، اپنی ربوبیت کا واسطہ! میری ماں کو اپنی بنائی ہوئی جنت میں ڈال دے۔ میرے باپ کو آگ کے عذاب سے محفوظ کر دے۔ میں دُنیا کے دوزخ میں جل چکا ہوں، مجھے پتہ چل گیا ہے کہ جہنم کیا ہے؟ میرے ماں باپ کو اِس عذاب آگیں لفظ سے روشناس نہ کرانا......''

جائے نماز سے اُٹھا اور آنسو پونچھتا ہوُا صحن میں آ گیا۔ جنریٹر کے کام کا جائزہ لیا۔ مطمئن انداز میں سر ہلاتے ہوئے ایزی چیئر میں بیٹھ گیا۔ آنسو بہانے کے بعد قدرے پُرسکون ہو گیا تھا۔ ابھی ناشتہ تیار کرنے کے بارے میں ارادہ کر ہی رہا تھا کہ بیڈ روم میں پڑے موبائل فون کا بزر بجنے لگا۔ وہ

لپک کر اندر گیا۔فون اُٹھایا۔اندازہ تھا کہ وجدان جنت میں آنے کا ویزا مانگ رہا ہوگا مگر اُس کا چہیتا شاگرد افتخار بیگ رابطہ کر رہا تھا۔اُس نے مسکرا کر فون اٹینڈ کیا۔کہا،''سناؤ انجینئر! کیسے ہو؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔بس آپ کی یاد آ رہی تھی،سوچا،خیریت دریافت کرلوں۔جنت کا کوئی سسٹم گڑبڑ تو نہیں کر رہا؟''افتخار بیگ کی شوخ سی آواز سنائی دی۔

''انٹرنیٹ گڑبڑ کر رہا ہے۔''پروفیسر نے بتلایا۔

''سگنل کیسے ہیں؟''

''کبھی تین اور کبھی دو لائنیں سبز ہوتی ہیں۔''

''کنیکٹنگ سپیڈ کیا ہے؟''

''پرسوں چالیس سے چھیالیس میگا بائٹس فی سیکنڈ تھی،کل پچپن پر ٹھہری رہی۔آج کمپیوٹر بند ہے۔''

''پھر تو اُسے بالکل درست انداز میں کام کرنا چاہیے۔بعض اوقات مین سرور اپنا کام ٹھیک طرح سرانجام نہیں دے رہا ہوتا ہے۔شاید ایسا ہی کچھ ہو۔بہ ہر حال آپ رات کو انٹرنیٹ استعمال کیا کریں۔''افتخار بیگ نے کہا،''کیمروں کی کارکردگی کو چیک کیا تھا؟''

''نہیں۔آج اُنہیں دیکھوں گا۔''پروفیسر نے کہا،''تمہارے کزن نے جنت کو دیکھنے کی ضد پکڑ رکھی ہے۔فون پر فون کرتا رہتا ہے۔میں نے ارادہ کر رکھا ہے کہ جب سامان لینے کیلئے شہر جاؤں گا تو اپنے فون کی سم بدل ڈالوں گا۔گزشتہ شب اُس نے مشرقی پتن پر گزاری ہے۔اُسے فون کر کے کہہ دو کہ میں کسی بھی وجود کو اپنی جنت میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دوں گا۔''

افتخار ہنس پڑا۔بولا،''میں اُسے سمجھا دوں گا۔آپ نے اِس پابندی کا مجھ پر بھی اطلاق تو نہیں کر دیا؟''

پروفیسر نے جواباً کہا،''نہیں انجینئر! تم بہت اچھے جوان ہو۔مجھے تمہاری ضرورت ہر آنے والے وقت میں پڑتی رہے گی۔میں نے اپنی زندگی کے بہت بڑے خواب کو تمہاری مدد سے عملی تفسیر مہیا کی ہے۔میں تمہارا تہہ دل سے شکرگزار ہوں۔''

''یاد آ یا سر!'' افتخار نے پوچھا، ''آپ کو یاد ہے ناں کہ فریج اور سپلٹ کو بہ یک وقت نہیں چلانا ورنہ لوڈ بڑھ جائے گا۔''

''مجھے یاد ہے۔ ویسے بھی یہاں اے سی چلانے کی شاید ضرورت کبھی بھی نہیں پڑے گی۔ بہت مزے کی آب و ہوا ہے۔''

''صرف انسانوں کیلئے ہی نہیں، جراثیموں اور مچھروں کیلئے بھی رغبت انگیز ماحول ہے۔'' افتخار شرارت سے بولا۔

''میں اگر انسانوں کی دُنیا سے زندہ بچ نکلنے میں کامیاب ہوگیا ہوں تو یہ بے چارے مچھر کیا چیز ہیں۔'' پروفیسر نے کہا۔فون بند کرنے سے پہلے اُس نے افتخار کے اصرار پر فی الفور جنت میں نصب شدہ سکیورٹی کیمروں کی کارکردگی کو چیک کرنے کا وعدہ کیا۔

وہ بیڈ روم کی دائیں جانب والی چوبی دیوار سے منسلکہ سیڑھیاں اُتر کر کنٹرول روم میں آیا۔ چار ضرب چھ کے اِس چھوٹے سے کمرے میں افتخار کے الیکٹریکل انجینئر دوست نے بجلی کے نظام کا تمام تر کنٹرول نصب کر رکھا تھا۔ وہ پچھلی دیوار تک آیا۔ مین بورڈ پر ایک قطار میں نصب شدہ الیکٹریکل بریکرز کے اوپر نصب شدہ سرخ رنگ کا لیور نیچے کر دیا۔بجلی کا لوڈ دکھانے والے میٹر پر دیکھا۔سکیورٹی سسٹم کے آن ہونے پر سوئی نے آگے کی طرف ایک جھٹکا لیا، چند مرتبہ لہرا کر پھر اپنی پہلے والی جگہ پر آ گئی۔ پروفیسر نے سر ہلایا اور کنٹرول روم سے باہر آ گیا۔

ریلنگ کے قریب آیا۔اپنی شرٹ اُتار کر ریلنگ کے باہر لہرائی۔کوئی ردعمل پیدا نہیں ہوا۔اُس نے بیڈ روم کی طرف کان لگائے۔بیل کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ وہ جلدی سے بیڈ روم میں آیا۔ کمرے میں گھنٹی کی آواز گونج رہی تھی۔اُس نے بورڈ پر لگے گھنٹی کے بٹن کو پش کر دیا۔کلک کی مدھم سی آواز کے ساتھ ہی بیڈ روم میں خاموشی چھا گئی۔

بیڈ کے پار پچھلی جانب چار انچ سکرین والے ٹی وی کی سکرین خودکار نظام کے تحت آن ہو چکی تھی۔ وہ بیڈ پر چڑھ کر ٹی وی کے سامنے آیا۔ فائبر کے بنے ہوئے چھوٹے سے شیڈ پر رکھے ٹی وی کے سامنے کی بورڈ کی طرح کا نو ضرب چھ انچ کا کنٹرول پینل نصب تھا۔اُس پر مختلف بٹن موجود

تھے۔ٹی وی پر جنت کے اُس حصے کا منظر ٹھہرا ہوُا تھا جہاں چند لمحے پیشتر پروفیسر نے ریلنگ سے باہر جھک کر شرٹ لہرائی تھی۔

وہ مختلف بٹن دباتا رہا۔سکرین پر مناظر بدلتے رہے۔نصف گھنٹے کی چھیڑ چھاڑ کے نتیجے میں وہ آپریٹنگ سسٹم پر از حد عبور حاصل کر چکا تھا اور بغیر کوئی وقت ضائع کئے ٹی وی کی سکرین پر جنت کے ہر پہلو کو مختلف زاویوں سے دیکھ سکتا تھا۔اُس نے دل ہی دل میں افتخار بیگ کے ہنر کو سراہا۔سنسرز اور کیمروں کی مدد سے اُس نے کتنا بہترین نظام ترتیب دیا تھا۔کوئی،خواہ کتنی ہی احتیاط سے جنت میں داخل ہونے کی کوشش کرتا، پروفیسر کی نگاہوں سے اوجھل نہیں رہ سکتا تھا۔

پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد اُس نے افتخار بیگ کا شکریہ ادا کرنے کا ارادہ باندھا اور فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔اُس کے چہرے پر اندرونی سچی خوشی اور بچوں جیسی ہیجان خیزی رقصاں تھی۔

...◈...

دونوں ہنس کے کمرے میں بیٹھے گڑیاؤں سے کھیل رہے تھے۔ہنس نے کہا،''اپنی فینی کا تعارف تو کراؤ، دیکھوں،کیسی ہے؟''

''یہ رہی؟''

ہنس نے دیکھا۔فینی بہت پیاری تھی۔بولا،''اِس کی دوستی کس کے ساتھ ہے؟''

''یہ بڑی مغرور ہے۔کسی سے بات چیت نہیں کرتی۔میں نے کہا بھی تھا کہ کسی کو فرینڈ بنالو، جیسے ہم دونوں نے دوستی کر لی ہے۔نک چڑھی مانتی ہی نہیں۔'' قسمت نے غصے سے کہا۔

ہنس نے ایک گڈا اُٹھایا۔یہ سب سے پیارا تھا۔بولا،''اِس کی دوستی کرادو فینی کے ساتھ۔''

''یہ بھی بڑا پراوَڈ ہے۔کسی کو لفٹ نہیں کراتا۔'' قسمت بولی،''ذرا ٹھہرو۔اِس کی دوستی اِس کے کزن سے کراتے ہیں۔یہ بہت نائس ہے۔''

ہنس نے فینی کے کزن کو دیکھا۔منہ بنا کر بولا،''یہ تو بالکل ڈفر ہے۔وہی پہلے والا ٹھیک رہے گا۔''

''یہ تو آپس میں لڑتے رہیں گے۔'' قسمت بولی۔

''پھر تو بڑا ہی مزہ آئے گا۔'' ہنس نے کہا۔ قسمت نے سر ہلا کر ہنس کی بات مان لی۔ دونوں کو برابر میں بیٹھانا چاہتی تھی کہ دونوں میں ٹکر لگ گئی۔ فینی گر گئی۔ قسمت نے جلدی سے فینی کو اُٹھایا۔ اُس کے کپڑے جھاڑے اور دُکھی لہجے میں بولی، ''میری فینی کو چوٹ لگ گئی ہے۔ کمینے، ذلیل، دیکھ کر نہیں چلتے کیا؟''

ہنس کا چہرہ لال ہو گیا۔ حلق کے بل چیخا، ''کیا مجھے گالیاں دے رہی ہو؟''

قسمت جلدی سے بولی، ''میں نے تمہیں تھوڑا کہا ہے، میں تو اِس اندھے مدھو کو کہہ رہی ہوں۔ اتنی بڑی بڑی آنکھیں اللہ نے دی ہیں مگر مجال ہے کہ چلتے ہوئے کسی کا دھیان رکھے۔ ہائے دیکھو! میری فینی کی ٹانگ مُڑ گئی ہے۔''

دونوں ہاتھوں میں فینی کو اُٹھائے اپنے پاپا کے کمرے میں بھاگ گئی۔ اُس کا پاپا ڈاکٹر تھا۔ فینی کا علاج کرنا جانتا تھا۔

...۞...

عقل للچا کر اپنا مطلب نکالنا بہ خوبی جانتی ہے۔ حسن عقل پر دبیز پردہ ڈال کر عقل کی جمع پونجی سمیٹتا ہے اور جُل دے کر نکل جاتا ہے۔ تبھی کہا جاتا ہے کہ دُنیا میں کامیاب ہونے کیلئے عقل اور حسن دونوں میں سے کسی ایک شئے کا ہونا بہت ضروری ہے ورنہ گام گام پر حسرت انگیز ناکامیاں ملتی ہیں جو رہی سہی کسر بھی نکال دیتی ہیں۔

اُس پر قدرت کچھ زیادہ ہی مہربان ثابت ہوئی تھی۔ وہ نہائت ذہین اور عقل مند ہونے کے ساتھ ساتھ غیر معمولی حسن کی مالک بھی تھی۔ بول کر لاجواب کر دیتی تھی اور اپنا آپ دکھا کر دھڑکتے ہوئے دِل کو دھڑکن سمیت مٹھی میں جکڑ لیتی تھی۔ اکلوتی بیٹی ہونے کے ناتے نہائت لاڈلی اور خود سر واقع ہوئی تھی۔ ایک بھائی بڑا تھا، دوسرا چھوٹا۔ ایک طرف سے پیار وصول کرتی، دوسری طرف بچا کھچا پیار ایگزاسٹ کر دیتی۔

باپ، سلطان علی، نے کئی سال پیشتر شہر میں ایک پرائیویٹ سکول کی بنیا در کھی تھی۔اوائل میں اِس عام نوعیت کے سکول میں محنت کے مقابلے میں آمدنی نہائت کم ہوتی تھی۔ہوتے ہوتے محنت کم ہوتی گئی، آمدنی کی شرح آسمان سے باتیں کرنے لگی۔گھر میں پیسے کی ریل پیل ہوگئی۔ پیسے نے پیسے والوں کی ادائیں سکھانے میں دیر نہیں لگائی۔سلطان علی، جس کا خاندان لڑکیوں کو زیادہ پڑھانے کا روادار نہیں تھا، نے دونوں بیٹوں کے ساتھ ساتھ اُسے بھی اعلیٰ تعلیم کے حصول کا بھر پور موقع دیا تھا۔

بڑا بھائی عمران علی میڈیکل کا شعبہ جائن کرنا چاہتا تھا۔ایف ایس سی میں وہ اتنے نمبر حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا کہ اُسے ملک کے کسی بھی میڈیکل کالج میں بہ آسانی داخلہ مل سکتا تھا مگر قسمت نے ساتھ نہ دیا اور وہ انٹری ٹیسٹ میں اپنی کامیابیوں کے سلسلے کو برقرار نہ رکھ سکا اور ڈراپ کر دیا گیا۔وہ دل برداشتہ سا ہوگیا تھا۔ایسے ہی وقت میں جب وہ دوبارہ انٹری ٹیسٹ کی تیاری میں مشغول تھا، ایک ایجنٹ نے اُسے چائنا میں داخلہ لے کر پڑھنے کی ترغیب دی۔اُس نے اپنے باپ سے تذکرہ کیا۔ باپ اُسے سیلف فنانس سکیم کے تحت چائنا بھیجنے پر آمادہ ہوگیا۔یوں چار سال پیشتر وہ مسیحا بننے کیلئے چین کے مشہور شہر وین ژو (Venzhou) میں چلا گیا جہاں وین ژو میڈیکل کالج میں بہ آسانی داخلہ مل گیا۔

اُس نے اپنی تصاویر کا البم بھیجا تھا جس میں سے ایک تصویر مصباح کو بہت پسند تھی۔وہ اکثر تنہائی میں دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی رہتی تھی۔تصویر میں عمران دائروی شکل میں بنی ہوئی خوبصورت کیاریوں میں ایک سفید رَنگ کے ستون کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔عقب میں کالج کی سفید اور براؤن رنگ کی فلک بوس عمارت دکھائی دے رہی تھی۔تصویر کے بائیں کونے میں نصف دائروی شکل کا شیشے کا بناہوُا مرکزی دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔عمارت کے پیچھے گہرے آسمانی رنگ کی جھالر کسی پہاڑی کی نشاندہی کر رہی تھی۔کالج کی دو بلند کنو پیوں والی وسیع وعریض عمارت دیکھ کر دل پر دبدبہ طاری ہونے لگتا تھا۔

وہ بھی ڈاکٹر بننا چاہتی تھی۔ ایف ایس سی میں نمبروں کا مطلوبہ ہدف حاصل کر لینے کے بعد نہ جانے اُسے کیا ہوُا کہ اچانک ہی اُس نے میڈیکل کالج میں داخلہ لینے سے انکار کر دیا۔معاملہ یہاں

تک ہی موقوف نہیں رہا بلکہ مستزاد یہ ہوا کہ وہ سائنس پڑھنے سے بھی باغی ہوگئی۔ اُس نے مقامی کالج میں انگلش لٹریچر کی کلاس جائن کرتے ہوئے گھر کے سبھی افراد کو انگشت بدنداں کر دیا۔ باپ نے سمجھایا کہ تم اپنے بہترین مستقبل کو ٹھکرانے چلی ہو۔ وہ مسکرا کر بولی، ''پاپا! آپ بے تکی ضد کرتے ہیں۔ بھلا لیڈی ڈاکٹر بنے بغیر میں اچھی زندگی نہیں گزار سکتی؟''

چھوٹے بھائی وجدان علی نے سمجھایا، ''باجی! تم نے غلطی کی۔ اِس مرتبہ فاطمہ جناح کا میرٹ پچھلے سال کے مقابلے میں کافی ڈاؤن تھا۔ اگر اپلائی کرتیں تو داخلہ ضرور مل جاتا۔''

اُس نے بھائی کا منہ بند کرتے ہوئے کہا، ''اگلے سال میرٹ اِمسال سے بھی کم ہوگا کیونکہ لوگوں نے اِس شعبے میں جانا ہی چھوڑ دیا ہے۔ میں کیوں جاؤں؟''

ماں نے منہ بنا کر کہا، ''اللہ کی شان ہے۔ خاندان کی لڑکیاں میٹرک کرنے کو ترستی ہیں، یہ خان زادی نخرے دکھاتی ہے۔ ہمیں کیا؟ جب کوئی نوکری نہیں ملے گی تو پچھتائے گی۔ روئے گی، ہائے میں نے کتنا اچھا موقع گنوا دیا۔''

وہ ہنستی ہوئی ماں کے گلے کا ہار بن گئی۔ لاڈ سے بولی، ''ماما! میں تم سے دور نہیں رہنا چاہتی۔ جانتی ہو، رافعہ ایم بی بی ایس کر رہی ہے، سوکھ کر کانٹا ہوگئی ہے۔ پچھلی مرتبہ ملی تو کہنے لگی کہ نہ اچھی خوراک، نہ سکون اور نہ ہی گھر والوں کا ساتھ...... چہرہ پچکے گا نہیں تو کیا غبارہ بنے گا؟......وہ تو یہ بھی کہہ رہی تھی کہ اُس نے اپنی زندگی کا سب سے غلط فیصلہ میڈیکل کالج جائن کرنے کا ہی کیا تھا۔ اَب اُس کی ساری زندگی آہیں اور سسکیاں سننے اور ٹوٹتی بکھرتی ہوئی سانسیں شمار کرنے میں گزرے گی۔'' اُس نے دونوں کانوں کی لوؤں کو چھو کر مضحکہ خیز انداز میں کہا، ''ناں بابا ناں...... میں ڈاکٹرنی بننے سے رہی۔ پاپا کے سکول کو سنبھال لوں گی، کہیں لیکچرر شپ لے لوں گی مگر میڈیکل ڈیپارٹمنٹ میں نہیں جاؤں گی۔''

اُسے سمجھانے والے ایک دلیل لاتے، وہ چار منہ پر مار کر منہ بند کر دیتی۔ جب اُسے پورے خاندان میں سے ایک آدمی کی تائید حاصل ہوئی تو وہ کھلم کھلا بغاوت پر اُتر آئی۔ انجینئر افتخار بیگ نے اُس کی حمایت میں سب کے سامنے کہہ دیا تھا کہ ڈاکٹر بننے سے کہیں بہتر بیمار بننا ہے۔ اُس نے

شکرمندی کے جذبات سے مغلوب ہوکر اپنے پھوپھی زاد کے سامنے سر جھکا دیا۔ بولی، ''بھائی! تم کتنے اچھے ہو۔''

وہ اچھا تھا مگر اُس حسینۂ عالم کا بھائی بننے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اُس کی چوٹی کو پیار سے کھینچ کر بولا، ''کیا تمہارے ہاں بھائیوں کی کمی ہے جو ہر ایک کو بھائی کا خطاب دینے لگتی ہو؟''

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ شرارت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی، ''پھوپھی کا بیٹا بھائی ہی ہوتا ہے ناں!''

''پھوپھی کا ہر بیٹا بھائی نہیں ہوتا بے وقوف لڑکی!'' افتخار نے چڑ کر کہا۔

''پھوپھی تو یہی سمجھاتی رہتی ہے مجھے۔''

''تمہارے باپ کو بھی مسلسل تین برسوں سے کچھ سمجھاتی چلی آ رہی ہے، کیا اس طرف تمہارا دھیان نہیں جاتا؟''

وہ مصنوعی معصومیت سے نفی میں سر ہلانے لگی۔ وہ پہلے بھی دِل میں جاگزیں تھی، ایسے میں چاہنے والے کے دِل میں کچھ اور گہرائی تک کھب گئی۔ وفورِ پیار سے بولا، ''منگنی سے پہلے کزن بھائی ہوتا ہے، بعد میں کچھ اور ہو جاتا ہے۔ لڑکیوں کی زندگی میں یہ تبدیلی بڑی خوش آئند ہوتی ہے۔''

وہ جواباً آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی، ''منگنی کے بعد نہیں، شادی کے بعد، سمجھے؟...... تم بڑوں کے اقوال کو توڑ پھوڑ کر اپنا مطلب نکالنے کی کوشش مت کیا کرو۔''

''تو کیا منگنی سے شادی تک کے عرصے میں بھی مجھے بھائی ہی کہو گی؟'' وہ تعجب سے چیخ پڑا۔

اُس نے ایک ادا سے سر جھٹکا۔ بالوں کی ایک لٹ دوپٹے سے جھانک کر بائی بائی کہتی ہوئی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ وہ بھی بھاگ کر چاہنے والے کی تشنگی کو ہوا دیتے ہوئے چھپ گئی۔ یوں سامنے آنے اور چھیڑ کر چھپ جانے میں جداگانہ لطف پنہاں ہوتا ہے۔

جوانی میں ایک دِن عافیت سے گزارنا مشکل ہو جاتا ہے، اُس نے نہ جانے کیسے ایک سال جھیل کے ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح کسی ارتعاش کے بغیر گزار دیا۔ عین ممکن ہے کہ جھیل کی گہرائی میں پڑے ہوئے افتخار بیگ کی صدق آمیز محبت کے پیاسے پتھر نے جوانی کے پانی کے کھولاؤ کو مسلسل

جذب کئے رکھا ہو۔ تھرڈ ائر میں تھی جب جھیل کے ٹھہراؤ نے ایک ننھے سے پتھر کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ پتھر ضلع ناظم سردار ارباب خان کے بیٹے شہاب خان کے ہاتھوں سے نکلا تھا۔

شجر کاری مہم میں حصہ لینے کیلئے وہ اپنی دو ساتھیوں کے ہمراہ کالج سے نکل کر پبلک نرسری تک گئی۔ تینوں نے اپنی اپنی مرضی کے پودے پسند کر کے خریدے۔ اُس نے سنگ مرمر کا نقش و نگار والا خوبصورت گملا خریدا۔ اُس میں پتھر چاٹ کا پودا لگا ہوا تھا۔ وہ نرسری والے سے مخاطب ہوئی، ''بھائی! یہ گملا خوبصورت ہے، پودا بدصورت ہے۔ اِسے یہاں سے نکال دو اور رات کی رانی لگا دو۔''

کام قدرے مشکل تھا۔ کچھ دیر لگ گئی۔ ایسے میں اُس کی ایک سہیلی نے اُس کے کان سے منہ لگا کر سرگوشی کی، ''کوئی دِن کا راجہ آ کر تمہارا گملا بدل ڈالے گا۔ سچ! کتنا مزہ آئے گا جب سہاگ رات کی رانی پتی پتی ہو کر سیج پر بکھر جائے گی اور راجہ......''

اُس نے گھور کر سہیلی کو دیکھا۔ وہ شوخی سے ہنس کر چپ ہو گئی۔ جو کہنا چاہتی تھی، کہہ چکی تھی۔ تینوں اپنے اپنے گملے اُٹھائے نرسری سے باہر آئیں۔ فاصلہ کم ہونے کی وجہ سے پیدل ہی کالج کی طرف چل پڑیں۔ مین روڈ کراس کرتے ہوئے ایک تیز رفتاری سے آتی ہوئی کار نے خوف زدہ کر دیا۔ اُس کی سہیلیاں جلدی سے آگے بڑھ گئیں۔ وہ کچھ زیادہ ڈر گئی تھی۔ وہیں ٹھہر گئی۔ کار کا ڈرائیور اُس سے زیادہ ڈر گیا۔ بریک لگائے مگر کار رُکتے رُکتے اُس سے ٹکرا گئی۔ پتھر سے سر ٹکرانے والا شیشہ سلامت نہیں رہتا۔ گملا سے ٹکرانے والی بائیں ہیڈ لائٹ دھماکے کے ساتھ ٹوٹ گئی۔ کرچیاں دور تک پھیل گئیں۔ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ گری، گملا چھوٹ گیا اور وہ ناپختہ روڈ سائیڈ پر لڑھکتی گئی۔ جسم پر کوئی زخم نہیں آیا مگر کئی چوٹوں نے خوف طاری کر دیا۔ گرتے ہی بے ہوش ہو گئی۔ دونوں سہیلیاں چیختے چلاتے ہوئے اُس سے لپٹ گئیں۔

ایکسیڈنٹ کے نتیجے میں زخمی ہو کر گرنے والی کی طرف کئی ہاتھ لپکتے ہیں۔ بچتی نظر آئے تو بچا کر احسان کے پھندے میں پھانس لیا جاتا ہے۔ موت کی دہلیز پر کھڑی ہو تو تاسف سے سوچا جاتا ہے، ''مرنا ہی تھا تو مجھ پر مر مٹی ہوتیں۔''

اُس کی مدد کیلئے کئی جوان ہاتھ آن کی آن میں جھپٹنے کو مچل گئے۔ ایسے میں نئی نویلی کار کا پچھلا

دروازہ کھول کر شہاب خان باہر نکلا۔ برق رفتاری سے سیاہ چادر میں لپٹی خوف سے بے ہوش ہرنی تک آیا۔ جلدی سے اُسے اُٹھانے لگا۔ کار کی عقبی نشست پر ڈالتے ہوئے اُس کی ساتھیوں سے مخاطب ہوا،''جلدی سے اُس کے دائیں بائیں بیٹھ جائیں۔ ڈاکٹر احسان اللہ کا ہسپتال قریب ہے، ہم وہیں جا رہے ہیں۔''

لوگ جمع ہونے لگے تھے۔ معاملہ فہمی سے قبل ہی کار ہوا ہوگئی۔ ڈاکٹر احسان اللہ بہ خوبی جانتا تھا کہ شہاب خان ضلع ناظم کا بیٹا ہے۔ ضلع ناظم کا بیٹا بھی ناظم ہی ہوتا ہے۔ اُس نے فوری طور پر اپنے ہسپتال پر ایمرجنسی نافذ کر دی۔ چند ہی منٹوں میں مصباح ہوش میں آ گئی۔ ہوش میں آنے کے بعد کے استعجاب خیز مرحلے سے نکلی تو انتہائی وجیہہ اور پرکشش شہاب خان کو پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ وہ بڑی محبت سے کہہ رہا تھا،''اللہ کا شکر ہے کہ تمہیں کوئی چوٹ نہیں آئی۔ مردوں کے شانہ بشانہ چلنے کی دعوے دار لڑکیوں کو اتنا بھی بُزدل نہیں ہونا چاہیے کہ معمولی سے ایکسیڈنٹ میں خوف سے بے ہوش ہو جائیں۔''

وہ کراہی۔ کچھ کہنا، کچھ پوچھنا چاہتی تھی مگر جھجک گئی۔ وہ جتنا بھی مہربان دکھائی دے رہا تھا، اجنبی تھا۔ لڑکیاں کھلنے میں کچھ وقت لیتی ہیں۔

بیس منٹ کے بعد ڈاکٹر نے چند پین کلر گولیاں تھما کر اُسے فارغ کر دیا۔ وہ شہاب خان اور اپنی سہیلیوں کے ہمراہ ہسپتال سے باہر آئی۔ شہاب خان کا ڈرائیور گاڑی کی ہیڈ لائٹس کا معائنہ کر رہا تھا۔ شہاب خان نے مسکرا کر کہا،''کوئی بات نہیں۔ لائٹس نئی خرید کر فٹ کی جا سکتی ہیں، خدانخواستہ اِس کا گھٹنا ٹوٹ جاتا تو کہیں سے نہ ملتا۔''

اُس نے شہاب کے شوخ لہجے پر کوئی توجہ نہ دی بلکہ چونک کر اپنے گھٹنے کو دیکھنے لگی۔ اچانک پریشان ہو اُٹھی۔ شلوار گھٹنے پر "L" کی شکل میں پھٹی ہوئی تھی۔ اُس نے اپنی چادر کو گھٹنے پر پھیلا کر عریاں جلد کو چھپانے کی کوشش کی۔ چادر نیچے کی تو سر سے ڈھلکنے لگی۔ عجیب مخمصے میں گرفتار ہو گئی۔ اُس کی سہیلیوں نے اُس کی پریشانی بھانپ لی۔ ترکیب سوچنے لگیں۔ کچھ سجھائی نہ دیا۔ ایسے میں شہاب خان اپنی گاڑی تک گیا۔ ڈیش بورڈ پر پڑے ہوئے کسی سیلولر فون کمپنی کے اشتہاری اسٹکر اُٹھا لایا۔

بولا،''اسے کپڑے کے اندر کی طرف سے چپکا دو۔ گزارا ہو جائے گا۔''

ترکیب اچھی تھی۔ دل کو لگی۔ سٹکر تھاما اور کورنگ پیپر اتار دیا۔ پائنچے میں ہاتھ ڈال کر پھٹی ہوئی جگہ تک سٹکر کو پہنچانے کی کوشش کی۔ پائنچہ تنگ تھا۔ ہاتھ نہیں پہنچا۔ اِس کوشش میں سٹکر دوہرا ہو کر چمٹ گیا۔ وہ بے بسی سے اپنی سہیلیوں کو دیکھنے لگی۔ دوسرے اسٹکر پر اُنہوں نے تجربہ کیا۔ ناکامی پر جھنجلا سی گئیں۔ ایسے میں شہاب خان نے گاڑی کا اگلا دروازہ کھول کر اپنی جانب بلایا۔ اُسے سیٹ پر بیٹھا کر بائیں ٹانگ کو باہر نکالنے کا اشارہ کیا۔ خود زمین پر بیٹھ گیا۔ کسی کو چھونے کی اجازت نہ دینے والی دل ہی دل میں کڑھ رہی تھی۔ سوچ رہی تھی کہ شہاب خان محض اُس کی ٹانگوں کو چھونے کیلئے اتنی ہمدردی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔

یکبارگی سے اُس نے ٹانگ کھینچ لی۔ کوئی اور کھینچے تو آدمی دھڑام سے منہ کے بل زمین پر آن گرتا ہے۔ اُس نے اپنی ٹانگ خود کھینچی تھی۔ گرنے سے محفوظ رہی مگر پاؤں گیٹ اور پائدان کے بیچ میں اٹک گیا۔ تکلیف کے مارے حلق سے سسکی نکل گئی۔ شہاب خان نے مسکرا کر کہا،''پلیز! مجھے اسٹکر چپکانے دو۔ شرم آتی ہے تو اپنی آنکھیں بند کر لو یا میں آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔''

وہ عجیب سی کیفیت میں ڈوب گئی۔ شہاب خان نے گداز پنڈلی کو تھاما۔ انگلیوں کی مدد سے کھلے اسٹکر کو بڑی احتیاط سے پھٹی ہوئی جگہ سے گزار کر اندر پہنچایا۔ کپڑے کے لٹکتے ہوئے ٹکڑے کو اپنی جگہ پر فٹ کیا اور ہاتھ سے تھپتھپا کر سٹکر پر چپکا دیا۔ مصباح حیرانی سے شہاب خان کی رفوگری دیکھ رہی تھی۔ اُس نے اتنی مہارت سے ٹکڑے کو اپنی جگہ پر فٹ کیا تھا کہ بادی النظر میں جوڑ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔

وہ اگلی نشست پر سے اُٹھ کر نیچے اُتر آئی۔ شہاب خان نے تینوں کو گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ایک لڑکی کو یاد آیا کہ گملے ایکسیڈنٹ والی جگہ پر ہی رہ گئے ہیں۔ کار اُسی جگہ پر جا کر رُک گئی۔ گملے دکھائی نہیں دیے۔ ایک دکاندار نے ہاتھ کے اشارے سے اُنہیں اپنی طرف متوجہ کیا۔ گملے اُس کی دکان کے باہر سیڑھیوں پر رکھے تھے۔ ڈرائیور نے اُتر کر گملے ڈکی میں رکھے اور شہاب خان نے پیچھے مُڑ کر استفہامیہ نظروں سے تینوں کی طرف باری باری دیکھا۔ ایک بولی،''ہم گرلز کالج کی طرف

جارہی تھیں۔''

ڈرائیور نے کالج کے گیٹ پر گاڑی روکی۔ تینوں اُتریں۔ مصباح نے چند قدم چل کر پلٹ کر فرنٹ سیٹ پر بیٹھے شہاب خان کو دیکھا اور ہاتھ لہرا کر بولی، ''میرا گملا بچ گیا، تمہاری لائٹ ٹوٹ گئی۔ مجھے بہت افسوس ہوا۔''

وہ مسکرا کر بولا، ''میں شہاب خان ہوں اور تم؟''

''مصباح!''

''کیا مجھے رابطہ کرنے کی اجازت دوگی؟''

وہ ٹھٹکی۔ چند لمحے سوچتی رہی پھر مسکرا کر بولی، ''اجازت ہے۔''

پلٹ کر گملا جھلاتی کالج کے گیٹ میں داخل ہوگئی۔ ایک سہیلی نے کچوکا دیا، ''اجازت ہے۔ کیا شاہانہ مزاج پایا ہے ملکہ عالیہ نے!''

وہ آنکھیں نچاتے ہوئے ہنسی، ''وہ مجھے جانتا نہیں، میری شکل سے ناواقف ہے، میرا فون نمبر اُس کے پاس موجود نہیں ہے...... کیسے رابطہ کرے گا؟''

دونوں اُس کی بات کا مطلب سمجھ کر ہنسنے لگیں۔

آگے کی طرف سست روی سے کھسکتی ہوئی گاڑی میں بیٹھے شہاب خان نے مسکرا کر زیرِ لب کہا، ''ہائے! تم کیا ہو؟ جوانی آنکھیں اور لب دکھا کر لوٹتی ہے، تم نے دوانچ کی روزن سے اپنی پنڈلی دکھا کر لوٹ لیا ہے۔ تمہارا کیا جاتا جو گملے اور لائٹ پر تبصرہ کرنے کہہ دیتیں کہ بدن تو چوٹوں سے بچ گیا، دِل نہیں بچا۔''

...⁂...

ہنس گھبرایا ہوٗا دکھائی پڑ رہا تھا۔ قسمت نے پوچھا، ''تمہارا چہرہ کیوں اُترا ہوٗا ہے؟''

''میں نے ٹی وی پر سنا ہے کہ ہمارے سندھو سائیں میں سیلاب آنے والا ہے۔ دیکھو! کل اتنا پانی تھا۔ آج اتنا ہے۔'' ہنس نے جواب دیا۔

''ہنس! تمہارے ہونٹ بڑے پیارے ہیں۔'' قسمت بند مٹھی پر تھوڑی ٹکائے ایک ٹک اُسے دیکھے جارہی تھی۔ وہ جھینپ کر بولا، ''میں نے پوچھا ہے تم سے؟''

اُس نے ہونٹ سکیڑے، کندھے اُچکائے اور بہتے ہوئے پانی کی طرف دیکھنے لگی۔ تفہیمی انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولی، ''ہاں ہنس! پانی زیادہ ہو رہا ہے۔ کہیں ہماری کشتی الٹ نہ جائے۔''

''پاگل کہیں کی۔ بھلا اتنی بڑی کشتی بھی الٹ سکتی ہے۔''

''پاپا نے بتایا تھا کہ انگریزوں کا بہت بڑا جہاز پانی میں ڈوب گیا تھا۔'' وہ فکرمند ہو رہی تھی۔

''وہ ٹائی ٹانک......''

''ہاں تو......''

''وہ انگریزوں کا تھا اس لئے ڈوب گیا۔ یہ ہماری کشتی ہے۔ یہ ڈوب نہیں سکتی۔'' ہنس نے اپنی دانست میں بڑی بات کہی۔

قسمت کی اچانک نگاہ کشتی کے مغربی سمت میں واقع گھاس پھونس کی بڑی سی جُھٹی سے نکل کر آتے بڑے بڑے چیونٹوں کے قافلے پر پڑی۔ وہ چیخی، ''دیکھو ہنس! ڈاکو آ گئے پوڈو کو لوٹنے مارنے کیلئے...... ہائے! اَب کیا ہوگا؟''

ہنس نے چونک کر دیکھا۔ اُسے کالے چیونٹوں سے ڈر لگتا تھا۔ جھرجھری لے کر بولا، ''یہ تو ہمارے پوڈو کو مار دیں گے اور ہماری کشتی پر قبضہ کر لیں گے۔ میں بابا کو بلاتا ہوں۔''

قسمت بولی، ''نہیں۔ اِن ڈاکوؤں سے ہم نبٹ لیں گے۔ چلو جوتا اُتارو اور حملہ کر دو......تھوڑے سے تو ہیں۔''

''مجھے ڈر لگتا ہے۔ تم ہی مارو اِنہیں......''

قسمت نے اُس کا جوتا اُتارا اور چیونٹوں کو مار بھگانے میں مشغول ہوگئی۔ ہنس ایک ٹک اُسے دیکھتا رہا، سوچتا رہا کہ وہ لڑکا ہوتے ہوئے ڈرتا ہے جبکہ وہ لڑکی ہو کر ڈاکوؤں کا مقابلہ کر رہی ہے۔

کوارٹر کی عقبی کھڑکی کے سامنے کھڑے میاں بیوی نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ہنس کا باپ بولا، ''شناں! تمہارے ہنس کا سندھو سائیں میں انہاک مجھے میرے بچپن میں کھینچ کر لے جاتا ہے۔''

’’آپ کے اور میرے محسوسات میں واضح فرق موجود ہے۔ہنس کی یہی عادتیں مجھے اِس کے مستقبل کی خبر دیتی ہیں۔اپنے باپ کی طرح سندھو سے والہانہ محبت کرے گا، دُنیا اس سے محبت کرے گی۔دیکھنا!‘‘

’’قسمت کو دیکھ رہی ہو، کتنی پیاری ہے۔‘‘

شاں نے بڑے عجیب انداز میں کہا،’’قسمت تو ہوتی ہی بڑی پیاری ہے، فتح کرنے اور تاراج کرنے کی اندھی شکتی رکھتی ہے۔‘‘

دونوں نے پھر ایک دوسرے کو دیکھا، چہروں پر مسکراہٹیں گہری ہوگئیں۔قسمت اور ہنس کی جانب کھلنے والی کھڑکی کے دونوں طاق بغیر کھٹکے کے بند ہو گئے۔

...⁂...

بڑھتی ہوئی گرمی کے ساتھ ساتھ دریا میں پانی بھی بڑھ رہا تھا۔پروفیسر نے اپنے بچپن میں سندھ ساگر کی تباہ کاریاں اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں۔کبھی جب پانی بدمست شرابی کی طرح لہرا کر چلنے لگتا تو اُس کا دِل خوف پکڑنے لگتا۔جب پانی کی بلند ہوتی سطح کے ساتھ ساتھ جنت بھی اوپر اُٹھ جاتی تو طمانیت کا احساس ہوتا۔وہ تاراج کر دینے والے پانی کے قلب میں کانٹا چبھو کر بیٹھا تھا۔

ایسے میں کسی سے کہا جائے کہ پروفیسر وسیم بزدار نے چونتیس لاکھ میں ایک سکون بھری زندگی خریدی تھی تو وہ فی الفور رائے زنی کردے گا کہ سودا بہت مہنگا ہے۔پروفیسر سوچتا تھا کہ اُسے یہ سب کچھ مفت میسر آ گیا تھا۔نوکری کے ابتدائی عرصے میں اُس نے شہر کے مضافات میں ایک ایکڑ رقبہ خرید کیا تھا جو اُسے کوڑیوں کے دام ملا تھا۔شہر کے ایک بازار میں ایک دکان بھی ایسے ہی ہاتھ لگ گئی تھی۔تب دونوں ملکیتوں کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔

زمانہ بدلنے کے ساتھ ساتھ جب پراپرٹی کی قیمتیں ستاروں سے باتیں کرنے لگیں تو وہ اپنے خوابوں کی تکمیل میں کوشاں ہوگیا۔اَسی ہزار میں ملنے والا ایک ایکڑ چالیس لاکھ میں بکا تو اُس کی آنکھیں وفورِ مسرت سے پھٹنے کو آ گئیں۔اتنی بڑی رقم اُسے اپنی خواہشوں کو صورتِ تکملا دینے میں

بھرپور معاونت کرسکتی تھی۔

''جنت'' کی تعمیر کاری پر بے دریغ رقم خرچ کرنے کے باوجود اُس کے پاس اَبھی بھی کافی رقم بچی ہوئی تھی۔ پندرہ سالہ نوکری کی بچت بھی بینک اکاؤنٹ میں جمع تھی۔ قسمت نے ساتھ دیا، دُکان چار ہزار ماہانہ کرایہ دینے لگ گئی تو عملی طور پر روپے پیسے کی اہمیت اُس کی نظر میں ثانوی ہو کر رہ گئی۔ لاکھوں روپے کے بینک بیلنس کے ساتھ ہر ماہ ملنے والی لگی بندھی رقم نے اُسے انسانوں کا ساتھ چھوڑ کر سندھ ساگر میں جنت بنانے کی مکمل تحریک دی تھی۔

جون کا گرم دِن شروع ہونے کو تھا۔ پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق وہ مہینہ پورا ہونے پر شہر روانہ ہو رہا تھا۔ ایک ماہ میں اُسے اپنی ضروریات اور چیزوں کی مقدار کا تعین ہو گیا تھا۔ لمبی سی لسٹ جیب میں ڈالی اور گیس والا سلنڈر اُٹھا کر پلاسٹک اور فائبر کی بنی ہوئی سنگل بنچ ریموٹ کنٹرول موٹر بوٹ میں آن بیٹھا۔ جنت میں بوٹ کیلئے بنے خصوصی ریک کا لاک لیور کھینچا اور ہلکورے لیتی بوٹ کے انجن کو اسٹارٹ کر دیا۔

جرمن ساختہ بوٹ ایک سوتیس کلوگرام وزن اُٹھا کر بڑی تیز رفتاری سے پانی کی سطح پھسل کر پتن تک آ جا سکتی تھی۔ اُس نے رفتار آہستہ رکھی اور اُسی پتن کی طرف بڑھا جس پر چند دِن قبل وجدان اپنے ساتھیوں سمیت خیمہ زن ہوا تھا۔ زمینی کٹاؤ والی ایک کھوہ میں بوٹ کھڑی کی۔ نائیلون کی رسی زمین پر پھینکی اور اچھل کر بوٹ سے باہر آ گیا۔ رسی کے اگلے سرے پر ہُک بنی ہوئی تھی جس کی مدد سے اُسے بہ آسانی کسی بھی شئے کے ساتھ مضبوطی سے باندھا جا سکتا تھا۔ شیشم کے ایک نہائت قریبی درخت کے تنے کے گرد تین چار بل دے کر اُس نے ہُک اڑس دی۔ بوٹ کی چابی جیب میں ڈال کر سیٹی بجاتے ہوئے دریا کے متوازی فاصلے پر بچھی ہوئی پختہ سڑک کی طرف پیدل چل پڑا۔

یہ علاقہ اُس کا اپنا تھا۔ یہاں کے نشیب و فراز بچپن سے ہی اُس کے دیکھے بھالے تھے۔ جانتا تھا کہ نصف کلومیٹر کے فاصلے پر واقع سڑک پر پہنچ کر اُسے ڈالا (ویگن) مل جائے گا جو اُسے شہر تک لے جائے گا۔ شام ڈھلنے سے پیشتر اُسے واپس اپنی جنت میں لوٹنا تھا۔ دریا کا سیلابی دِنوں میں اُگلا ہوا پانی اور چکنی مٹی کا کیچڑ ہر جگہ پھیلا گیا تھا۔ وہ پائینچے چڑھائے بچتا بچاتا سڑک تک پہنچا۔ دیکھا، سڑک

پر جا بہ جا کھڈے پڑے ہوئے تھے جن میں مقامی زمینداروں نے ٹریکٹروں کی مدد سے مٹی بھر دی تھی جس کی وجہ سے سفر ممکن ہو گیا تھا۔

پندرہ بیس منٹ کے انتظار کے بعد اُسے ڈالا میسر آیا جس نے پون گھنٹے میں اُسے شہر میں پہنچا دیا۔ یہ جنوبی پنجاب کی ایک پسماندہ تحصیل کا ہیڈکوارٹر تھا۔ یہاں سے لوگ یا تو منتخب ہوکر اسمبلیوں میں اونگھنے کیلئے پہنچتے تھے یا پڑھ لکھ کر ترقی یافتہ اضلاع میں شفٹ ہوتے تھے۔ یہ کہنا بجا ہوگا کہ یہ علاقہ بڑے شہروں کیلئے کارآمد انسانوں کی نرسری تیار کرتا تھا۔

دکان سے کرایہ وصول کرنے کے بعد وہ کتابوں کی لائبریری پر گیا۔ کتابیں منتخب کر کے بیگ میں ڈالیں اور خریداری کی غرض سے نکل کھڑا ہوا۔ کھانے پینے کے سامان کے علاوہ اُس نے انٹرنیٹ اور موبائل فون کے کارڈ، گیتوں کی چند سی ڈیز، گیس اور لسٹ پر لکھی چھوٹی موٹی چیزیں خریدیں۔ دو پہر ڈھلنے کو تھی جب اُس نے ایک عام سے ہوٹل میں دو پہر کا کھانا کھایا اور کچھ دیر ستانے کے بعد پھر بازار میں نکل کھڑا ہوا۔ کمپیوٹر سیل اینڈ سروس کی دکان پر اُس نے جنت میں جانے سے پیشتر ڈیسک جیٹ پرنٹر کی بکنگ کروائی تھی۔ پرنٹر اور کاغذوں کا ایک رِم خریدا۔ گزشتہ ماہ بھر میں اُسے پرنٹر کی کمی بڑی شدّت سے محسوس ہوئی تھی۔ نیٹ پر دکھائی جانے والی کئی لمحاتی تصویروں کو کمپیوٹر میں محفوظ کرنے کے بعد پرنٹ کرنا چاہتا تھا۔ ڈھلتی سہ پہر میں اُس کی ترتیب دی ہوئی فہرست سیاہ لکیروں میں بدل گئی۔ اُس نے تمام ممکنہ ضرورت کی اشیاء خرید لی تھیں۔

نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ سامان اُس کی سوچ سے کہیں زیادہ تھا۔ دل میں اندیشہ سر اُٹھانے لگا کہ ڈالے کا کنڈیکٹر شاید اتنا سامان دیکھ کر معذرت کر لے۔ اَب اُسے آخری ڈالا میسر آنا تھا جس پر معمول سے زیادہ رش ہوتا تھا۔

اُس نے ٹیکسی اسٹینڈ سے کار حاصل کی۔ مختلف دکانوں پر رکھے ہوئے سامان کو ڈکی میں رکھا اور اپنی جنت کی طرف عازمِ سفر ہو گیا۔ شہر کی بیرونی چیک پوسٹ پر کھڑکی سے باہر جھانکا اور ہاتھ لہرا کر بڑبڑایا، ''گڈ بائی اے جہنم کے تنور میں جلتی ہوئی لکڑی جیسے اَندھے شہر! ایک ماہ بعد اپنی جنت سے نکل کر تمہاری ہوس کے شعلوں کا سینک تاپنے کیلئے آؤں گا۔''

ٹیکسی کے ڈرائیور نے اچنبھے سے اُسے دیکھا۔ بڑبڑاہٹ سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ بولا، ''مجھے کچھ کہا ہے جی؟''

وہ منہ بسور کر بولا، ''نہ کچھ کہا ہے اور نہ ہی کچھ کہنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔''

ڈرائیور کو پروفیسر کا لہجہ اور بات گراں گزری مگر سر جھٹک کر سکرین کے پار دیکھنے لگا۔ پروفیسر نے پتن پر پہنچ کر اپنا سامان اُتارا۔ آدھا بوٹ میں لادا اور جنت میں چھوڑ آیا۔ بقیہ سامان کو دوسرے چکر میں لے گیا۔ بوٹ کو اُس کے مخصوص گیرج میں لاک کرنے کے بعد اُس نے جیب سے سامان کی لسٹ نکالی اور نئے سامان کو کچن اور سٹور میں ترتیب سے رکھتے ہوئے چیک کرتا رہا۔ کہیں کچھ رہ نہ گیا ہو۔ تمام عمر حساب کتاب میں گزری تھی۔ اِس چھوٹے سے شمار میں کیا گڑبڑ ہوسکتی تھی۔

وہ آٹھ بجے تک مصروف رہا۔ تھک گیا۔ کوک کی ٹھنڈی بوتل فریج میں سے نکال کر چھت پر آ گیا۔ چھوٹے چھوٹے سِپ لیتا ہوا ریلنگ کے ساتھ ٹہلتے ہوئے چھت کا احاطہ کرتا رہا۔ جی ہی جی میں اپنی کامیاب کوشش کو سراہتا رہا۔ صبح شہر جاتے ہوئے اُس نے جنت کو مقفل نہیں کیا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ کوئی بھی اتنے گہرے پانی کو عبور کر کے جنت میں داخل ہونے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ افتخار بیگ نے چند ماہر مُہانوں کی مدد سے دریا کی خاصی پُن چھان کرنے کے بعد یہاں پول نصب کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اِس جگہ پر دسمبر اور جنوری کے مہینوں میں بھی پانی خاصی مقدار میں بہتا رہتا تھا۔ پہاڑوں پر برف پگھلنے کی رُت میں یہ جگہ دریا کا قلب بن جاتی تھی۔

سندھ ساگر اِس علاقے میں اپنی چار گزرگاہیں بنائے رکھتا تھا۔ عام دِنوں میں بیس کلومیٹر کی چوڑائی میں چار ٹکڑوں میں بٹ کر پرسکون بہنے والا یہ مہا ساگر جوبن پاتے ہی ایک تار سمندر کا نقشہ کھینچنے لگتا تھا۔ اُسے ایک مُہانے نے جنت کی لانچنگ کے دوران مقامی زبان میں سمجھایا تھا، ''استاد جی! اِیں موئے نانگ وانگوں اُٹھ پہرے سُتے سندھو سائیں دا وِساہ کھاون آلے توڑ سمندر ریں پُجدِن۔''

(استاد جی! مردہ سانپ کی طرح لمبی تان کر سوئے ہوئے دریائے سندھ کی امن پسندی پر بھروسہ رکھنے والے ڈوب کر سمندر بُرد ہو جاتے ہیں)۔

بُڈھے مُہانے نے اپنی طرف سے اتنی دانشمندی کی بات نہیں کی تھی بلکہ سندھ ساگر کے بیٹے ''لالہ'' کے پار رہنے والوں نے یہ کہاوت بنا رکھی تھی جن کی چار پائیوں کے نیچے والی زمین کو ایک رات سندھ سائیں نے اتنی خاموشی سے بھگو ڈالا تھا کہ اُنہیں پتہ ہی نہیں چلا تھا۔ جب پتہ چلا، تب پانی سر سے اونچا ہو گیا تھا۔

پروفیسر ایک ہاتھ میں بوتل تھامے جھک کر جنت کی فاؤنڈیشن سے سر ٹکراتے ہوئے پانی کو بہ غور دیکھ رہا تھا۔ بوتل خالی ہونے پر پانی میں اُچھال کر پاگلوں کی طرح قہقہے لگانے لگا۔ ہر آنے والی ساعت میں اُس کی ہیجانی آواز میں تیزی آتی جاتی تھی۔ اچانک تھم گیا، یوں جیسے طوفان تھم جاتا ہے۔ چیخ کر بولا، ''اے کمزوروں کے سائیں، سندھو! تو بھی جہنم کا کاردار بن کر سانسیں لے رہا ہے۔ سمجھتا ہے کہ تو بڑا دلیر اور طاقتور ہے۔ سُن! تو بُزدل اور منافق ہے۔ سیر شکم فرعونیت کی ہوس زدہ آگ کو بجھاتا ہے۔ غریب کیہل اور مُہانوں کے برہنہ جسموں کیلئے تمہارا ٹھنڈا پانی لاوہ بن جاتا ہے۔ جو صدیوں سے تمہاری وفا میں اپنی نسلیں جھونکتے چلے آرہے ہیں، اُنہیں تو کیا دیتا ہے؟......طغیانیاں، بیماریاں اور سنہری بالوں تلے سیاہ فام جوانیاں......جن کی زندگی بھیگے ہوئے کاغذ کی طرح جھٹک دی جاتی ہے۔ کوئی محبت بھرا ایک شبد ڈالنے پر رضامند نہیں ہوتا۔ کوئی چولھے میں ڈال کر اپنے بچوں کی بھوک مٹانے والی ایک چپاتی نہیں پکا سکتا......میرا باپ......سیاہ فام مُہانہ فقیرو......تم سے محبت کرتا تھا۔ چاہتا تو اِس جہنم سے نکل کر امیروں کی جنت میں چلا جاتا اور محنت مزدوری کر کے اپنا اور بیوی بچے کا پیٹ بھر لیتا مگر وہ سادہ لوحی میں باپ دادا کے عشق کو نبھاتا رہا۔ تو نے اُس کا انجام کیا کیا؟''

رات کے سناٹے میں اُس کی چیختی آواز بہت دور تک گئی۔ جانے کہاں سے پلٹ کر بازگشت بن گئی۔ اُس کا سانس پھول گیا۔ نتھنے پھلا کر پانی پر تھوکتے ہوئے نسبتاً کم بلند آواز میں پھر مخاطب ہوا، ''اوئے بے وفا! تو جن لوگوں کی تجوریاں بھرنے کیلئے اپنے دِل سے رَگیں نکال کر زمین پر پھیلا دیتا ہے، وہ تجھے صرف ایک دریا قرار دیتے ہیں۔ تمہیں مردہ خیال کرتے ہیں، تیرے حصے بخرے کرتے ہیں اور تیرے خون کی تقسیم پر لڑتے جھگڑتے ہیں۔ تمہارے قلب میں نقب لگانے کی پالیسیاں مرتب کرتے ہیں۔ تمہاری دُنیا گیر میزبانی کا شہرہ سُن کر آنے والے تمہارے مہمانوں پر اپنے شوقِ درندگی

میں گولیاں چلاتے ہیں۔تو کیسا پناہ گیر ہے؟ اپنے مہمانوں، کونجوں اور مرغابیوں کے تڑپتے پھڑ کتے خون آلود جسموں کو دیکھ کر بھی موئے نانگ کی طرح ساکت لیٹا رہتا ہے اور قاتلوں کیلئے بہنے لگا ہے۔''

پروفیسر کی آنکھوں میں نمکین پانی نے دھند طاری کر دی۔ وہ ہاتھ کی پشت سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولا تو یوں محسوس ہوا جیسے گلا رُندھ گیا ہو،''ہاہ! تو بھی کیا عجیب واقع ہوا ہے، جن لوگوں کے بچے، جن بچوں کے ماں باپ کو سمندر میں لے جا کر پھینکتا ہے وہ تجھے سندھو سائیں کہتے ہیں۔ تجھے پانی کا ایک عام سا وہیرہ نہیں سمجھتے، مہا ساگر کہہ کر تیری پرستش کرتے ہیں۔ تجھے مخاطب کر کے باتیں کرتے ہیں اور اپنا دُکھ عیاں کرتے ہوئے سسکیاں بھرتے ہیں مگر تو اِن کیلئے کچھ نہیں کرتا۔تو ظالم ہے، مُردوں کو مارنے والا شاہ مدار ہے۔''

رات کے سکوت کو اُس کی پاٹ دار آواز چیر رہی تھی۔ کسی بڑی ڈنبھرا مچھلی نے ہوا میں جست لگائی۔''ڈُب'' کی آواز سے پھر پانی میں گری۔ وہ کراہا،''ہائے اَندھے سائیں! تمہاری سلطنت میں گھیو، سنگارا، بٹی، ملہی اور نانگ مچھلیاں رہ گئی ہیں، کوئی مگر مچھ نہیں رہا۔ اِنہیں پکڑ کر چڑیا گھروں کے ہاتھ بیچ دیا۔ چند ایک مچھلیاں اور ہرنیاں کھا کر اِن مگرمچھوں کا پیٹ بھر جایا کرتا تھا مگر انسانوں کی دُنیا کے زیرک مگرمچھوں کا پیٹ کبھی بھرا ہے اور نہ بھرنے والا ہے۔فکر نہ کرو، تمہارے تَل میں پلنے والی معصوم مچھلیوں کو بھی تیل کی کھولتی کڑاہیوں میں پھینک کر تلا جا رہا ہے۔ کب تک تم اپنے لاڈلوں کا پیٹ پالو گے، ایک دِن تمہارا یہ خزانہ بھی ختم ہو جائے گا۔ پھر کیا کرو گے؟...... میری طرح چیخو گے، چلاؤ گے، ہر گزرنے والے کو مدد کیلئے پکارو گے مگر کوئی کان نہیں دھرے گا۔ ہاں تو! میں آج جہنم زادوں کی بے ثباتی پر کڑھ رہا ہوں، تم کل کڑھو گے۔ فرق صرف ایک عصر کا ہے۔ میں آج، تم کل......''

ایسے ہی وقت اچانک ٹوں ٹوں کی آواز کنٹرول روم سے اُبھری۔ پروفیسر زیرِلب مسکرایا۔ بولا، ''دیکھا؟ تمہیں مُردہ سمجھنے والوں کو کتنی بڑی غلط فہمی ہوئی ہے۔ جنت میں نصب شدہ بہتے پانی کی رفتار ماپنے والے آلے نے تمہاری قلبی کیفیت مجھ پر آشکار کر دی ہے۔ میرے طعنوں نے تمہارا دورانِ

خون تیز کر دیا ہے۔''

بز رکی آ واز ایک منٹ تک سنائی دینے کے بعد معدوم ہوگئی ۔ پروفیسر کی خودکلامیاں نہیں رُکیں ۔ چار پائی پر آ کر بیٹھ گیا۔سیگرٹ کیس سے سیگرٹ نکال کر سلگائی ۔ گہرا کش لے کر بولا،''اے دو ہزار میل لمبے ساگر! تم بھی کتنے بھولے ہو۔ میں بھی کتنا سادہ لوح ہوں ۔ چار جماعتیں پڑھ کر تمہیں چھوڑ جانے والوں کیلئے تم وجودِ سخا بن جاتے ہو۔ وہ تمہاری آب و ہوا سے کٹ کر گورے چٹے ہوجاتے ہیں ۔تمہاری آنکھوں کو خیرہ کرنے لگتے ہیں ۔ سچ کہتے ہیں، دور رہنے والا بیٹا اپنی طرف کھینچتا رہتا ہے ۔ پاس بیٹھاہوُا جھڑکیاں کھانے اور جوتے سیدھے کرنے کے سوا کسی کام کانہیں ہوتا۔تو دور گئے ہوؤں کیلئے مچلتا رہتا ہے، تحفے بھیجتا رہتا ہے اور اُن کی بے وفائی کا غصہ ہم کالے تن والوں پر نکالتا رہتا ہے۔''

بے دھیانی میں اپنی نصف عریاں ران پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ دیکھنے لگا۔ وہ ماں کے بطن سے سیاہ رنگ چُرا کر لایا تھا۔ بچپن میں نصف دِن پانی اور دھوپ میں گزارنے کی بدولت اُس کے بالوں کا رنگ شوخ اور چمکدار سنہرا ہوگیا تھا۔ ماں کے بالوں کا رَنگ بھی ایسا ہی تھا۔ دوسرے مُہانوں کے بچوں اور عورتوں کے بالوں کا رنگ بھی شوخ سنہری تھا۔

ماں اُس کے استفسار پر بتلایا کرتی تھی کہ سندھو سائیں جس کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھ دیتا ہے، اُس کے بالوں کا رنگ بدل جاتا ہے۔ باپ نے بتلایا،''دریاؤں کا شہنشاہ خضر خواجہ ہر فجر میں بچوں کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرنے کیلئے آتا ہے، جگانے کی کوشش کرتا ہے،کوئی جاگ جاتا ہے اور کوئی اپنے بھاگوں کی طرح سویا رہتا ہے۔ پلٹتے ہوئے اپنی آمد کی نشانی چھوڑ جاتا ہے۔''

بہت بعد میں اُسے پتہ چلا کہ ہر روز مچھلی کھانے کی وجہ سے یہ تبدیلی رونما ہوتی تھی ۔ چونکہ اُن کے ہاں معمول کی غذا میں بالوں کی سیاہی کو برقرار رکھنے والے جز و کیروٹین کی معمولی سی مقدار بھی شامل نہیں ہوتی تھی اِس لئے اُن کی زندگی سیاہ رہتی تھی، بال سیاہ نہیں رہتے تھے۔

سیاہ فام سیمو نے یہاں سے بھاگ کر شہر میں پناہ لینے کے فوراً بعد نہ صرف اپنا نام اور ذات بدل ڈالی تھی بلکہ خون میں شامل سندھو سائیں کی محبت پر بھی پردہ ڈال دیا تھا۔تبھی تو وہ اخبار بانٹتے بانٹتے

سرکاری پرائمری سکول میں ٹیچر بھرتی ہونے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ پڑھانے کے ساتھ ساتھ پڑھنے کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ بڑوں کی جنت کی یاترا کرنے کے بعد وہ ضلعی ہیڈکوارٹر کے گورنمنٹ کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر بھرتی ہوا تو اُس وقت وہ سیاہ فام نہیں رہا تھا بلکہ پرکشش سانولی رنگت اختیار کر چکا تھا۔ خال وخد قدرے جاذبِ نگاہ تھے تبھی محبت کرنے والوں کی نظریں اُسے سیکشوئیل پرسنالٹی قرار دیتی تھیں۔

اچانک فضا میں پھٹ پھٹ کی ایک مخصوص آواز گونجنے لگی۔ اُس نے گردن موڑ کر پانی کے بہاؤ کے رخ دیکھا۔ کچھ دکھائی نہیں دیا۔ یہ مخصوص آواز پیٹرانجن کی تھی جو عمومی طور پر دیسی ساختہ لانچوں پر نصب کیا جاتا تھا۔ لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی آواز سے اندازہ لگانا آسان تھا کہ لانچ شمالی جانب سے پانی کے بہاؤ کے رخ پر سفر کرتی چلی آ رہی ہے۔ اُس کی چھٹی حس نے اُسے خبردار کیا۔ ڈھلتی رات میں کسی لانچ کا اس طرف آنا معمول کی بات نہیں تھی۔

وہ جلدی سے کنٹرول روم میں پہنچا۔ جنت کی تمام بتیاں بشمول ایمرجنسی لائٹس، آن کر کے اسٹور میں گیا۔ سیمی آٹو میٹک گن، گولیوں کا ڈبہ، تیز روشنی والی سرچ لائٹ اور پستول اُٹھا کر بھاگتا ہوا کنکریٹ کے پلر پر چڑھا۔ ساڑھے چار فٹ قطر والے اِس ستون پر واٹر پمپ کے پاس ہی مخصوص طرز کا بینکر بنا ہوا تھا۔ لانچ خاصی قریب آ گئی تھی۔ اندھیرے میں وہ تیزی سے جنت کی طرف بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ لانچ کے قریب پہنچنے تک پروفیسر اپنے مورچے میں پوری طرح محفوظ ہو چکا تھا۔

لانچ کا انجن بند ہوگیا۔ دیسی ساختہ ہونے کی وجہ سے لانچ بہتے پانی پر لنگر انداز نہیں ہوسکتی تھی۔ جونہی جنت کی تیز روشنیوں کی زد میں آئی، پروفیسر کو لانچ کے تکونی عرشے پر چار آدمی گنیں اُٹھائے کھڑے دکھائی دیے۔ عقبی حصے میں دو مُہانے پوری مہارت کے ساتھ لانچ کو کنٹرول کرنے میں مصروف تھے۔ پروفیسر کا اندازہ ٹھیک تھا۔ آنے والے اچھی نیت سے نہیں آئے تھے۔

کئی لمحے گزر گئے۔ لانچ کا انجن بند تھا مگر وہ پانی کی رفتار سے بہتی ہوئی جنت کے کافی قریب آ گئی۔ ایسے میں ایک بھاری بھرکم آواز سنائی دی، ''کوئی ہے تو سامنے آئے...... ہے!''

بولنے والا سرائیکی زبان کے مقامی لہجے میں بول رہا تھا۔ پروفیسر نے گن کیلئے بنے ہوئے سوراخ

پر منہ رکھا۔ چیخ کر بولا، ''تم کون ہواور یہاں کیا لینے آئے ہو؟''

سطحِ آب پر دھیرے دھیرے پھسلتی ہوئی لانچ میں سے دوسری چنگھاڑتی ہوئی آواز گونجی، ''گدھے کے بچے! سامنے آ کر بات کرو، تمہیں بتائیں کہ ہم کون ہیں؟''

گالی سُن کر پروفیسر کا سر گھوم گیا۔ فطری اشتعال نے اُسے سلگا کر رکھ دیا۔ اُس نے سوراخ سے منہ ہٹایا۔ گن کی نالی سوراخ میں ڈال کر فی الفور لانچ پر فائر کر دیا۔ ٹھائیں کی تیز آواز نے پرسکون دریائی ماحول کو تہس نہس کر دیا۔ گولی عرشے کی بڑھی ہوئی گگر پر لگی۔ پروفیسر نے اوپر والے سوراخ میں سے جھانکا۔ چاروں عرشے پر سے چھلانگیں لگا کر لانچ کی چوکی پر کود گئے اور ہنگامی حالت میں مورچہ بندی کی کوشش کرنے لگے۔ اُن کی اِس غیر شعوری حرکات کی بدولت لانچ بُری طرح ڈولنے لگی اور مُہانے چیخ چیخ کر اُنہیں شانت رہنے کی ہدایات دینے لگے۔

پروفیسر نے دبنگ لہجے میں کہا، ''انسانوں کی طرح بات کرو ورنہ تمہارے سمیت تمہاری لانچ کو راکٹ لانچر مار کر تباہ کر دوں گا۔ سمجھے تم؟''

دھمکی اثر کر گئی کیونکہ دھمکانے والا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ جو نظر نہیں آتا، اُس کا دبدبہ دل کو دہلانے لگتا ہے۔

چاروں نے دیدے پھاڑ پھاڑ کر جنت کے ہر حصے کو دیکھا۔ کوئی دکھائی نہیں دیا۔ سمجھ میں آنے لگا کہ اندھا دھند فائرنگ کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ وہ اجنبی پردہ نشیں کے نشانے کی زد میں ہیں۔ چھپا ہوُا دُشمن جوابی فائر پر برانگیختہ ہو جائے گا اور گولی مار کر بھیجا اُڑا دے گا۔

پروفیسر کو گالی دینے والے نے کہا، ''ہم تمہیں نقصان پہنچانے نہیں آئے بلکہ یہ دیکھنے کیلئے آئے ہیں کہ ہمارے علاقے میں تم یہ ڈراما بازی کس مقصد کے حصول کیلئے کر رہے ہو؟''

''یہ علاقہ کسی کی ملکیت نہیں ہے۔ یہ سندھ ساگر ہے۔ تاریخ کہتی ہے کہ اِس کے سینے پر دندنانے والوں میں سے ایک بھی زندہ نہیں بچا۔ تم بھی نہیں بچو گے۔'' پروفیسر نے مورچے سے سر نکال کر چیختی ہوئی آواز میں کہا، ''میں سائیں کا بیٹا ہوں۔ اِس کا رکھوالا بھی ہوں۔ تم جو بھی ہو، مجھے کوئی غرض نہیں مگر یہ یاد رکھنا کہ مجھ سے ملنے کیلئے سجھ کے اُجالے میں اِدھر کر رُخ کرنا۔ رات کے اندھیرے

میں آ ؤ گے تو بنا پوچھے مار دیے جاؤ گے۔ چلو شاباش! اپنی پھٹ پھٹی اسٹارٹ کرو اور جدھر سے آئے ہو، اُدھر دفع ہو جاؤ۔''

مُہانے سخت خوفزدہ ہو چکے تھے۔ گڑگڑا کر اپنے مسافروں سے واپس چلنے کی اجازت مانگنے لگے۔ ایک گن بردار نے گھرک کر خاموش کرا دیا۔ اِس دوران میں لانچ جنت کے برابر میں تقریباً بیس فٹ کے فاصلے پر آ گئی تھی۔ گن بردار نے کہا،''کیا تم کسی سرکاری ایجنسی کے آدمی ہو؟''

''میں تمہارا جوابدہ نہیں ہوں۔ تمہیں جو کہہ رہا ہوں، اُسے سمجھنے کی کوشش کرو۔'' پروفیسر کا لہجہ غیر معمولی حد تک سرد ہو گیا۔

ایک اور آواز سنائی دی،''تم بہت بڑی غلطی کر رہے ہو جوان!''

''غلطی؟ ہا...... ہاہا......'' پروفیسر نے اشتعال آمیز استہزائیہ لہجے میں قہقہہ لگایا،''میرا اندازہ ہے کہ تم علاقے کے رسہ گیر جاگیرداروں اور سیاسی بڑوں کے رکھوالے کتے ہو جنہیں قانون کی نظر سے چھپانے کیلئے بیلے میں رکھا گیا ہے۔ یہ نہ تو کسی بیلی (مزدور) کا گھر ہے، نہ کسی مُہانے کی پھٹ پھٹی...... یہ دن کے اجالے میں آنے والوں کیلئے جنت ہے، رات کو چوروں کی طرح نقب لگانے والوں کیلئے دوزخ کا کھلا دروازہ۔ سمجھ گئے ہو تو کل اپنے سردار کو خشکی کے راستے یہاں بھیج دینا۔ مغربی جانب کھلے میں کھڑا ہو گا تو اُسے سرس کے درخت پر لٹکتے ہوئے پلے کارڈ پر میرا موبائل فون نمبر لکھا ہوا مل جائے گا۔''

''تم اتنا پراسرار بننے کی کوشش کیوں کر رہے ہو؟''

پروفیسر نے جواب دینے کے بجائے جنت کے عقبی کونے سے پیچھے کی طرف نکلتی ہوئی لانچ پر فائر داغ دیا۔ نشانہ خطا ہو گیا۔ گولی پانی میں لگی اور اچٹتی ہوئی اپنی سیدھ میں نکل گئی۔ ٹھائیں کی ڈراؤنی آواز کے ساتھ ہی پانی کے چند چھینٹے اُڑ کر لانچ میں بیٹھے ہوؤں پر پڑے۔ پروفیسر نے چیخ کر کہا، ''میرا جواب دیکھ لیا ہے تو سمجھنے کی کوشش کرو ورنہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔''

اپنی رَو میں، اپنی طاقت کی سرشاری میں منہ اُٹھا کر بھاگے چلے آنے والوں کے دماغ میں بات بیٹھ گئی۔ لانچ میں دکھائی دینے والے ہیولوں میں ہل چل مچی۔ موت کے خوف نے مُہانوں کے سیاہ

جسموں میں غیر معمولی مستعدی بھر دی۔ ایک نے پیٹر کو ہینڈل لگا کر چکر دیا اور دوسرے نے جھٹکے کے ساتھ ٹِس چھینک کر انجن اسٹارٹ کر دیا۔ چونکہ لانچ مقامی سطح پر تیار کی گئی تھی، اِس لئے لمبا چکر کاٹ کر پلٹی اور نسبتاً سست روی سے شمال کی جانب بڑھنے لگی۔ الٹے رُخ پر چلنے کی وجہ سے انجن پر خاصا دباؤ پڑ رہا تھا۔

پروفیسر چند منٹوں تک بینکر میں کھڑا رہا پھر لانچ کے اوجھل ہونے پر بینکر سے نکل کر کنٹرول روم میں آیا۔ سکیورٹی سسٹم آن کیا اور گن اُٹھائے بیڈروم میں آ کر لیٹ گیا۔ اَب وہ بے فکری سے نیند کے مزے لوٹ سکتا تھا۔ افتخار بیگ نے جنت کے چاروں طرف اَن گنت سنسرز فٹ کرر کھے تھے جو پچاس فٹ کے دائرے میں ہونے والی معمولی سی نقل و حرکت پر اُسے خبردار کر سکتے تھے۔

...۞...

قسمت کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک ننھا سا پُرزہ دَبا ہوُا تھا۔ ہنس نے پوچھا،''اے! یہ کیا ہے؟''

''تمہیں نہیں پتہ؟ یہ خط ہے، فینی کے بھائی نے بھیجا ہے۔''

''فینی کا بھائی کہاں رہتا ہے؟''

''وہ سودی اَرب (سعودی عرب) میں رہتا ہے۔'' قسمت نے کہا،''نہیں بلکہ وہ انگریزوں کے ملک میں رہتا ہے۔''

''کیوں؟ وہ وہاں کیوں گیا؟'' ہنس کے لہجے سے استعجاب عیاں تھا۔

''مجھے کیا پتہ؟ تم فینی سے پوچھ لو۔''

''فینی میرے ساتھ بات نہیں کرتی۔ کہتی ہے کہ میں لڑکوں کے ساتھ بات نہیں کرتی۔'' ہنس نے مایوسی سے کہا۔

''میں پوچھوں؟''

''پوچھو!''

وہ فینی سے باتیں کرنے لگی۔ سوال بھی اپنا، جواب بھی اپنا۔ پھر ہنس کی طرف متوجہ ہو کر بولی،

''فینی کہتی ہے کہ وہ وہاں پڑھنے کیلئے گیا ہے۔''

''اچھا!'' ہنس نے کہا۔ پھر فینی کے کزن کی طرف اشارہ کر کے بولا ''یہ ایسے کیوں بیٹھا ہے؟''

''یہ بڑا دُکھی ہو رہا ہے۔''

''کیوں؟''

''اِس کی کزن نے مدھو سے دوستی جو کر لی ہے۔''

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر فینی کے کزن کو دیکھا۔ بچپن ہنسنے کیلئے انسانی زندگی پر اُترتا ہے۔ دونوں فینی کے کزن کی نقلیں اُتار اُتار کر ہنسنے لگے۔

مانو اپنے معصوم سے چہرے پر عجیب سے تاثرات لئے باری باری دونوں کو دیکھتے ہوئے چلانے لگی، ''میاؤں......میاؤں......''

...•...

وہ رات کی رانی کا پودا کالج میں چھوڑ آئی۔ شہاب کی انگلیوں کا لرزتا ہوُا لمس بائیں پنڈلی پر لئے گھر آ گئی۔ پہلی ملاقات ذہن پر عذاب بن کر اُترنے لگی تھی۔ اَبھی اُسے یہ علم نہیں تھا کہ اُسے وارفتہ نگاہوں سے دیکھ کر دل کی دُنیا میں ہل چل مچانے والا کوئی عام مرد نہیں تھا، ضلع ناظم کا اعلیٰ تعلیم یافتہ بیٹا تھا۔ منگو کوچوان کی پیٹھ پر پڑنے والے چابکوں کی تعداد میں اضافہ کرنے والے اِس نئے نظام نے اُس کے ہاتھ بہت لمبے کر دیے تھے۔ اَبھی محض یہی پتہ تھا کہ اُس بانکے کے سینے میں بڑا ہمدرد دِل دھڑکتا ہے۔

کالج سے واپسی پر لباس تبدیل کرنے کی عادی تھی۔ وارڈ روب کے سامنے کھڑی ہوئی تو یکبارگی سے نظر گھٹنے پر پڑ گئی۔ ٹھہر گئی۔ سوچنے لگی، ''عجیب شخص نکلا، ڈیڑھ دو گھنٹے کی ہمراہی میں اُس نے میرا چہرہ دیکھنے کی خواہش تک کا اظہار نہیں کیا۔ کیا میرے بدن میں اتنی بھی کشش نہیں ہے دیکھنے والا قلعے کی فصیل دیکھ کر ہی لوٹ جائے؟''

ایسے میں دِل سوچنے کا کام دینے لگتا ہے۔ بولا، ''پگلی! کبھی تم نے اپنے ننگے پیروں کو اُس نظر سے

دیکھا ہے جس نظر سے آج شہاب نے دیکھا۔تاڑنے والے مرکزی دروازے اور بنیادوں کو دیکھ کر قلعے کے اندر کی دُنیا کا احوال جان لیتے ہیں۔فاتح مہلت دے کر پلٹا ہے، کہہ گیا ہے کہ اپنی سلطنت کو بچاسکتی ہوتو بچالو ورنہ میں تو دروازے سے گزر کر قلعے کے قلب تک پہنچنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔''

اُسے دل کی بات کا یقین نہیں آیا۔ بیڈ پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ بے دھیانی میں اپنے پیروں کو دیکھنے لگی۔اپنی ہی نظر سے گدگدانے لگی۔پیروں میں سرسراہٹ سی ہونے لگی۔سوچنے لگی،''شاید پگلا دِل ٹھیک ہی کہتا ہے۔''

شہاب کی انگلیوں کا لمحاتی لمس یاد آ گیا تو سرشاری کی کیفیت نے گھیر لیا۔ پھٹ کر اسٹکر سے رفو ہوئی شلوار کو چٹکی میں پکڑ کر اوپر کھینچ لیا۔ بہ دقّت اسٹکر کو کھینچ کر باہر نکالا۔ کپڑے کے پھٹے ہوئے ٹکڑے کو اوپر اُٹھایا۔ گھٹنے سے کچھ نیچے کی سفید چمکدار جلد دکھائی دی۔نرگسیت کیا ہوتی ہے؟ دل عملی طور پر بتلانے لگا۔اپنے آپ پر فریفتہ ہوتے ہوئے شہاب کی والہانہ نگاہوں کے بارے میں سوچ سوچ کر شرمانے لگی۔سیدھے ہاتھ کی دو انگلیاں سوراخ میں داخل کیں۔لمس کو محسوس کیا تو بے گداز جلد مچل اُٹھی۔یوں لگا جیسے شہاب کی لرزتی ہوئی انگلیاں بڑی نرمی سے چھوکر اپنی ہویت کا احساس دلا رہی ہوں۔

دل کی دُنیا عجیب ہوتی ہے۔افتخار بیگ جیسی جاذبِ نظر شخصیت سے برسوں میں متاثر نہیں ہوئی تھی، ایک اجنبی نے اپنا آپ دکھا کر آن کی آن میں اپنی جانب کھینچ لیا تھا۔جس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی، اُسی کو سوچتے ہوئے رات کی رانی دِن کے اُجالے میں بے طرح سے بکھر رہی تھی، سلگ رہی تھی......''اُس سے ملتے وقت دل گھبرارہا تھا، دور ہو کر بے چینی رَگ رَگ میں اُترتی جاتی ہے۔ایسا کیوں ہے؟ کوئی بتلائے تو......کوئی سمجھائے تو......''

سمجھانے والا دل کے دروازے پر دستک دینے کیلئے آ گیا۔موبائل فون میں ایک چنچل گیت کی بنی رنگ ٹون بجی۔اُس نے چونک کر سکرین پر جھانکا۔نمبر اجنبی تھا۔کون ہوسکتا ہے؟ سوچ میں پڑ گئی۔دل نے ٹھوکا دے کر سمجھایا کہ جب تک فون آن نہیں کرو گی، پکارنے والے کی شناخت نہیں ہو سکے گی۔فون آن کیا تو شہاب کی آواز کانوں میں پڑی۔دھیرے سے پکار رہا تھا،''ہیلو......ہیلو!''

اتنی جلدی شہاب کی آواز کو پہچان لینے پر اُسے خود پر حیرانی ہوئی۔ کچھ بولنا چاہتی تھی کہ گڑبڑا سی گئی۔ بہ دقّت تمام کہہ پائی، ''جج......جی!''

''تم یقیناً مصباح ہو۔کیسی ہو؟''

''جی...... میں ٹھیک ہوں۔'' وہ تذبذب آمیز لہجے میں بولی۔ اچانک پریشان ہوگئی۔شہاب کو اُس کا فون نمبر کہاں سے ملا تھا؟

زیادہ سوچ نہ پائی۔شہاب کہہ رہا تھا، ''میں اجازت لے کر رابطہ کر رہا ہوں۔لگتا ہے کہ تم میرے فون کرنے پر پریشان ہوگئی ہو، کیا ایسا ہی ہے؟''

وہ جلدی سے بولی، ''نہیں مگر میرا فون نمبر تمہارے پاس......''

''ایسا ہی ہوتا ہے۔انسان خوش فہمیوں میں بہت آگے نکل جاتا ہے۔ہسپتال میں تمہارا نام آؤٹ ڈور رجسٹر پر درج کرواتے ہوئے میں نے تمہاری دوست سے نمبر پوچھا تھا۔اُس نے بتایا، سچ کہتا ہوں، آج تک کوئی بھی نمبر فقط ایک بارسن لینے پر مجھے یاد نہیں رہا، آج رہ گیا۔''

وہ حیرت بھری آواز میں بولی، ''جب تمہیں میرے نام کا علم ہو چکا تھا تو پھر مجھ سے نام پوچھنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''وہ تو میں نے اپنا نام بتلانے کیلئے پوچھا تھا۔'' وہ شوخی سے بولا۔

''تم کیا کرتے ہو؟'' وہ نروس سی ہوگئی۔

''پہلے کچھ نہیں کرتا تھا، آج کرنے لگا ہوں۔''

''کیا؟'' وہ متعجب ہوئی۔

''عشق!''

''کس سے؟'' اُس کا دل بے اعتدال ہوگیا۔

''تم سے!'' شہاب نے پُراعتماد لہجے میں کہا، ''کسی فلاسفر نے کہا ہے کہ عشق بذاتِ خود ایک کام ہے، کچھ اور کرنے کی فرصت نہیں دیتا۔''

مصباح کی تیز زبان چلتے چلتے رُک گئی۔ دل تیزی سے دھڑکنے لگا کہ یوں بے دھڑک انداز میں

تو آج تک افتخار نے بھی اُس پرحقِ ملکیت نہیں جتلایا تھا۔

''کیا سوچنے لگی ہو؟''

''تمہارے بارے میں سوچ رہی ہوں۔'' اُس نے سوچ سمجھ کر جھوٹ بول دیا حالانکہ وہ سوچ رہی تھی، ''یہ کیسا دعویٰ ہے۔ یہ کیسا اندھا لفظ ہے جس کی ایک بار کی ادائیگی سننے والے آزاد انسان کو اپنا آپ گروی رکھنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ یوں کہ بندہ اپنے تخلیق کاروں تک سے پوچھنا گوارا نہیں کرتا۔''

وہ خوشی سے بولا، ''سوچتی رہو۔ سوچنے سے دل میں محبت پیدا ہوتی ہے۔''

اُس کا لہجہ دل کے تاروں کو چھیڑ کر نغمے کی لے اُٹھانے لگا تھا۔ مصباح نے گھبرا کر جلدی سے فون بند کر دیا۔ تنفس غیر معمولی حد تک مشتعل ہو گیا۔ ایسے میں پھر شہاب کا نمبر سکرین پر جگمگانے لگا۔ گھنٹی بجتی رہی، وہ پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھتی رہی مگر کال اٹینڈ کرنے کی جرأت نہ کر پائی۔ بیڈ پر لیٹ گئی اور بانہوں میں منہ چھپا کر مسکرانے لگی۔ کم بخت بدن کا اَنگ اَنگ بولنے لگا تھا۔ جو کبھی نہیں بولا تھا، آج زبان بن کر چھیڑنے لگا تھا۔

شہاب بار بار ٹرائی کر رہا تھا۔ وہ فون کی طرف دیکھنے سے ہچکچا رہی تھی۔ کافی دیر گزر گئی، شاید گھنٹہ گزر گیا تھا جب وجدان کمرے میں داخل ہوا۔ بیڈ کے پاس کھڑا ہو کر بولا، ''عمران بھائی بار بار ٹرائی کر رہے ہیں مگر تم فون ہی اٹینڈ نہیں کرتی ہو، کیا بات ہے؟ کوئی ناراضی ہے کیا؟''

وہ چونک کر اُٹھ بیٹھی۔ جھپٹ کر فون اُٹھایا۔ سمجھ میں آیا کہ فون پر شہاب نہیں، اُس کا بھائی عمران اُسے پکار رہا تھا۔ جلدی سے فون آن کر کے بولی، ''بھائی! میں سمجھی تھی کہ میری سہیلی روزینہ کا فون ہے۔ کیسے ہو؟''

''تم نے تو مجھے پریشان کر کے رکھ دیا مصباح!'' عمران نے طویل سانس حلق میں اُتارے ہوئے کہا، ''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آج کل اسٹڈی میں اُلجھا ہوا ہوں، تم کہو، تعلیم کیسی جا رہی ہے؟''

وہ بتانے لگی۔ پھر اُس سے اُس کے کالج کے بارے میں پوچھنے لگی۔ اُسے وہاں کے ماحول کے بارے میں بڑا تجسس لاحق رہتا تھا۔ تبھی اُس نے بڑی لگن سے پوچھا، ''بھائی! تم اپنے کالج کے

بارے میں بہت کچھ کہہ چکے ہو، اپنے شہر کے بارے میں بھی کچھ بتلاؤ ناں!''

عمران کی شوخ سی آواز فون میں اُبھری، ''اگر میڈیکل کا شعبہ جائن کرلیتیں تو اپنی آنکھوں سے وین ژوسٹی کے خوبصورت مناظر دیکھتیں۔''

''اَب بتاؤ بھی......'' وہ منہ بنا کر بولی۔

''ہائے مصباح! کیا بتاؤں کہ یہاں انسانی ہاتھوں نے خوبصورتی کو کتنی نفاست سے قید کر رکھا ہے۔ ایسٹ چائنا سی اور دریائے اوجیانگ کے روح پرور نظارے انسان کو خوابوں کی دُنیا میں لے جاتے ہیں۔ صوبہ زی ژیانگ کے جنوب میں واقع اِس شہر کو دیکھنے کیلئے ٹورسٹ پوری دُنیا سے بھاگے آتے ہیں۔ مون سون ہوائیں، ٹھنڈ، اُجلی دھوپ......مصباح! اِن لوگوں نے اپنی زندگی کو خوبصورت توازن دے کر بہت دلکش بنالیا ہے۔ ہم اَبھی بہت پیچھے ہیں۔ سچ کہوں تو خود کو بھی بُرا لگتا ہے۔ ہمیں اَبھی تک اپنی غلاظت سے جان چھڑانے کا سلیقہ بھی نہیں آیا۔''

وہ غصے سے چیخی، ''ہماری خامیاں نہ گنو، اُن گول مٹول لوگوں کی تعریفیں کرو۔''

''میں انڈین لڑکوں کے ہمراہ ساحلِ سمندر پر گیا تھا۔ کئی سال قبل کراچی کے کوسٹل ایریا کو دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا تھا۔ یہاں کی مینجمنٹ اور قانون کی بالادستی نے مجھے احساسِ کمتری کا شکار کر دیا۔'' عمران نے یاس آمیز لہجے میں کہا۔

وہ تپ گئی۔ اُسے اپنے ملک کا گلہ کرنا یا سننا اچھا نہیں لگتا تھا۔ منہ بنا کر بولی، ''اچھا چھوڑو اپنے وین ژوسٹی کو......اپنی پستہ قامت گرل فرینڈ کے بارے میں بتلاؤ۔''

وہ قدرے جھینپ کر بولا، ''کیا بہنوں سے ایسی باتیں کی جاتی ہیں؟''

''تو کیا پاپا سے ایسی باتیں کرو گے؟''

''تمہیں شرم نہیں آئے گی سُن کر؟''

''بھائی! کچھ سوچ کر بولا کرو۔ تمہیں لڑکیوں سے دوستی کرتے ہوئے شرم نہیں آتی، مجھے اُن کی خیریت دریافت کرتے ہوئے شرم کیوں آئے گی؟'' وہ مصنوعی خفگی سے بولی۔

''ایمی اپنے وطن تائی پی (تائیوان) چلی گئی ہے۔ کبھی نہ لوٹنے کیلئے۔ مجھے اُس کے جانے کا

صدمہ ہوا مگر انداوان نے اُس کی کمی پوری کردی ہے۔'' اُس نے بتایا۔

''یہ انداوان کیا شئے ہے؟'' مصباح نے دلچسپی لی۔

''بڑی بے تاب ہورہی ہو، ذرا دَم تو لینے دو۔'' وہ ہنسا،'' چوبیس سالہ انداوان ہو بائی (شنگھائی) سے یہاں اپنے دفتری کام کے سلسلے میں دو ماہ کیلئے آئی ہوئی ہے۔ پیشے کے لحاظ سے مترجم ہے۔ بڑی روانی سے انگلش بولتی ہے۔ انگلش میں ہی جب حالِ دل عیاں کرتی ہے تو کیا بتاؤں مصباح! بس دل چاہتا ہے کہ وہ بولتی رہے، عمران سنتا رہے......''

مصباح کرید کرید کر انداوان کے بارے میں پوچھتی رہی۔ پھر جب تعریفیں سُن سُن کر اکتا گئی تو حسبِ عادت چیخ کر بولی،'' اَب بس بھی کرو بھائی! پہلے کھلتے نہیں ہو، جب کھلتے ہو تو منہ بند کرنے کا نام ہی نہیں لیتے ہو۔ مجھے نیند آ رہی ہے، پلیز فون بند کردو۔''

فون کے سپیکر میں عمران کا جاندار قہقہہ گونجا اور رابطہ منقطع ہو گیا۔

...•...

ہنس اپنے باپ کی گود میں بیٹھا بُرے بُرے منہ بنا رہا تھا۔ باپ نے گال پر پیار ثبت کرتے ہوئے پوچھا،'' کیا بات ہے میری جان؟''

''میں اور قسمت روز کشتی کو دریا سے نکال کر گھر لاتے ہیں، اگلے دِن پھر اُسے سندھو سائیں میں رکھتے ہیں۔''

''تو؟''

''ہم نے سوچا ہے کہ اگر پلاٹ کے اردگرد دیوار بنا دی جائے تو ہماری کشتی رات دِن دریا میں رہے گی۔''

''ہیں؟'' باپ کے منہ سے کلمہ حیرت نکلا،'' یہ کیسے ممکن ہے بیٹا؟''

ہنس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ منہ پھلا کر بیٹھ گیا۔ باپ کا دِل مٹھی میں آ گیا۔ سوچنے لگا۔ سوچتے سوچتے اِس نتیجے پر پہنچا کہ ہسپتال کے اسٹور میں پڑی ہوئی خاردار تار کو پلاٹ کے اردگرد لگایا جا سکتا

ہے۔اُس نے فوری طور پر ہنس کو بھیج کر مالی کو بلوایا۔اُسے حکم دیا کہ وہ چوکیدار کو ساتھ لے کر فوری طور پر گراسی پلاٹ کے اِرد گرد خاردار تار کی باڑ لگا دے۔ادھیڑ عمر مالی نے شکوہ کناں نظروں سے ہنس کو دیکھا اور کہا،''کیوں ہنس میاں! کیا تم کہتے تو میں باڑ بنا کر نہ دیتا؟''

ہنس نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ سنجیدگی سے کسی سوچ میں ڈوبا رہا۔شام کو جب دونوں پلاٹ میں پہنچے تو خاردار تار مہارت کے ساتھ لگائی جا چکی تھی۔دونوں نے بڑی توجہ سے معائنہ کیا۔مطمئن ہو کر اپنی کشتی کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ باتیں کرنے لگے۔قسمت موسمی فلو کا شکار تھی۔ بار بار چھینک رہی تھی۔ننھی سی ناک بار بار پونچھنے کی وجہ سے سرخ ہوگئی تھی۔ہنس نے پوچھا،''کوئی دوائی کھائی ہے؟''

''نہیں۔''وہ قدرے بدلی ہوئی آواز میں بولی۔

''کیوں؟''

''پاپا کہتے ہیں کہ نزلے زکام کا کوئی علاج نہیں ہوتا۔'' قسمت نے اپنے گلابی رنگ کے سوتی فراک کا گہرا نیلا رِبن دائیں بائیں گھماتے ہوئے کہا۔

''اچھا۔میرے بابا تو مجھے گولیاں لا کر دیتے ہیں۔سیرپ بھی پلاتے ہیں۔ میں ٹھیک ہو جاتا ہوں۔''ہنس نے کہا۔

''پاپا کے پاس گولیاں اور سیرپ نہیں ہوگا تبھی کہتے ہوں گے۔''

اچانک ہنس نے پورے جوش سے کہا،''اے! وہ دیکھو۔ایک بڑا سا چیونٹا پوڈو کی طرف آ رہا ہے۔اَب جانے کیوں وہ ٹیلے پر رُک گیا ہے۔کمینہ ہماری کشتی کی طرف دیکھے جا رہا ہے۔دیکھو دیکھو!''

قسمت نے ننھا سا رومال ناک پر رکھا ہوُا تھا۔بھاری آواز میں بولی،''ماما بتاتی ہیں کہ چیونٹوں کی آنکھیں نہیں ہوتیں۔پھر وہ کیسے ہماری کشتی کو دیکھ سکتا ہے۔''

''اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔''

قسمت نے غور سے دیکھا۔آنکھیں نظر نہیں آئیں۔اُس نے گھاس کا ایک لمبا سا تنکا دریا میں اِس طرح رکھ دیا کہ چیونٹا اُس پر چڑھ کر بہ آسانی پوڈو کے پاس آ سکتا تھا۔بولی،''اَبھی پتہ چل جائے

گا۔ اگر اس کی آنکھیں ہوں گی تو وہ پل پر چڑھ کر کشتی میں آ جائے گا۔''

دونوں اشتیاق سے اُٹھی دُم والے چالاک چیونٹے کو دیکھنے لگے۔ چیونٹا ادھر ادھر گھومتا رہا۔ ہنس بولا، ''اُسے پل نظر آ گیا ہے، اَب گھوم پھر کر خطرے کا اندازہ کر رہا ہے۔''

قسمت خاموش بیٹھی چیونٹے کی حرکات کو بہ غور دیکھ رہی تھی۔ چند لمحوں کے بعد چیونٹا تنکے پر چڑھ کر کشتی کی طرف بڑھنے لگا۔ ہنس نے چیخ کر کہا، ''وہ ہماری کشتی پر قبضہ کر لے گا۔''

قسمت کے انہماک میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ بولی، ''پوڈو اُس سے خود ہی نبٹ لے گا۔''

''اگر چیونٹا جیت گیا تو؟''

''ہنس! دیکھو تو سہی، زیادہ تنگ کرے گا تو اِسے پانی میں پھینک دیں گے۔'' قسمت نے لاپرواہی سے کہا۔ ایسے میں اُسے پھر چھینک آ گئی۔ ناک صاف کرتے ہوئے بولی، ''پوڈو کو پتہ ہے کہ میں بیمار ہوں اور اُس کی مدد نہیں کر سکتی۔''

چیونٹا کشتی میں پہنچ گیا۔ پوڈو کے ارد گرد گھومتا رہا۔ پھر کشتی کی سیر کر کے واپس روانہ ہو گیا۔ وہ جونہی تنکے سے اُترا، ہنس نے کوئی وقت ضائع کئے بغیر تنکا اُٹھا لیا، بولا، ''شکر ہے اُس نے ہمارے پوڈو سے لڑائی نہیں کی۔ پوڈو کافی دِنوں سے بھوکا ہے۔ کمزور ہو گیا ہے۔ دیکھو کیسے ہڈیاں نکل آئی ہیں۔''

قسمت اپنا فراک سنبھالتے ہوئے اُٹھی اور کلانچیں بھرتی ہوئی اپنے کوارٹر میں گھس گئی۔ چند منٹوں کے بعد ٹکی پیک بسکٹ اور چھوٹے چھوٹے برتن اُٹھائے ہنس کے پاس پہنچی۔ وہ پوڈو کی خوراک کا انتظام کر چکی تھی۔

کھڑکی میں دو سائے لہرائے۔ تھکی تھکی نسوانی آواز اُبھری، ''جب تک دونوں کھیلتے رہتے ہیں، تب تک آپ یہاں کھڑے رہتے ہیں۔ بچوں کی ٹوہ لینا اچھی بات نہیں ہے۔''

''شناں!''

''جی!''

''مجھے یوں لگتا ہے جیسے قسمت ہمارے ہنس کے ساتھ کوئی عجیب سا کھیل کھیلنے لگی ہے۔ مجھے یوں

لگتا ہے جیسے......''

''پلیز! بچوں کی معصومیت پر شک مت کیجئے گا ورنہ پوری کائنات ہی نامعتبر ہو جائے گا۔''

''میں شک نہیں کر رہا، میں کچھ اور دیکھ رہا ہوں۔''

''کیا؟''

''یہی تو سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔تم پروفیسر وسیم بزدار سے مل چکی ہو، وہی، سنجیدہ اور بردبار......جس کے بارے میں طویل عرصہ تک تمہاری رائے رہی تھی کہ وہ نفسیاتی کیس ہے۔''

''ہاں۔تو پھر؟''

''اِدھر ہنس اور قسمت نے اپنی کھلونا کشتی پانی میں ڈالی، اُدھر پروفیسر وسیم بزدار نے پانی میں اپنی جنت تعمیر کر لی۔کیا اِسے محض اتفاق کا نام دیا جائے گا؟'' لہجہ خاصا تشویش ناک تھا۔

ہسپتال کی خاموش فضا میں جلترنگ بج اُٹھی۔شناں کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ ہنستے ہنستے توت کی گیلی ٹہنی کی طرح بل کھانے لگی۔ بہ دقّت تمام بے ربط انداز میں بولی، ''آپ بھی بس......کبھی کبھی بہت دور نکل جاتے ہیں۔ہنس کبھی کھلونا جہاز اُڑاتا ہے، کبھی کھلونا ٹرین چلاتا ہے تو کبھی ریموٹ کنٹرول کرین سے چھوٹی چھوٹی لکڑیاں اُٹھانے لگتا ہے...... بچے کھیلتے رہتے ہیں، کھیل کو کسی واقعے سے منسوب کر کے خود کو ہلکان کرنا کسی مفکر کا کام تو ہو سکتا ہے، مجھ جیسی عام سی گھریلو عورت کا نہیں......''

...(❀)...

پروفیسر چھری کی مدد سے بریڈ پیس پر مکھن اور شہد لگا رہا تھا جب اُس کے فون کا بزر بجا۔اُس نے چولھے پر رکھی کیتلی میں جھانکا۔ اَبھی دودھ کو جوش نہیں آیا تھا۔کچن سے نکل کر فون اُٹھانے کیلئے بیڈ روم کی طرف بڑھا۔ایسے میں اُسے بیلے والے پتن پر سرس کے درخت کے نیچے کھڑا بلند قامت آدمی دکھائی دیا۔ پروفیسر کے لبوں پر زہر خندسی مسکراہٹ تیر گئی۔ ڈاکوؤں کا سردار اُس کے ٹانکے ہوئے پلے کارڈ پر سے فون نمبر پڑھ کر رابطہ کر رہا تھا۔

وہ اپنا فون اُٹھا کر کچن میں آ گیا۔آن کر کے کان سے لگاتے ہوئے بولا، ''تم کون ہو اور کیوں

میرا سکون غارت کر رہے ہو؟''

فون کرنے والے شخص کا لہجہ اُس سے بھی کہیں زیادہ دبنگ اور تلخ تھا۔ بولا، ''گزشتہ رات تم نے میرے بندوں پر فائرنگ کی تھی۔ تمہاری قسمت اچھی تھی کہ میں نے اُنہیں مزہ چکھانے کیلئے نہیں صرف پوچھ گچھ کیلئے بھیجا تھا۔''

''تو کیا تم مجھے مزہ چکھانے کیلئے آئے ہو؟'' پروفیسر نے استہزائیہ انداز میں پوچھا۔

''نہیں!'' اجنبی نے قطعی لہجے میں کہا، ''میں ایسا کوئی ارادہ نہیں رکھتا مگر تم مجبور کرو گے تو میں انتہائی قدم اُٹھانے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔''

پروفیسر اُس سے ٹکراؤ کی فضا پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ محض اُسے اور اُس کے ہرکاروں کو خود سے دور رکھنے کا خواہاں تھا۔ بولا، ''کیا تم بیلے والوں کے سردار ہو؟''

''ہاں!''

''پڑھے لکھے لگتے ہو۔''

''میں نے بھلے دور میں گریجویشن کیا تھا۔''

''پھر اِس لائن میں کیسے آ گئے؟''

''یہ لمبی کہانی ہے۔ میں اپنے ساتھیوں کی طرح خود سے اِس فیلڈ میں نہیں آیا بلکہ مجھے اَمن کے داعیوں نے دھکیلا ہے۔ تم کون ہو؟'' اجنبی قدرے بے تکلف ہونے لگا تھا۔

وہ بولا، ''میں جو کوئی بھی ہوں، تمہارا دُشمن نہیں ہوں اور نہ ہی میں کسی ایجنسی کا کارندہ ہوں۔ شاید تم لوگوں نے مجھے کوئی پراسرار شخصیت سمجھ لیا ہے، ایسا نہیں ہے۔ میں سکون اور تنہائی کی تلاش میں یہاں آیا ہوں۔''

''کب تک رہو گے؟''

''مرتے دَم تک......'' پروفیسر نے بریڈ کا ٹکڑا کاٹ کر منہ میں رکھتے ہوئے کہا، ''میں نفرت، زہر، آگ اور ناانصافیوں پر مبنی جہنم کو ہمیشہ کیلئے چھوڑ کر سندھ ساگر میں قیام پذیر ہوا ہوں۔ میں زمین میں دفن ہونا بھی پسند نہیں کروں گا، سندھ سئیں کے ٹھنڈے اور رازدار پانی میں عضو عضو ہو کر

بکھر جاؤں گا۔‘‘

’’کیا تم پاگل ہو؟‘‘ ڈاکوؤں کے سردار کے لہجے میں دُنیا جہان کی حیرت سمٹ آئی، ’’تم نے لاکھوں روپے صرف سندھو سئیں میں رہنے کیلئے برباد کر دیے، یہاں تمہیں ایسا کیا مل رہا ہے جو تمہیں بھاگتی، دوڑتی، چمکتی اور چلچلاتی دُنیا میں نہیں ملا؟‘‘

پروفیسر کے حلق سے قہقہہ برآمد ہوا۔ سنبھل کر بولا، ’’کیا تم اکیلے آئے ہو؟‘‘

’’نہیں...... میری حفاظت کیلئے اَن گنت سورمے گھات لگائے موجود ہیں جو خطرہ بھانپتے ہی تمہارے اِس قلعے کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔‘‘

’’احمق آدمی! میں مٹی سے اپنا ناتا توڑنے کیلئے یہاں آیا ہوں۔ کیسے ممکن ہے کہ میری جنت میں مٹی کی اینٹ استعمال ہوئی ہو، ہاں! یہ جذبوں کے بیج اور آنسوؤں کی آبیاری سے نمو پانے والی لکڑی کی بلیوں سے تیار شدہ خواب گاہ ہے، عشرت کدہ ہے، زمین سے نفرت کرنے والے کی تنہائی سے آراستہ قلعہ ہے۔ یہ تم جیسے فرعونوں کے شر سے بچاتا ہے۔ تم دھمکیاں مت دو، جو کر سکتے ہو، پہلے وہ کر و اور اپنی طاقت کو آزماؤ۔ سر ٹکرا کر زخمی ہو جاؤ تب شکست کا احساس سینے میں بھر کر میری جنت میں چلے آنا۔ بیٹھ کر مزے کی باتیں کریں گے۔‘‘

کھلے پتن پر چند لمحے خاموشی طاری رہی۔ پھر فون میں سردار کی آواز اُبھری، ’’میں نے تو سن رکھا ہے کہ تم اپنی کشتی میں کسی کو قدم رکھنے کی اجازت نہیں دیتے۔‘‘

’’تم نے ٹھیک سنا ہے۔‘‘ پروفیسر نے تیز پتی والی چائے کپ میں اُنڈیلی اور گھونٹ بھر کر کہا، ’’تمہیں ایک بار یہاں بلاؤں گا، اگر تم میرے مطلب کے آدمی ثابت ہوئے تو اپنی جنت میں بلاتا رہوں گا ورنہ اِسی کھلے پتن پر کھڑے ہو کر حسرت بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھتے رہو گے۔‘‘

ڈاکو نے قہقہہ لگایا۔ پاٹ دار آواز میں بولا، ’’شاید تم خود پر زیادہ ہی اعتماد کرنے کے عادی ہو گئے ہو۔ بہ ہر حال! مجھے تمہاری جنت میں داخل ہونے کیلئے کیا کرنا ہوگا؟‘‘

پروفیسر نے نسبتاً بڑا گھونٹ حلق میں اُتارا۔ سوچا، اُسے جنت میں آنے دے، نہ آنے دے یا کیا کرے...... شروع دِن سے وہ اُس کی آمد کا منتظر تھا۔ سمجھتا تھا کہ دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر رکھنا سود

مند ثابت نہیں ہوتا۔ مگر مچھ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے میں ہاتھ کے چبائے جانے کا بھی اندیشہ تھا۔ محتاط انداز میں بولا، ''تم دوست بن کر آنا چاہتے ہو یا دُشمن؟''

ڈاکو کے حلق سے بہ مشکل تھمنے والا قہقہہ پھر اُبل پڑا۔

پروفیسر نے تلملا کر کہا، ''اپنا بولھی کتے جیسا منہ بند کرو اور سنجیدگی کے ساتھ بات کرو۔''

''عجیب آدمی ہو، خود احمقانہ سوال کرتے ہو اور مجھے احمق کہتے ہو۔ دُشمن بن کر آنے والا دروازے پر دستک نہیں دیتا۔ کیا تم اِتنی سی بات بھی نہیں سمجھتے ہو؟''

پروفیسر نے سر کھجایا۔ بولا، ''ہتھیار اپنے ساتھیوں کے حوالے کر دو۔ میں بوٹ بھیج رہا ہوں، اُس میں صرف تمہیں بیٹھنے کی اجازت ہوگی۔ کسی اور کو بیٹھاؤ گے تو اپنے ساتھ ساتھ اُسے بھی لے ڈوبو گے۔''

ڈاکو نے حامی بھر لی۔ پروفیسر مستعدی سے کچن سے باہر آیا۔ سٹور میں سے ریوالور اُٹھایا۔ چیمبر کھول کر گولیاں چیک کرتے ہوئے کنٹرول روم میں آیا۔ ریموٹ کنٹرولر تھاما اور بوٹ کے گیراج میں آ گیا۔ اُسے اسٹارٹ کیا، گیراج کو غیر مقفل کر کے بوٹ کو باہر نکالا اور ریموٹ کنٹرولر کے ذریعے جنت کے عقبی حصے کے پیچھے سے نکال کر کھلے پتن کی طرف بھیجنے لگا۔ افتخار بیگ نے بڑی مہارت سے بوٹ میں ریموٹ کنٹرول سسٹم نصب کیا تھا مگر اِس کے مکینزم میں ایک خامی رہ گئی تھی۔ بوٹ کی سپیڈ کم یا زیادہ نہیں ہوسکتی تھی۔ پروفیسر ریلنگ سے لگ کر کھڑا ہو گیا اور ایک مکعب فٹ کے ڈبے پر لگی ہوئی ناب اور ہینڈلنگ لیور کے ذریعے بوٹ کو مہارت سے آپریٹ کرنے لگا۔

پتن سے پندرہ فٹ کے فاصلے پر بوٹ رُک گئی۔ پروفیسر نے فون کی میموری میں ریسیوڈ کال کا نمبر نکالا، رابطہ کر کے بولا، ''تم نے اَبھی تک ہتھیار نہیں پھینکے؟''

''میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں۔ ایک خنجر میری پنڈلی کے ساتھ بندھا ہوا ہے، ڈرتے ہو تو اُسے بھی نکال پھینکتا ہوں۔'' ڈاکو نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

پروفیسر کوئی بھی خطرہ مول لینے پر آمادہ نہیں تھا۔ اُس کے اصرار پر جنت میں داخل ہونے کے مشتاق نے خنجر نکال کر اپنے دائیں ہاتھ پر واقع درختوں کے جھنڈ کی طرف اُچھال دیا۔ عین کنارے

پر کھڑا ہو کر ہاتھ لہرانے لگا۔ پروفیسر نے فون بند کیا۔ آپریٹنگ سسٹم پر توجہ دی۔ لیور کھینچ کر بوٹ کو پانی کے بہاؤ کی سمت چلاتا ہوٴا درختوں کے جھنڈ کے پاس بوٹ کی مخصوص جگہ پر لے گیا۔ بوٹ کے ساتھ ساتھ خشکی پر ڈاکو چلتا آیا۔

اُس کے بیٹھنے پر بوٹ پھر چل پڑی۔ چکر کاٹ کر جنت کی طرف بڑھنے لگی۔ بوٹ کے قریب پہنچنے پر وہ بھاگ کر بوٹ گیرج میں آ گیا۔ چند لمحوں بعد ڈاکو سیڑھیاں چڑھ کر اُس کے مدِ مقابل آن کھڑا ہوا۔ پروفیسر نے دیکھا کہ اُس کی آنکھیں فرطِ استعجاب سے پھٹنے کو آ گئی تھیں۔ جنت کا طائرانہ انداز میں جائزہ لینے کے بعد بولا، ''بہت حیران کن! قطعی طور پر ناقابلِ یقین! یوں لگتا ہے جیسے دِن کے اُجالے میں کھلی آنکھوں سے خواب دیکھ رہا ہوں۔''

پروفیسر بطور احتیاط اُسے نشانے میں رکھتے ہوئے بالکونی کی طرز پر باہر کو نکلے ہوئے حصے میں لے آیا۔ یہاں پلاسٹک کی دوضرب ساڑھے تین فٹ کی میز کے گرد چار کرسیاں نصب شدہ تھیں۔ ایک کرسی میں بیٹھا کر خود مقابل کی کرسی میں بیٹھ گیا۔ چند لمحوں میں ہی اُس کی گہری اور تیز نگاہوں نے بھانپ لیا تھا کہ آنے والے کے پاس کوئی اسلحہ نہیں تھا۔ وہ پینتیس چھتیس برس کا کڑیل جوان تھا۔ بڑی بڑی مونچھیں اور دہشت پھیلانے والی آنکھیں اُسے پیشہ وارانہ معاملات میں خاصی مدد دیتی تھیں۔ ڈھیلا ڈھالا مقامی لباس اور کندھے پر لمبا صافہ دیکھ کر اُس کے گریجویٹ تو درکنار، معمولی خواندہ ہونے کا یقین بھی جاتا رہتا تھا۔

''تمہارا نام کیا ہے جوان؟'' پروفیسر نے چند لمحوں کے توقف کے بعد تحیر آمیز آنکھوں سے اردگرد دیکھتے ہوئے ڈاکو سے پوچھا۔

''میرا نام شیر محمد ہے۔ دَمان کا رہنے والا ہوں اور نہائت وضع دار گرمانی بلوچ خاندان کی نجابت کا جنازہ کندھوں پر اُٹھائے کئی برسوں سے بیلے کی ویرانی میں چھپا بیٹھا ہوں۔ دُنیا مجھے شیرا گرمانی کے نام سے جانتی ہے اور اپنے بچوں کو اِسی نام سے ڈرا دُبکا کر سلاتی ہے۔''

پروفیسر کو حیرانی ہوئی۔ اس کے باوجود کہ وہ اصلاً سرائیکی تھا، بڑی روانی اور شستگی کے ساتھ اُردو بول رہا تھا۔

''تم کس کیلئے کام کرتے ہو؟''

''ہمیں رنڈی کی طرح ایک نہیں، کئی خصموں کا پہلو گرم کرنا پڑتا ہے۔ علاقے میں جتنے بھی خان یا سردار ہیں، بڑی اور چھوٹی اسمبلیوں کے رُکن ہیں، وہ ضرورت پڑنے پر ہماری خدمات حاصل کرتے ہیں۔ ہمارے منہ میں راتب ڈالتے ہیں، ہم اُن کے دُشمن لوگوں کے مونھوں سے زبان اور دانت کھینچ کر اُن کے قدموں میں ڈال دیتے ہیں۔'' شیرا گرمانی زہرخند لہجے میں بتلانے لگا۔

دو گھنٹے کے دورانیے پر مشتمل ملاقات فریقین کیلئے یادگار ثابت ہوئی۔ دونوں کے بیچ ایک خاموش معاہدہ طے پا گیا۔ پڑھے لکھے ڈاکو نے اجڈ اور جاہل ہونے کا ثبوت نہیں دیا تھا بلکہ تسلیم کرلیا تھا کہ اُنہیں پروفیسر کی ذات سے کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔ اُس نے چائے پینے کے بعد اُٹھ کر وفورِ عقیدت سے پروفیسر کے ہاتھ چومے، آنکھوں سے لگائے اور مؤدبانہ انداز میں کہا، ''آپ کو جب بھی میری یا میرے گروہ کی ضرورت محسوس ہو، بلاتکلف فون کر کے بلوا لیجئے۔ میں، شیرا گرمانی اور میرا گروہ، آپ پر اپنی جان نثار کرنے کیلئے ہر وقت تیار ملے گا۔''

پروفیسر نے مسکراتے ہوئے اُس کے جذبات کا خیر مقدم کیا اور اُسے بوٹ میں سوار ہونے میں مدد دی۔ اُسے کھلے پتن پر اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچانے کے بعد ریموٹ کنٹرول بوٹ واپس اپنی گیرج میں آ کر مقفل ہوگئی۔

پروفیسر نے ہاتھ ہلا کر اُنہیں رخصت کیا۔ ایسے میں اَشولال کی ایک شہرہ آفاق اُڈیل سرمست گنگناہٹ بن کر لاشعور سے امڈ پڑی۔

کیہڑا مت ڈیوے بے مَتیاں کوں
ڈینہہ چڑھدے دا کھِر کا چنگاں نئیں

(کون ناسمجھ کو سمجھائے کہ طلوع آفتاب کے بعد دودھ بلونا اچھا شگون نہیں ہوتا۔)

حبس انگیز ہوا میں دونوں باہنیں پھیلا کر ایڑیوں کے بَل گھومنے لگا۔ لہراتے بدن نے جھومر اوڑھ لی۔ سوئے آسمان نگاہ اُٹھی۔ کونجوں کی ایک ڈار جنوب سے شمال کی طرف اُڑی جا رہی تھی۔ مَن کو اُداس اور بے خود کرنے والی تھکن زدہ موسیقی فضا میں سرایت کرگئی۔ پروفیسر کا اَنگ انگ سرشاری

میں ٹوٹنے لگا۔ اُس کی تعمیر کی ہوئی جنت اپنے مناظر کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ ایک ایک کر کے سب لوٹ رہے تھے۔ شیرا گرمانی ہتھیار ڈال چکا تھا اور یہ امر پروفیسر کیلئے طمانیت بخش تھا کہ ایک بے سپر، بے خانماں مسافر مُہانے نے وسیب کے مہا گرمانیوں کو نیچا دکھا دیا تھا۔

وہ ساگر سے محبت کرتا تھا۔ محبت میں رقابت آپوں آپ پیدا ہو جاتی ہے۔ اَشو لال کی اُڈیل نے یاد دلا دیا کہ اُس کے الوہی عشق میں ایک رقیب پتھارا مار کر بیٹھا ہے۔ اُس نے فون کی میموری سے رقیب کا نمبر نکالا۔ کال ملائی۔ رابطہ ہوتے ہی فون کے سپیکر سے شہد ٹپکنے لگا، ''اوئے میڈا سئیں! کتھ وَداہیں جو تیڈے مویاں جیند یاں دِی خبراں وِی نئیں لبھد یاں؟''

(کہاں ہو کہ تمہاری زندگی موت کی خبریں بھی نہیں ملتیں؟)

پروفیسر کا سینہ فخر سے پھول گیا۔ اُس کا رقیب، دُنیا کا معروف شاعر اور دریائے سندھ کی مَرتی ہوئی ثقافت کے احیائے نو کا علمبردار دانش ور، اُس کے غیاب پر پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ بولا، ''مرشد! تمہارے سندھ ساگر کے کلیجے پر مونگ دل رہا ہوں۔''

اَشو لال نے قہقہہ لگایا۔ بولا ''مجھے افتخار بیگ نے بتلایا تھا جب تمہاری بنائی ہوئی جنت کے ایک ممکنہ مریض کیلئے ادویات لکھوانے کیلئے آیا تھا۔ میں نے اپنا حصہ ڈالتے ہوئے سچے رَب سائیں سے دُعا کی تھی کہ وہ تمہیں لمبی زندگی دے۔ سئیں! کمال ہمیشہ باکمال لوگ دکھاتے ہیں۔ تم بھی دکھا چکے ہو۔ میری طرف سے مبارکباد قبول کرو۔''

''مرشد! وقت نکال کر میری جنت کو دیکھنے کیلئے کبھی آ نکلو۔ تم نے سندھ پر لکھ لکھ کر انگلیوں کے اعصاب کمزور کر لیے ہیں مگر سچی محبت کی طرف ایک بھی عملی قدم نہیں رکھا۔ مجھے دیکھو، میں اپنی اصل کی طرف لوٹ آیا ہوں۔ تمہاری ظالم دُنیا کی یاترا نے مجھ پر لگے ہوئے لیبل ......مہانہ......کو نوچ پھینکا تھا۔ یہاں مجھے کوئی بھی اندیشہ لاحق نہیں، اِس لئے میں نے وہ لیبل پھر اپنے ماتھے پر چپکا دیا ہے۔''

اَشو لال سندھو وادی کی ماء بولی سرائیکی کا علمبردار تھا، اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اُردو یا انگریزی بولتے بولتے سرائیکی میں کود پڑتا تھا۔ فرطِ جوش سے بولا، ''سئیں! مُہانیاں کوں رول نہ

گھت ،توں جانداایں جو میں ملکدیاں دِی گالھ کرن آلا فقیر ہاں......''

(مہمانوں کو بےتوقیر مت کرو،تم جانتے ہوکہ میں صفحۂ قرطاس سے مٹتے ہوؤں کا شبدکار ہوں)۔

پروفیسر ہنسا۔وہ دل کی گہرائیوں سے اپنے رقیب کو چاہتا تھا۔اُس کی عظمت کے سامنے سر جھکا لیتا تھا۔دُنیا میں اگر اُس کے محبوب کی طرفداری کرنے والا کوئی تھا تو وہ اَشو ہی تھا۔اِس دھرتی نے جسے بھی اپنی ہتھیلیوں کے بَل پر اوپر اُٹھایا، وہ عروج پا کر گم ہو گیا۔پلٹ کر سندھ وادی کی خبر لینے نہیں آیا۔ایسے میں اَشو لال ہی ایسا تھا جو ساگر کے کٹے پھٹے اور درماندہ نیلی لکیر جیسے بدن سے چمٹا غم گساری کر رہا تھا۔

وہ محکمہ صحت میں اعلیٰ انتظامی پوسٹ پر فائز تھا۔چاہتا تو لاکھوں روپے ماہوار کما کر تاجروں اور جاگیرداروں کے قافلے میں شامل ہو جاتا مگر وہ سندھو کا سچا عاشق تھا۔عاشق کو دام سے نہیں، دِل سے واسطہ ہوتا ہے۔اُسے ملنے والی چالیس پچاس ہزار روپے کی ماہوار تنخواہ بھی انسانوں کے دل کا درد بانٹنے پر صرف ہو جاتی تھی۔

اپنے رقیب سے پروفیسر کو صرف ایک ہی اختلاف تھا۔وہ کہتا تھا،''دُنیا اِس قابل نہیں کہ اِس میں رہا جائے،اِسے ٹھکرا دینا چاہیے،اِس پر تنہائی کو فوقیت دے کر حوصلہ شکنی کرنی چاہیے۔''

اَشو لال کہتا،''تم غلط انداز سے سوچتے ہو۔انسان،انسان کیلئے تخلیق کیا گیا ہے نہ کہ پہاڑوں اور دریا سمندروں کیلئے۔کمرہ امتحان میں بیٹھ کر خاموش اور خالی پرچہ دینے سے نتیجے کے دِن دل کو سچی خوشی نصیب نہیں ہوتی۔''

آج بھی فون پر اُسے سمجھا رہا تھا،''پروفیسر!تم واقعی دلیر نکلے۔تم نے جہنم میں رہتے ہوئے اپنی چھوٹی سی جنت بنا لی مگر میری مانو تو اِس جنت کو دُنیا کی بصارت پر کھول دو۔لوگوں کو بلا کر دکھاؤ اور اُن پر ثابت کرو کہ انسانوں کے رویوں سے دلبرداشتگی نے تنہائی کا لحاف اوڑھ کر عافیت ڈھونڈ نکالی ہے۔اُنہیں عملی طور پر طعنہ دو کہ اُن کے ترقی یافتہ تمدن سے دریا کی حبس آلود فضا میں آکسیجن کی مقدار کہیں زیادہ ہے۔وہ کاربن آلود فضا میں سانسیں لینے کے عادی ہیں،اُنہیں فطرت کی پاکیزگی کا ادراک دینا ضروری ہے۔تم اُن پر یہ فرق واضح کر سکتے ہو۔''

وہ منہ بنا کر بولا، ''مرشد! اُن کے پھیپھڑوں میں آکسیجن بھرتے ہوئے میں خودنفرت کی گھٹن میں دم کھوبیٹھوں گا۔تم یہ نصیحت اپنے پاس رکھو۔ٹھکرانے والوں کیلئے شب وروز خودکو ہلکان کرتے رہو، مجھے کوئی شوق نہیں ہے۔''

اَشولال حسب عادت مسکرا دیا۔رُخ بدل کر سمجھانے لگا، ''تم کیا یہ سمجھ بیٹھے ہو کہ تمہاری کشتی تمہاری جنت ہے؟نہیں سئیں......غلط سمجھے ہو۔یہ دریا، پاکیزہ اور باوضوفضا، اپنی اپنی نسل کے آخری پکھوؤں کی دم توڑتی چہکاریں، ساگر کے پھیپھڑوں سے نکلنے والی دل آویز بھاپ...... یہ جنت کے عضو ہیں، تمہارا ائرکنڈیشنڈ بیڈروم جنت نہیں ہے۔تم نے منافقت کی نئی رسم ایجاد کی ہے۔اگر اپنی دھن میں سچے ہوتے تو کبھی دُنیا کی الائشیں اپنے ہمراہ لے کر جنت میں نہ جاتے۔تم دو کشتیوں میں پیر رکھے کھڑے ہواور بضد ہو کہ تمہیں راستی قرار دیا جائے......کیسے ممکن ہے؟''

''الائشیں؟ میں سمجھا نہیں......'' پروفیسر نے تعجب سے پوچھا۔

''تم نے اپنے پاس ہر وہ چیز خرید کر رکھی ہوئی ہے جو ساگر کے باسیوں کی آنے والی چار پانچ نسلوں کی دسترس سے بھی باہر ہوں گی۔خوراک کو محفوظ رکھنے کیلئے فریج خریدتے ہوئے تم نے یہ نہیں سوچا ہوگا کہ ساگر کے تَل میں کبھی کوئی مچھلی خراب نہیں ہوئی۔ جب بھی پکڑ کر کھاؤ، تازہ ہوتی ہے۔ انٹرنیٹ اور سیٹلائٹ ریسیور دُنیا کی ہنگامہ خیزی اور بھاگ دوڑ کو دیکھنے کیلئے رکھے بیٹھے ہو۔کیوں؟''

''مرشد! طعنے نہ دو۔میں دیکھ رہا ہوں کہ تم ساگر سے میری محبت کا جنون دیکھ کر جیلس ہو رہے ہو۔وقت نکال کر یہاں چلے آؤ، میرا مقدمہ سمجھنے میں آسانی رہے گی۔'' وہ چھیڑتے ہوئے بولا۔

اَشولال کے لہجے میں گہری یاس بھر گئی۔تھکی تھکی سی آواز میں بولا، ''جو بھی سندھ ساگر سے محبت کا دعویٰ رکھے، وہ میری پلکوں پر بیٹھنے کا اہل ٹھہرتا ہے۔تم بھی۔ایسا کرو کہ 'کاں وَسوں داپکھی اے' کے صفحہ نمبر ترانوے کو پڑھو اور اپنے مقدمے پر غور کرو۔''

پروفیسر کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ تیر گئی۔قدرے بلند آواز میں ترنم کے ساتھ گنگنانے لگا، ''ناں اَپنے دی ہر شکل وِچوں، اَساں رَب دی شکل وِساری نئیں......مُرشد! تم جس ڈُوجھے جھلارے کی بات کر رہے ہو اُسے پڑھنے کیلئے تمہاری کتاب کھولنے کی ضرورت نہیں، وہ میرے ذہن میں

بچپن کی کھوئی ہوئی خوشی کی طرح نقش ہے۔تم بہت عظیم ہومگر تمہیں ملنے والے عظیم نہیں ہیں۔تم جن کیلئے صبح شام دل جلاتے رہتے ہو، وہ تمہارا دل جلاتے ہوئے کسی دُکھ کا شکار نہیں ہوتے۔تمہیں دِل سے کہتا ہوں کہ بدل جاؤ، یہ زمانہ بدلنے والا ہرگز نہیں ہے۔''

اَشولال خاموش رہا۔ کچھ توقف کے بعد معذرت خواہانہ لہجے میں بولا،''میری صدارت میں تحصیل کے تمام میڈیکل آفیسرز کی ایک میٹنگ شروع ہونے والی ہے۔ مجھے بلایا جارہا ہے۔ باتوں کا سلسلہ جہاں سے ٹوٹ رہا ہے، وہیں سے جوڑنے کیلئے شام کو اپنے کلینک میں بیٹھ کر فون کروں گا۔ سوہنا رَب سائیں تیکوں موئی ماءدِی جھولی کڈاہیں وِسرن ناں ڈیوے!''(سوہنا رَب تمہیں تمہاری مرجانے والی ماں کی گود یاددلاتا رہے)۔

رابطہ منقطع ہوگیا۔ پروفیسر سوچنے لگا۔ اِن الفاظ میں اَشولال کے علاوہ دُنیا کا کوئی شخص کسی رقیب کیلئے دعا گو نہیں ہوسکتا تھا۔

...❀...

سکول سے واپسی پر یونیفارم اُتارے بغیر دونوں قسمت کے کمرے میں قالین پر بیٹھ کر گڈا گڈی کھیلنے لگے۔قسمت چہک رہی تھی،''سنو ہنس! فینی مدھو کی طرف دیکھ کر مسکراتی رہتی ہے۔''

''تمہیں کیسے پتہ چلا؟'' ہنس نے شرٹ کو کھینچ کر پینٹ سے نکالا اور بیلٹ ڈھیلا کرکے قالین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔قسمت نے خبر ہی ایسی سنائی تھی۔

''میں نے چوری چوری دیکھا ہے۔''

''اور فینی کا کزن؟''

''وہ بے چارہ پریشان ہے۔ کافی دِنوں سے کچھ کھا پی نہیں رہا۔فینی کے آگے پیچھے پھرتا ہے۔تم نے کل شام کو پی ٹی وی پر ڈراما دیکھا تھا؟''

''ہاں۔دیکھا تھا۔پھر؟'' ہنس کا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا۔

''بڑے بالوں والی عورت ہیرو سے ملتی ہے اور اُس کا کزن کھانا پینا بند کردیتا ہے۔ یاد ہے

ناں؟''

''یاد ہے۔تو کیا فینی کا کزن بھی ویسے ہی بال بڑھالیتا ہے؟''

''تو اور کیا؟''فینی نے آنکھیں پوری کی پوری کھول دیں،''ہم فینی اور مدھو کی شادی بڑی دھوم دھام سے کریں گے۔پوڈو کو بھی بلائیں گے۔ٹھیک ہے ناں!''

ہنس نے منہ بنایا،''نہیں۔پوڈو اچھا آدمی نہیں ہے۔''

''کیا بُرائی ہے اُس میں؟''وہ نچلا ہونٹ اوپر والے ہونٹ پر چڑھا کر تعجب سے پوچھنے لگی۔

''وہ فینی،تتلی،ٹک ٹک اور باگی سے باتیں نہیں کرتا۔مجھے بڑا بُرا لگتا ہے۔''ہنس نے فینی کے ریشمی بالوں کو پیار سے چھوتے ہوئے کہا،''ٹک ٹک کتنی پیاری ہے اور باگی کو دیکھو...... ہر روز کہتی ہے کہ مجھے کشتی پر لے چلو۔وہ کمینہ کشتی میں کسی کو گھسنے ہی نہیں دیتا۔''

''اُسے کمینہ تو نہ کہو!''قسمت نے لجا کر کہا۔

''تو اور کیا کہوں؟''وہ اکڑ گیا۔

''وہ تو ہمارا پوڈو ہے،کمینہ تو نہیں ناں!''

...⊛...

مصباح کی موجودگی میں وجدان اپنے پھوپھی زاد افتخار بیگ سے جھگڑ رہا تھا۔کہہ رہا تھا،''بھائی! تم نے ایک ایسے فضول انسان کیلئے اپنے شب و روز تج دیے جو تمہارے کہنے پر مجھے اپنا دریائی بیڑہ دکھانے پر تیار نہیں ہے۔یا تو تم اُسے سنجیدگی سے کہتے ہی نہیں ہو،یا وہ تمہاری بات کو اہمیت ہی نہیں دیتا۔ہاہ! پروفیسر صاحب بہت اچھے انسان ہیں۔''

اُس نے منہ بنا کر افتخار کی نقل اُتاری۔

افتخار بجائے چڑنے کے،مسکرانے لگا۔بولا،''تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟ اگر اُسے یوں خود اور اپنی بنائی ہوئی جنت کو نگار خانہ ہی بنانا ہوتا تو وہ انسانوں کو ہمیشہ کیلئے خیر باد کیوں کہتا؟ پلیز وجدان! میں پروفیسر کا دل سے احترام کرتا ہوں،میں نہیں چاہتا کہ وہ میرے احسانات پر بلیک میل

ہوجائے اور مجبوراً تمہیں جنت میں آنے کا پرمٹ دے۔''

مصباح نے اُن کی لڑائی میں دخل دیتے ہوئے افتخار کو مخاطب کیا،''بھائی! کیا وہ بیڑہ واقعی جنت کو مدنظر رکھ کر بنایا گیا ہے؟''

وجدان نے غصے میں کہا،''جنت کو نہیں، جہنم کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ اُس میں سوائے عیاشی کے سامان کے، کچھ بھی نہیں ہے۔''

''تم شاید بھول رہے ہو وجدان!'' افتخار بیگ نے کہا،''اُس میں سب کچھ ہے مگر عیاشی کا سامان نہیں ہے۔''

اُس نے مصباح کی موجودگی کے باعث کھل کر بات نہیں کی تھی مگر وجدان سمجھ گیا اور بُرے بُرے منہ بنا کر خاموش ہو گیا۔

بار ہا مرتبہ وجدان اور افتخار بیگ کی نوک جھونک دیکھ چکی تھی۔ پروفیسر وسیم بزدار کی بنائی ہوئی غیر روائتی جنت کو دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہو گیا تھا مگر جب یہ دیکھتی کہ افتخار کی سفارش کے باوجود وجدان کو جنت کو دیکھنے کی اجازت نہیں ملتی تھی تو منہ بسور کر بیٹھ جاتی۔ وجدان کے موبائل پر کسی دوست کا فون آیا۔ فون سن کر وجدان نے دونوں سے معذرت چاہی اور اُٹھ گیا۔ غالباً اُس کے دوست نے اُسے اپنے پاس بلایا تھا۔

اُس کے جانے کے بعد افتخار نے تاسف سے کہا،''میں بھی چاہتا ہوں کہ اور کسی کو نہیں تو کم از کم وجدان اور تمہیں وہاں لے کر جاؤں اور اپنی انجینئرنگ کا کمال دکھاؤں مگر پروفیسر صاحب نہیں مانتے۔ میں نے ایک بار کہا تھا کہ مجھے وڈیو بنانے کی اجازت دے دیں، کہنے لگے کہ اگر اپنے احسانات کی قیمت مانگتے ہو تو جو جی میں آئے کر گزرو ورنہ میری جنت کی تشہیر مت کرو۔''

وہ بولی،''کیا واقعی وہ غیر معمولی کارنامہ ہے؟''

وہ مسکرایا۔ اپنے منہ میاں مٹھو بننا پسند نہیں کرتا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ اپنے کارنامے کو بڑھا چڑھا کر اپنی محبوبہ کے سامنے عیاں کرے۔ اُس کے چہرے پر ایک دھڑکن تھامنے والی ادا کی صورت میں ٹھہر جانے والے تحیر کو ملاحظہ کرے۔ تذبذب آمیز لہجے میں بولا،''مصباح! پروفیسر کی جنت کے بارے

میں فقط اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میرے دل کی سب سے بڑی خواہش ہے کہ میں تمہیں لے کر وہاں جاؤں اور پورا ایک مہینہ وہاں رہ کر ہنی مون مناؤں۔''

حیا کا ایک رنگ مصباح کے چہرے پر لہرا گیا۔ چہرہ سرخ ہو گیا۔ سرخی نے شرم کے ساتھ ساتھ برہمی کو تھام لیا۔ خفا ہو کر بولی، ''اپنی بہن کے ساتھ؟''

وہ سن ہو گیا۔ بات بنانے کو بولا، ''تم میری بہن نہیں، کزن ہو۔''

اُس نے تاویل کو قبول نہیں کیا۔ منہ بنا کر بولی، ''بھائی! تم ایسی باتیں کیوں کرتے ہو؟ کیا میں تمہیں ایسی دکھائی دیتی ہوں جو تمہاری تہذیب سے گری ہوئی باتوں کو بھی پسند کروں گی؟''

افتخار بیگ کا سر ندامت سے جھک گیا۔ تھکی تھکی آواز میں بولا، ''ویری ساری مصباح! نہ جانے کیوں میں ایسا ہو جاتا ہوں۔ کوشش کروں گا کہ آئندہ اپنی محبت کو خود تک محدود رکھوں۔ اگر کبھی اختیار نہ بھی رہا تو تمہارے پاس سے اُٹھ کر دور جا کر کھڑا ہو جاؤں گا۔''

مصباح کو اُس کے ردِ عمل پر دُکھ سا ہوا۔ سوچنے لگی کہ اُسے اتنی بے رخی سے اپنے کزن کو نہیں جھٹکنا چاہیے تھا۔ ہر محبت کرنے والا بہت قیمتی اور زود حس ہوتا ہے۔

سر جھکائے ناخنوں سے کھیلتی رہی۔ افتخار کو وہاں بیٹھے رہنا مشکل دکھائی دے رہا تھا۔ اجازت لے کر اُٹھ گیا۔ دروازے میں پہنچا تھا کہ عقب سے مصباح نے پکار کر روک لیا۔ بولی، ''بھائی! مجھے معافی دے دو۔ نہ جانے کیوں میں ہر وہ بات تمہارے ساتھ کر لیتی ہوں، جو دُنیا میں کسی کے ساتھ نہیں کر سکتی۔''

وہ جہاں کا تہاں رہ گیا۔ پلٹے بغیر دل ہی دل میں تعین کرنے لگا کہ وہ اظہارِ محبت کر رہی ہے یا اپنے مخصوص انداز میں کچھ سوچے سمجھے بغیر محض معافی مانگ کر بہلا رہی ہے۔ دونوں صورتوں میں ہی دل سے تضحیک کا بار اترتا دکھائی دیا تو وہ گردن موڑ کر پھیکے رُو مسکرایا۔ بولا، ''تھینک یو مائی کزن!''

جانے والا چلا گیا۔ آنے والا تصور کے پردے پر براجمان ہو گیا۔ شہاب کی وجاہت سے متاثر ہوئی تھی، اُس کی شائستگی پر مطمئن ہوئی تھی، تبھی اُس کے بارے میں اپنی مکمل اور غیر مکمل تنہائی میں سوچتی رہتی۔ بے دھیانی میں افتخار اور شہاب کا موازنہ کرتی رہتی۔ اگر خونی رشتے کی اضافت کو خارج

کر دیا جاتا تو بلاشبہ شہاب کی شخصیت افتخار پر بھاری پڑتی دکھائی دیتی تھی۔

شام کو اُس کی دوست روزینہ ملنے کیلئے آئی۔ اُس کا چہرہ دیکھ کر ہی پتہ چلتا تھا کہ اُس کے پاس کوئی خاص خبر ہے جسے بتلانے کیلئے بہت بے چین ہے۔

مصباح نے پوچھا، ''ڈارلنگ! ایسا کیا ہے جس نے تمہارے چہرے پر سات رنگ بکھیر دیے ہیں؟''

اُس نے مسکرا کر آنکھ سے اشارہ کیا کہ تنہائی میں سنائی جانے والی خبر ہے۔ دونوں بیڈروم میں آئیں۔ روزینہ نے گلے میں بانہیں ڈال کر پیار کیا، چھیڑتے ہوئے بولی، ''میری جان! تم بڑی خوش قسمت ہو۔ یہی وہ خبر ہے جسے تمہارے گوش گزار نے کیلئے میں اِس وقت دوڑی چلی آئی ہوں۔''

وہ مصنوعی خفگی سے بولی، ''کیا تم نے کسی نجومی سے پوچھا ہے؟''

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ خوشی جوانی کے انگ انگ سے امڈ رہی تھی۔ مصباح نے بے چینی سے پوچھا، ''تو بتلاتی کیوں نہیں؟ کیا بھری دُنیا میں کسی نے تمہیں پسند کرنے کی حماقت کر لی ہے جو یوں باؤلی ہو رہی ہو؟''

روزینہ نے نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دَبایا۔ یوں کہ جیسے مسکراہٹ کو دَبا کر چھپانا چاہتی ہو۔ سیدھے ہاتھ کی شہادت انگلی کی اگلی پور کو مصباح کی روئی کے پھوئے جیسے رُخسار پر پھیرا۔ انگلی گالوں میں ہنستے وقت پڑنے والے گڑھوں میں سے ایک کے مقام پر آ کر رُک گئی۔ روزینہ بولی، ''ہائے مصباح! تم ہنستی ہوئی کتنی اچھی لگتی ہو۔ دُنیا اپنی خوشیاں قربان کرنے کیلئے تمہاری مسکراہٹ کا انتظار کرتی رہتی ہے۔''

تعریف کے بَل پر لبوں نے تھوڑا سا پھیل کر دونوں ڈمپل عیاں کر دیے۔ حسن کے قمقمے روشن ہو گئے۔ انگلی کی اگلی پور نے ننھے سے گڑھے کی تمام تر لطافت کو جذب کر کے روزینہ کے من میں اُتار دیا۔ وارفتہ نگاہوں سے دیکھتی ہوئی بولی، ''مصباح! سچ بتاؤ، کیا تم جانتی ہو کہ شہاب کون ہے؟''

وہ چونک گئی۔ پیشانی کو شکن آلود کرتے ہوئے بولی، ''وہی تو ہے جو اُس دِن ہمیں ہسپتال میں لے کر گیا تھا...... کار والا!''

''افوہ بھئی! کس بے وقوف سے پالا پڑ گیا ہے۔ یہ تو میں بھی جانتی ہوں۔ میں پوچھ رہی ہوں کہ وہ کون ہے، کیا کرتا ہے، کہاں رہتا ہے؟''

''تم اور فرح تمام وقت میرے ساتھ موجود رہی تھیں۔ کیا اُس نے مجھے بتلایا تھا؟''

''اُس وقت تو نہیں بتایا تھا۔''

''پھر کیا اُس نے وعدہ کیا تھا کہ مجھے خط کے ذریعے اپنی سی وی بھیجے گا؟'' اُس کا مصنوعی غصہ پورے عروج پر تھا۔

''نہیں تو......'' روزینہ بھی مزہ لینے بیٹھ گئی۔

''کیا ای میل کے ذریعے مجھے بتاتا؟''

''اتنی معصوم مت بنو مصباح!'' روزینہ نے اچانک اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ پیار سے پوچھنے لگی، ''کیا اُس نے تمہیں فون نہیں کیا؟''

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ انکار کرنے میں اندیشہ تھا کہ کہیں شہاب نے اُسے مل کر بتلا نہ دیا ہو۔ اقرار کرنے کی صورت میں جھوٹ کے پکڑے جانے پر ندامت ہوتی۔ چکر دے گئی، ''کیا یہ طے تھا؟''

''بڑی بے ایمان ہو!'' روزینہ نے ہنس کر کہا۔

''کیا وہ تمہاری نظروں میں اتنا اہم واقع ہوا ہے کہ ہم اپنی ملاقات کو اُس کے تذکرے پر ضائع کر دیں؟'' مصباح نے موضوع کو بدلنے کی اپنی سی کوشش کی۔

''ہاں! وہ کافی پر کشش انسان ہے۔''

''تم کہتی ہو تو ہوگا مگر مجھے کیا؟'' مصباح نے جان چھڑانا چاہی۔

''بہرحال! میرے پاس شہاب کے بارے میں بہت سی کارآمد معلومات ہیں۔ تمہیں جب اُس سے کوئی غرض ہی نہیں تو بتلانے کا کیا فائدہ...... وہ بھی اُن بیسیوں لڑکوں میں سے ایک ہے جو تمہیں دیکھ کر مچلتے ہیں، ایک بار مل کر مسکراتے ہیں پھر واپسی کی راہ پر سر جھکائے چلے جاتے ہیں۔''

مصباح نے بے بسی سے سر کھجایا۔ بات بناتے ہوئے بولی، ''مگر یہ اُن لڑکوں سے تھوڑا مختلف ثابت ہوا ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''اُس نے فون پر محبت کا اظہار کرنے کی جرأت کر لی ہے۔''

''پھر؟''

''پھر کیا؟ میں نے فون بند کر دیا۔''

''کیوں؟''

''تو اور کیا کہتی اُس کی فضول باتوں کے جواب میں؟''

''ایسے بندے سے جان چھڑانے کیلئے ایک آسان اور نہائت گھسا پٹا جملہ محبت کی لغت میں موجود ہے۔''

''کون سا؟''

''آئی لو یو!'' روزینہ نے آنکھیں نچا کر کہا۔

مصباح نے اُسے دھکا دے کر بیڈ پر گرا دیا اور گلا دباتے ہوئے چیخی، ''میں تمہارا خون پی جاؤں گی بدتمیز!''

''مجھے چھوڑو، اُس کا جا کر خون پیو یا دل جلاؤ جو تمہیں فون کرتا ہے۔ جو تمہارے لئے کالج کے گیٹ پر دھوپ سینکنے کیلئے تین چار دنوں سے متواتر آ رہا ہے۔'' روزینہ نے مسکراتے ہوئے واویلا مچایا۔

''تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ وہ میرے لئے وہاں آتا ہے؟''

''سچ کہوں؟''

''کہو!''

''پچھلے سال امتحان میں کامیابی کی مبارکباد دیتے ہوئے میں نے تمہارے گال کو چوما تھا۔ میری بدقسمتی کہ عین اُسی جگہ پر چند دن بعد ایک پمپل نکل آیا۔ ہائے! قربان جاؤں اُس بوسے پر کہ کبھی بھولتا ہی نہیں۔ ہائے! تُف ہو اُس پابندی پر جو تم نے مجھ پر ہمیشہ کیلئے عائد کر دی۔ میں کہ ایک عورت، آج تک اُس لمس کو بھول نہیں پائی۔ وہ کہ ایک جوان مرد، تمہارے لمس کو زندگی بھر کیسے بھلا

پائے گا؟'' روزینہ نے کہا۔

وہ اُسے مارنے کیلئے جھپٹی۔ روزینہ بڑی عجیب نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ اُٹھا ہوُا ہاتھ رُک گیا۔ شرما کر گلنار ہوگئی اور اُس سے لپٹ کر بیڈ پر گرگئی۔ سانسوں کی بڑھتی گھٹتی مالا پر پیا کا نام سمرنے لگی۔ روزینہ اُس کی کاکلوں سے کھیلتے ہوئے بتلانے لگی، ''فرسٹ ائر میں ایک لڑکی پڑھتی ہے، شمسہ۔ اُس کی شکل میں شہاب سے غیر معمولی مشابہت دیکھ کر میں نے اُس سے پوچھ ہی لیا کہ وہ شہاب کی کیا لگتی ہے۔ پتہ چلا کہ وہ شہاب کے سگے چچا کی بیٹی ہے، شہاب کے گھر میں ہی رہتی ہے کیونکہ اُس کا اپنا گھر گاؤں میں ہے جو یہاں سے تیس چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ وہاں سے روزانہ آنے جانے میں خاصا وقت ضائع ہوتا ہے۔''

منہ چھپائے اپنی دھڑکن پر قابو پاتی مصباح نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا، ''رُک کیوں گئی ہو؟ بولتی رہو، اچھا لگ رہا ہے۔''

''اپنا ڈسٹرکٹ ناظم ہے ناں، سردار اَرباب خان! جانتی ہو ناں؟''

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی، ''نہیں تو......''

''نام تو سنا ہی ہوگا ناں؟''

اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔

روزینہ بولی، ''شہاب اُسی کا بیٹا ہے۔''

مصباح ایک جھٹکے کے ساتھ اُٹھ بیٹھی۔ پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ حیرت سے بولی، ''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

''کیا مطلب؟ کیا ملکی قوانین کی رُو سے کوئی ضلعی ناظم بیٹا پیدا نہیں کرسکتا؟''

وہ شرمسار سی ہوگئی، بولی، ''نہیں نہیں......میرا کہنے کا مطلب یہ نہیں تھا۔ دیکھنے میں تو وہ......''

روزینہ نے بات کاٹ دی۔ اُس کے گال پر پیار سے چٹکی کاٹ کر بولی، ''دیکھنے میں تو تم بھی کسی ملک کی شہزادی لگتی ہو۔ بعض اوقات آنکھیں بھی جھوٹ بولنے لگتی ہیں۔ اَب ڈراما بازی بند کرو اور دھیان سے اپنے شہاب کے بارے میں سنو۔''

بظاہر لا پرواہی اور عدم توجہگی ظاہر کرتی ہوئی مصباح روزینہ کا ایک ایک حرف دِل میں اُتار رہی تھی۔

...❁...

آج قسمت نسبتاً جلدی پلاٹ میں آ گئی۔ زور زور سے ہنس کو آوازیں دیتے ہوئے کہنے لگی، ''آتے ہوئے اپنی وہ والی کار لیتے آنا جو تمہارے بابا نے تمہیں کل بازار سے لاکر دی تھی۔''

وہ جلدی سے باہر آیا۔ کوارٹر کے مین گیٹ پر بنے چھجے تلے کھڑے ہو کر چیخ کر بولا، ''اُس کا کیا کرنا ہے؟''

''فینی کا کزن اپنے دوست ٹونی کے ساتھ کشتی دیکھنے کیلئے آنا چاہتا ہے۔ اَب پیدل تو نہیں آ سکتا ناں!'' قسمت نے ہاتھوں کا بھونپو بنا کر کہا۔

ہنس، ''اچھا'' کہہ کر پھر گھر میں گھس گیا۔ ماما نے اُس کیلئے کسٹرڈ بنا رکھا تھا۔ پلیٹ میں ڈال دیا۔ اُس نے دو چمچ اُٹھا کر کسٹرڈ میں گاڑے اور کار اُٹھا کر بھاگتا ہوُا قسمت کے پاس آ گیا۔ بولا'' ماما نے کسٹرڈ بنائی ہے۔ آ ؤ مل کر کھاتے ہیں۔''

''وہ فینی کا کزن......''

''ماما کہتی ہیں کہ پہلا پیٹ پوجا، پھر کام دوجا......'' ہنس نے کسٹرڈ کا بھرا چمچ اُس کے منہ میں ڈال دیا۔ وہ شرما کر بولی، ''تم نے رات والی قسط دیکھی تھی؟ میں نے دیکھی تھی۔ زینب کے منہ میں ارسلان نے ایسے ہی چمچ ڈالا تھا۔ پتہ ہے، پھر کیا ہوا؟''

ہنس نے معصومیت سے نفی میں سر ہلایا۔

''پھر زینب نے بھی اپنا چمچ اُس کے منہ میں ڈال دیا۔'' قسمت نے ہنستے ہوئے کہا اور ہاتھ میں تھاما ہوُا چمچ اُس کے منہ میں ڈال دیا۔ کسٹرڈ ختم ہو گیا تو قسمت نے فینی کے کزن اور ٹونی کو کار پر سوار کیا اور پوڈو کی طرف روانہ کر دیا۔ ہنس نے پوچھا، ''کیا انہیں پوڈو کچھ نہیں کہے گا؟''

قسمت نے نفی میں سر ہلایا۔

''کیوں؟''

''یہ میں نہیں بتاؤں گی۔'' قسمت نے کہا۔ چند لمحوں کے بعد ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے خوشی سے اچھل پڑی، ''دیکھو ہنس! تینوں کتنے مزے سے باتیں کر رہے ہیں اور پوڈو کو دیکھو، کیسے ہنس ہنس کر دوہرا ہوا جا رہا ہے۔''

''بابا کہتے ہیں کہ زیادہ ہنسنے والے بے وقوف ہوتے ہیں۔''

''اِسی لئے تو میں بہت کم ہنستی ہوں۔''

''نہیں۔ میں کم ہنستا ہوں، تم ہر وقت کھی کھی کرتی رہتی ہو۔''

''ہنس! میں تمہیں ماروں گی۔''

''تم مجھے نہیں مارو گی کیونکہ تم میری قسمت ہو۔ یاد ہے، تم نے ہی تو مجھے کہا تھا۔ میں نے کبھی تم پر ہاتھ اُٹھایا ہے؟''

''تم بہت اچھے ہو ہنس!''

''ہم دونوں بہت اچھے ہیں کیونکہ ہم اکٹھے کھیلتے ہیں مگر لڑتے جھگڑتے نہیں ہیں۔'' ہنس نے پیار بھرے انداز میں اُس کی گردن پر بانہہ رکھتے ہوئے کہا۔ قسمت اُس کے بہت ہی قریب آ گئی۔

...⊛...

سلور گرے کلر کی نسان سنی کارپتن پر رُکی۔ پروفیسر نے ناگوار نظروں سے دیکھا۔ پینٹ شرٹس میں ملبوس دو آدمی باہر نکلے۔ پروفیسر کی آنکھیں پہچان نہ سکیں۔ دوربین نکال کر آنکھوں سے لگائی۔ دیکھا تو ناگواری کے جذبات پر اَوس پڑنے لگی۔ دل خوش ہو گیا۔ افتخار بیگ اپنے الیکٹریکل انجینئر دوست مظہر عباس کے ساتھ ڈوبتے سورج کی طرف منہ کر کے کھڑا تھا۔ دونوں پروفیسر کو دیکھ کر ہاتھ لہرانے لگے۔

اُس نے بھی جواباً پرجوش انداز میں ہاتھ لہرایا۔ بوٹ کو پتن کی طرف بھیج دیا۔ افتخار نے بوٹ میں بیٹھتے ہی کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پروفیسر کو ہاتھ سے ریموٹ کنٹرولر بند کرنے کا اشارہ دیا۔

پروفیسر نے مسکراتے ہوئے سرخ بٹن پش کر دیا۔ ریموٹ کنٹرولر جب تک آن رہتا تھا، بوٹ کو اپنی مرضی سے حرکت نہیں دی جا سکتی تھی۔

دونوں جوانوں کا پرتپاک استقبال کرنے کے بعد پروفیسر اُنہیں لے کر بالکونی نما گگر پر آ گیا۔ افتخار بیگ نے دریافت کیا، ''کہیے سر! کیا آپ کا شوق پورا ہو گیا یا کہیں سقم رہ گیا؟''

پروفیسر نے پُرستائش نظروں سے دونوں کو باری باری دیکھا اور مسکرا کر کہا، ''آئی لو یو مائی سنز...... تمہاری جوانی نے میرے بڑھاپے کو خواب کی بھرپور تکمیل دے کر جوان کر دیا ہے۔''

مظہر عباس نے کہا، ''مجھے اپنے کام کی انفرادی ستائش درکار ہے سر!''

پروفیسر نے جاندار قہقہہ لگایا اور پلٹ کر کچن کی طرف بڑھ گیا۔ دونوں اُس کی اجازت سے جنت کا معائنہ کرنے لگے۔ اپنے نصب شدہ مکینزم کو آلات کے ذریعے چیک کرنے لگے۔

چائے پینے کے دوران خاموشی طاری رہی۔ پھر تینوں نے ڈھلتی شام کے اُداس منظر کو اپنی تشنہ آنکھوں میں سموتے ہوئے ڈھیر ساری باتیں کیں۔ تینوں نے مل کر کھانا تیار کیا۔ چونکہ دونوں جنت میں رات گزارنے کے ارادے سے آئے تھے، اِس لئے وہ کسی بھی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کر رہے تھے۔ افتخار بیگ اپنی نئی گاڑی کی طرف سے متفکر تھا۔ پروفیسر نے چھیڑتے ہوئے کہا، ''دیکھا افتخار! دُنیا کتنی بے امن اور منتشر المزاج ہے۔ جو گاڑی تمہیں سفر کی راحت دینے، تمہیں دھوپ، گرمی اور سردی سے بچانے کیلئے بنائی گئی ہے اُس کی حفاظت تمہاری جان کو ہلکان کئے رکھتی ہے۔ میں نے اِسی لئے چوروں ڈاکوؤں کی سرزمین کو ہمیشہ کیلئے خیر باد کہہ دیا ہے۔''

مظہر عباس نے گفتگو میں حصہ لیا، ''تو کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہمیں بھی تارکِ دُنیا ہو جانا چاہیے؟''

پروفیسر نے عجیب سی نظروں سے اُسے دیکھا۔ سوچا۔ جو کہنا چاہتا تھا اُسے ذہن میں دُہرایا پھر بولا، ''مائی سن! اگر میں چاہوں کہ سبھی لوگ میری طرح اپنی اپنی جنتیں بنانے کیلئے نکل کھڑے ہوں تو پھر دریاؤں، پہاڑوں اور سمندروں میں وہی کیفیت دیکھنے میں آئے گی جو خشکی پر اِس وقت دیکھنے کو ملتی ہے۔ تم لوگ اپنی دہکائی ہوئی جہنم میں ہی رہو تو بہتر ہے۔''

مظہر نے اچنبھے سے اُسے دیکھا۔ اِس سے وہ بہت خودغرض دکھائی دیا۔ افتخار نے ہنس کر کہا، ''دوست! غم نہ کرو۔ پروفیسر صاحب کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔ جو سمجھتا ہے وہ ناسمجھ ہوکر لوگوں کی نظروں میں ناکارہ قرار پاتا ہے۔''

پروفیسر نے فوری طور پر موضوعِ گفت گو بدلتے ہوئے شیر محمد گرمانی عرف شیرا گرمانی کا قصہ چھیڑ دیا۔ مزے لے لے کر بتلانے لگا۔ افتخار حیران ہوا۔ بولا، ''یقین نہیں آتا کہ درس وتدریس میں زندگی گزارنے والا انتہائی ذہین معلم اتنا دلیر اور مضبوط ثابت ہوسکتا ہے......آئی ڈونٹ بلیو اِٹ!''

پروفیسر نے مسکرا کر کہا، ''جب مجھے یقین ہوگیا تھا کہ میں چاہے جانے کے قابل ہرگز نہیں ہوں تو اُس وقت میری پہلی سوچ یہی تھی کہ خودسوزی کرلوں۔ اپنے آپ کو، اپنے محبت آمیز خیالات سمیت زمین برد کردوں مگر اچانک...... یونہی بیٹھے بیٹھائے یہ اچھوتا خیال سوجھ پڑا۔ تمہاری معاونت سے مجھے نئی زندگی مل گئی۔ مجھ پر اُترنے والی یہ زندگی، تم لوگوں کی زندگی اور موت دونوں سے بدرجہا بہتر ہے۔ یہ جنت انسان کو ہر جہت، ہر فکر حتیٰ کہ زندہ رہنے کی خواہش تک سے آزاد کردیتی ہے۔ تم نے سوچا کبھی؟...... دلیری ہمیشہ بےوقوف انسان کے دماغ میں پرورش پاتی ہے۔ کبھی فہم وفراست سے میل نہیں رکھتی۔ یہاں فہم نہیں، جہت نہیں، خوف اور جستجو بھی نہیں...... ایسے میں بزدل کیسے ہوسکتا ہوں۔ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کیلئے دماغ کو سلانا پڑتا ہے۔ میرا دماغ سانسیں لیتا ہے، جاگتا ہے مگر جانوروں کی طرح فقط اپنی بقا کے بارے میں ہی سوچتا ہے۔''

''پھر بھی......''

''نو مائی سن......'' پروفیسر نے ہاتھ اُٹھا کر افتخار کی بات کاٹ دی، ''یہاں قانون موجود نہیں، معاشرہ نہیں جو دوسروں کی آنکھ میں پڑے ہوئے بال کی تشہیر کرتا ہے اور اپنے شہ تیر پر لفظ اُٹھانے کی اجازت نہیں دیتا۔ شیرا گرمانی یا اُس کے ساتھی اونچ نیچ کرتے تو میں بےدریغ گولی ماردیتا۔ پانی قتل کے ثبوت، نعشیں، سب کچھ اپنے ساتھ بہا کر کہیں دور لے جاتا اور اُن اشتہاریوں کے وجود کو ملیامیٹ کردیتا۔''

تینوں جنت کے ستون کے قریب بالخصوص بیٹھنے کیلئے بنی ہوئی سیڑھیوں پر براجمان ہوگئے۔ ننگی

پنڈلیوں سے دریا کا گندمی رنگت والا پانی ٹکرا کر پلٹتا، پھر آن لپٹتا......کھیل بدن کو بھلا لگ رہا تھا۔ آج ہوا میں خنکی کا امتزاج نسبتاً زیادہ تھا۔مظہر عباس نے ایک گہرا سانس حلق میں اُتارتے ہوئے حسرت آمیز لہجے میں کہا،''زندگی کا یہ قدرتی حسن ہم شہر والوں کی نظروں سے ہمیشہ کیلئے چھپ گیا ہے۔ پیسے کے حصول میں آج کا انسان اتنا مصروف ہوگیا ہے کہ اُس نے اپنی روح کی تازگی کے جملہ سامان کو بھلا دیا ہے۔''

افتخار نے تائید کی،''میں اور تم، ہم دونوں بھی پروفیسر صاحب کی بدولت اِس نیچر کو قریب سے دیکھ پائے ہیں ورنہ شاید عمر بھر بے بہرہ ہی رہتے۔''

افتخار لپک کر گیا اور ریڈیو آن کر کے کوک کا ڈیڑھ لٹر پیک اور تین گلاس اُٹھا لایا۔ دونوں کو پیش کرنے کے بعد اپنا گلاس تھام کر نچلی سیڑھی پر بیٹھ گیا۔ کمر کے نچلے حصے تک پانی میں ڈوب گیا مگر اُسے لباس کے بھیگنے کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ جانتا تھا کہ چند منٹوں میں سرمست چلنے والی ہوا سکھا دے گی۔

ریڈیو پر ڈیرہ اسماعیل خان اسٹیشن سے لوک گیتوں کا کوئی پروگرام نشر ہو رہا تھا۔ سناٹے میں موسیقی اور مترنم آواز طلسم آگیں کیفیت طاری کر رہی تھی۔اُن کی توجہ اپنی باتوں پر مرکوز تھی مگر جونہی پروگرام کے ہوسٹ نے ڈاکٹر اشولال فقیر کا نام لیا، وہ چونک کر ریڈیو کی طرف متوجہ ہوئے۔اَشو لال کا لکھا ہوا عارفانہ کلام کوئی گلوکار اپنی خوبصورت آواز میں گا رہا تھا۔

تینوں نے پورے انہماک سے گیت سنا۔ ستائشی انداز میں تبصرہ کیا پھر اَشو لال کی باتوں میں مشغول ہو گئے۔مظہر عباس نے شکوہ کیا،''یار افتخار! اتنا عظیم انسان تم لوگوں کے بیچ میں رہتا ہے اور تم نے آج تک مجھے ملوانے کی زحمت نہیں کی۔''

''کیا کرو گے اُس سے مل کر؟'' پروفیسر نے گھورا۔

''یہ تو مجھے پتہ نہیں ہے سر!'' مظہر پروفیسر کے رویے میں عود کر آنے والے غیر معمولی تغیر پر گڑبڑا سا گیا،'' دریائے سندھ کی عظمت کو متعدد بار دیکھا ہے، دِل کرتا ہے کہ اِس کے دیوانے کو بھی دیکھوں۔''

پروفیسر خاموش ہو گیا۔ یکبارگی سے اُس کا جی چاہا تھا کہ وہ کھڑا ہو کر پوری قوت سے چیخ چیخ کر اعلان کرے کہ،''سندھو سائیں کا ایک ہی دیوانہ ہے اور وہ ہے پروفیسر وسیم بزدار......اَشو جھوٹا ہے۔ وہ ساگر کا نہیں، دُنیا کے حسن سے معمور ساغر کا دیوانہ ہے۔شمع سے دور بیٹھ کر ہجو آمیز دوہڑے گانے والے کو پروانہ نہیں کہا جاسکتا۔''

...۞...

ستاروں بھرے شہر میں ستاروں والا کوئی بھی ہوٹل نہیں تھا مگر اعلیٰ معیار کا ایک ریستوران موجود تھا جس کے فرسٹ فلور پر بنے فیملی ہال کے ایک پرسکون اور قدرے الگ گوشے میں دو ستارے اپنی اپنی روشنی پھیلائے آمنے سامنے موجود تھے۔مصباح بارہا مرتبہ کے بلانے پر بھی شاید نہ آتی اگر وہ خود پر قابو پانے میں کامیاب ہو جاتی۔خود اعتمادی کے زینے پر مضبوطی سے چلتی ہوئی یہاں تک آ تو گئی تھی مگر اَب بیٹھی جی ہی جی میں پچھتا رہی تھی۔کسی کے بلانے پر آ جانے والی لڑکیوں کے بارے میں اُس کے ریمارکس آج تک کچھ اچھے نہیں رہے تھے۔اَب بیٹھی سوچ رہی تھی کہ وہ کیا مختلف ثابت ہوئی؟ بیشتر لڑکیوں جیسی کھوکھلی، بے مہار اور اپنی طے کردہ راہ سے یکسر بھٹکی ہوئی۔

بیٹھے بیٹھے کھوسی گئی تو شہاب نے پوچھا،''پہلی مرتبہ یہاں آنے پر نروس ہو رہی ہو؟''

''نہیں۔میں پہلی مرتبہ یہاں نہیں آئی، بارہا مرتبہ آ چکی ہوں مگر بھائی یا ماما کے ساتھ، اکیلی نہیں یا کسی اور کے ساتھ نہیں۔''اُسے خود اپنی آواز کا کھوکھلا پن چبھنے لگا تو خاموش ہو گئی۔

''کیا مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے آنکھوں سے آگے کی دُنیا بھی دکھا سکتی ہو؟''شہاب خان کے لہجے میں اشتیاق تھا۔

وہ گڑبڑا سی گئی۔حسن آئینے کے سامنے مکمل دکھائی دیتا ہے۔چاہنے والے کے سامنے احساسِ کمتری کی لپیٹ میں آ کر نامکمل ہو جاتا ہے۔اُسے تذبذب کا شکار دیکھ کر شہاب مسکرایا،''دیکھو مصباح! اَبھی ویٹر ہمارا آرڈر سرو کر جائے گا اور تمہیں نقاب الٹنا پڑ جائے گا۔تب شاید میں چاند کی حقیقی تعریف نہیں کر پاؤں گا۔''

وہ چاند قرار پا رہی تھی۔ شرما گئی، ہچکچا گئی۔ آنکھوں میں عجیب سا خوف سمٹ آیا۔ شہاب نے دلاسہ دیا، ''چاند کو چاند تب ہی قرار دیا جاتا ہے کہ وہ ہر رات بے نقاب پوری دُنیا پر اُتر آتا ہے۔ تم بھی چاند ہو، چاند کا حقیقی چہرہ ہو، پلیز! اپنے دیوانے پر کھل جاؤ۔''

وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ شہاب بھی کچھ نہ سمجھتے ہوئے گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ جلدی سے بولا، ''پلیز مصباح! اگر تم مائنڈ کر رہی ہو تو میں اپنا اصرار واپس لیتا ہوں۔ مجھے تمہاری موجودگی کی طلب ہے ناں کہ تمہارے نہ کھلنے کی پرواہ۔ بیٹھ جاؤ، جی مانے تو کچھ کھا پی لینا، نہ مانے تو چند باتیں کر کے واپس چلے جانا۔''

وہ اپنے دیوانے کو نامراد چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی تھی۔ بس ایسے ہی دل گھبرانے لگا تھا۔ نفی میں سر ہلا کر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی بڑی سی ٹنٹڈ گلاس والی وِنڈو میں آن کھڑی ہوئی۔ کھڑکی سے باہر جھانکا۔ نیچے موجود سڑک پر بے ہنگام ٹریفک رواں دواں تھی۔ اُس کی نگاہ سامنے گلی سے نکل کر سڑک پر آتی ہوئی عورت پر پڑ گئی۔ وہ بے نقاب تھی۔ کالی چادر میں دھندلے نقوش والا گورا چہرہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ سوچنے لگی، ''وہ میری طرح کی ہی عورت ہے جو بے نقاب چلی آ رہی ہے۔ اُسے کوئی روکتا نہیں، کوئی ٹوکتا نہیں، پھر میں کیوں ایک شخص پر کھلنے سے ہچکچا رہی ہوں۔ شخص بھی وہ جو بھرے پرے شہر کی جوانیوں کو چھوڑ کر ایک ایسی عورت کے پیچھے لپک رہا ہے جس کے چہرے کی ایک جھلک بھی دیکھ نہیں پایا۔''

عقب میں قدموں کی چاپ نہیں اُبھری۔ اُس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ شہاب اُس کے پیچھے نہیں آیا تھا بلکہ کرسی میں بیٹھا رہ کر توجہ سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ اُس نے رُخ پھیر لیا اور سڑک پر بلا جواز دیکھنے لگی۔

دائیں ہاتھ کو غیر محسوس انداز میں حرکت میں لاتے ہوئے نقاب اُتار دیا۔ چاہنے والے بھی بڑے عجیب ہوتے ہیں۔ ایک شخص سے چھپنے والی پورے زمانے پر کھل گئی تھی۔

چند لمحے کئی منٹوں پر محیط ہو گئے۔ سوچتی رہی کہ پلٹ کر دیوانے کی نگاہوں میں چاند کی ندرت اُتارے، یا پلٹے بغیر یہیں کھڑی رہے۔ شہاب خان کو خاموش پا کر بولی، ''محبت تو دو رُوحوں کے مابین

ہونے والی خاموش گفت گو کا عنوان ہے، تم کیوں میرا چہرہ دیکھنے پر بضد ہو؟''

وہ سنجیدگی سے گویا ہوا، ''زبان سے ادا ہونے والے الفاظ غلط فہمیوں کیلئے سازگار زمین فراہم کرتے ہیں جبکہ آنکھیں اور چہرے کے تاثرات وہ سب کچھ کہہ سناتے ہیں جنہیں کہنا عمومی طور پر انسان کی دسترس میں نہیں ہوتا۔''

''کیا میرا یہ کہہ دینا کہ میں تمہاری محبت کو قبول کرتی ہوں، کافی نہیں ہے؟'' اُس کی آواز میں واضح طور پر ارتعاش موجود تھا۔

''میں پچاس مرتبہ اپنی چاہت کا اظہار کروں، فقط ایک مرتبہ لبوں کی موہوم سی مسکراہٹ میں جواب ملے تو بھی اُس خاموش جواب کا دُنیا میں کوئی جواب نہیں ہوگا۔''

شہاب آنکھوں میں جھانکتے رہنے کا عادی تھا۔تبھی وہ باتیں کرتے ہوئے مسلسل گھبراتی رہتی تھی۔ پیٹھ موڑے بڑے آرام سے سوال جواب کر رہی تھی۔ بولی، ''میں نے پوچھا تھا کہ تم کیا کام کرتے ہو، تم نے جواب نہیں دیا بلکہ صفائی سے ٹال دیا۔اَب پوچھتی ہوں کہ تم کتنا پڑھے ہو، کیا کرتے ہو؟''

وہ مسکرا کر بولا، ''میں نے زرعی یونیورسٹی سے سائنس میں گریجویشن کیا تھا۔ ماسٹر ڈگری کیلئے انگلینڈ چلا گیا جہاں تین سال گزارنے کے بعد دو ماہ قبل یہاں پہنچا ہوں۔پہنچتے ہی پتہ چلا کہ جس خیرہ کرنے والے وجود کی تلاش میں میں اَپر پنجاب اور کئی یورپین مما لک میں پھرتا رہا، وہ اپنے ہی شہر میں موجود تھا۔''

''نوکری کرتے ہو؟'' وہ جھینپ کر بولی۔کم بخت ہر صوتی نغمے کی تان اُس پر لا کر توڑ دیتا تھا۔

''نہیں۔مگر کہو گی تو کرلوں گا۔''

''میرے کہنے پر ہی کیوں؟'' وہ حیرانی سے بولی۔

''کیونکہ تمہیں دیکھنے کے بعد میں میں نہیں رہا، تم ہو گیا ہوں۔''

''جھوٹ بولتے ہو، تم نے اَبھی تک مجھے دیکھا ہی نہیں۔'' مصباح کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ تیر گئی۔

عقب میں برتنوں کے کھنکنے کی آوازیں اُبھریں۔اُسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ویٹر ٹیبل پر کھانا

چین رہا تھا۔ اُس کے جانے کے بعد شہاب نے کہا، ''اگر مناسب سمجھوتو آ کر کھانے میں شریک ہوجاؤ۔''

وہ بولی، ''مجھے بھوک نہیں ہے۔''

''تم نہیں کھاؤ گی تو میں کیسے کھا سکوں گا؟'' شہاب نے کہا، ''چلو ایسا کرتے ہیں کہ تم نقاب اُتارے بغیر میرے سامنے بیٹھ جاؤ، میں یہ سمجھ کر کھاتا رہوں گا کہ تم میرے ساتھ شریک طعام ہو۔''

''ہاں! یہ ٹھیک رہے گا۔'' وہ خوش ہوگئی۔

مسلسل کھڑے رہنے کی بدولت تھک گئی تھی۔ نقاب میں چہرہ چھپا کر پلٹنے لگی تو ناگاہ نظر دائیں ہاتھ پر کھڑکی کے اَدھ کھلے شیشے پر پڑ گئی۔ اچانک پورا بدن سن ہوگیا۔ بے داغ شیشہ اپنی گہری رنگت کے باعث آئینہ بناہوا تھا۔ آئینے میں شہاب کا مسکراتاہوا چہرا دکھائی دیا تو دماغ نے فوراً خطرے کی گھنٹی بجا کر سمجھا دیا کہ جیسے تم اُسے دیکھ رہی ہو، ایسے ہی وہ تمہیں کافی دیر سے بیٹھا دیکھ رہا ہے۔

گھبرا کر شہاب خان کو دیکھا۔ اُس کی معنی خیز انداز میں مسکراتی ہوئی آنکھوں نے اپنی چوری کا اعتراف کرلیا۔ وہ کرسی چھوڑ کر اُس کے بہت قریب چلا آیا۔ لرزتی ہوئی آواز میں بولا، ''تم دُنیا کے جس مکمل حسن کو سیاہ چادر میں لپیٹ کر میری نظروں سے چھپاتی رہی ہو، اُسے شیشے نے تمہاری بے خبری میں مجھ پر عیاں کر دیا ہے۔ دیکھنے سے پہلے دل پر صبر کی سل رکھنے میں کامیاب ہوگیا تھا، اَب نہیں۔''

اُس نے بڑے پیار سے اُس کی چادر کا پلو تھاما اور آہستگی سے چہرہ ننگا کر دیا۔ وہ کسی مجرم کی طرح نظریں جھکائے کھڑی کانپتی رہی۔ شہاب خان نے نرمی سے چہرے کو چھوا۔ اوپر اُٹھایا۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وفورِ عقیدت سے بولا، ''یقیناً تمہیں میرے لئے بنایا گیا ہے مگر یہ کیا کہ میرا دِل تمہیں چھونے پر بھی ڈرنے لگا ہے کہ چمکدار آئینے پر سانسیں بھی دھندلاہٹ بکھیر دیتی ہیں۔ میری بے خودی میں کہیں اُجلا کاغذ میلا نہ ہوجائے، کہیں پھول پر بوسیدگی طاری نہ ہوجائے، کہیں ماہِ تاباں پر داغ نہ پڑ جائے......''

اُس کا حسن ہمیشہ سے تعریف کی زَد میں رہا تھا۔ سہلیاں اُس پر شاعری جھاڑتی رہتی تھیں مگر شہاب

خان کے ہونٹوں سے نکلنے والا حرف حرف اپنی معنویت سمیت اُس کی ذات کی گہرائیوں میں اُترتا چلا جا رہا تھا۔ آسودگی سے مسکرائی تو گالوں میں پڑنے والے گڑھے چند ثانیوں کیلئے نمایاں ہوئے۔ یہ چند لمحے چاہنے والے پر برق گرا کر خاکستر کر گئے۔ وہ بہ دقّت تمام الٹے قدموں کرسی تک آیا۔ بے دم ہو کر ڈھے سا گیا۔ عجیب وحشت زدہ سی نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے بڑبڑایا، ''بہت دور تک تمہارے ساتھ چلنے کیلئے زندہ رہنا چاہتا ہوں مگر شاید تمہاری مسکراہٹ میرے اَندر اتنی گھٹن بھر دے گی کہ میں زیادہ دیر تک سانس نہیں لے پاؤں گا۔''

وہ دم بخود رہ گئی۔ ایسا کہیں سنا نہیں تھا، کہیں پڑھا نہیں تھا مگر آنکھیں دکھلا رہی تھیں کہ ہنسنے مسکرانے والا شہاب خان ہرگز نارمل نہیں رہا تھا۔ اُس کا تنفس بری طرح غیر معتدل ہو گیا تھا۔ جھکے ہوئے چہرے پر پھیلی ہوئی وحشت آمیز زردی بالکل حقیقی ردِعمل کا پَرتو بنی ہوئی تھی۔ ایک عجیب سا تفاخر اور دُنیا میں یکتا ہونے کا احساس مصباح کے رَگ وپَے میں اُتر گیا۔ اُس کی متزلزل خوداعتمادی لوٹ آئی۔ آنکھیں جھپکائے بغیر دیکھتے ہوئے شرارت سے بولی، ''میرا خیال ہے کہ مجھے یہ سمجھ کر کھانا ہو گا کہ تم میرے ساتھ شریکِ طعام ہو۔''

وہ خود پر قابو پانے میں کامیاب ہو گیا۔ کھانے کے دوران واضح طور پر نظریں چرا رہا تھا۔ اُس کے اِس غیر فطری رویے پر مصباح کا دَم گھٹنے لگا۔ بے عنوان حبس ختم کرنے کیلئے پوچھنے لگی، ''کیا تم اپنے فیملی بیک گراؤنڈ کے بارے میں نہیں بتاؤ گے؟''

وہ جھٹ سے بولا، ''کیا میں نے تمہارا پس منظر جاننے کی کوشش کی ہے؟''

وہ سٹپٹا کر بولی، ''نہیں مگر جاننے کا اشتیاق تو ہو گا۔''

وہ بات کاٹ کر بولا، ''نہیں۔''

''کیوں؟'' اُسے اچنبھا ہوا۔

''اِس لئے کہ میرے نزدیک صرف اِس بات کی اہمیت ہے کہ تم میری ہو۔''

''ابھی یہ فیصلہ تو نہیں ہوا۔'' وہ نفی میں سر ہلا کر بولی۔

''نہیں ہوا تو ایک نہ ایک دن ہو جائے گا۔ مجھے پرواہ نہیں۔''

''اچھا......'' وہ جز بز ہو کر بولی،'' اگر مناسب سمجھو تو اپنے بارے میں کچھ بتا دو۔ نہ بتانا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

''کیا تم مجھے جانتی ہو؟''

''ہاں۔مگر صرف اتنا، جتنا تم نے اپنے بارے میں بتلایا ہے۔''

''ہوں!'' اُس نے یوں ہنکارا بھرا جیسے اُس کے سر سے کوئی بوجھ اُتر گیا ہو۔کولڈ ڈرنک کا چھوٹا سا گھونٹ بھرتے ہوئے بولا،'' میرا خاندانی پس منظر ایسا ہی ہے جیسا اِس شہر کے سینکڑوں بے روزگار لڑکوں کا ہے۔متوسط طبقے سے تعلق رکھتا ہوں۔ پریکٹیکل لائف میں قدم رکھوں گا، سنہرے مستقبل کے پیچھے بھاگوں گا، تب میرے پاس تمہیں بتلانے کیلئے کچھ موجود ہوگا۔اَبھی کیا بتلاؤں تجھے؟''

مصباح نے چونک کر اُسے دیکھا۔کتنی ڈھٹائی سے جھوٹ بول رہا تھا۔ بولی،''تمہارے پاپا کیا کرتے ہیں؟''

''دریائے سندھ کے رحم وکرم پر ایک زرعی فارم بنا رکھا ہے اُنہوں نے۔اتنی آمدنی ہو جاتی ہے کہ گزر بسر اچھی ہو جاتی ہے۔کبھی کبھی بس دریا کا پیٹ ہی بمشکل بھرتا ہے۔'' وہ عام سے لہجے میں بولا۔

''ان کا نام کیا ہے؟'' وہ بات کو بڑھا رہی تھی۔

''ارباب خان۔'' شہاب کا لہجہ بالکل سپاٹ تھا۔

وہ اُس پر نظریں جما کر بولی،''ہمارے ضلعی ناظم کا نام بھی ارباب خان ہی ہے۔''

وہ چونکا مگر فوراً ہی خود پر قابو پا کر بے نیازی سے بولا،''ہاں۔اِس شہر میں ایسے بھی کئی آدمی موجود ہیں جن کا نام صدام حسین ہے۔میرے ایک دوست کا نام ضیاء الحق ہے۔کئی ایسے عمران خان یہاں موجود ہیں جنہیں کرکٹ کا بلا پکڑنا بھی نہیں آتا ہوگا۔''

مصباح نے لاجواب ہو کر پوچھا''بہن بھائی کتنے ہیں؟''

وہ مسکرایا اور ایک انگلی دکھا کر بولا،''ایک۔میں ہی اپنا بھائی ہوں، میں ہی بہن......''

''اکلوتے بیٹے کی نفسیات کافی پیچیدہ ہوتی ہیں۔''

''ہوتی ہوں گی مگر میں جیسا بھی ہوں، تمہارے سامنے ہوں۔'' وہ اُس کی آنکھوں میں آنکھیں

ڈال کر بولا، ''اپنے کردار کے بارے میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ دُنیا کے کسی آدمی کو بھی مجھ سے شکایت نہیں ہے۔''

وہ ٹشو پیپر سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ اُس نے دریافت کیا، ''کیا سوچ رہی ہو؟''

''تمہارا فیملی بیک گراؤنڈ بھی کچھ زیادہ مضبوط نہیں، تم کوئی نوکری بھی نہیں کرتے ہو، ایسے میں میرے والدین کیسے تمہاری ذات سے مطمئن ہوں گے؟'' وہ کامل سنجیدگی سے پوچھنے لگی۔

''کیا میری تعلیم اور شخصیت کو اضافی نمبر نہیں ملیں گے؟''

اچانک مصباح کی نگاہوں میں افتخار بیگ کا چہرہ لہرا گیا۔ وہ اتنا وجیہہ نہیں تھا مگر اُسے بہت سی ہمدردیوں کے ساتھ ساتھ پلس پوائنٹ بھی حاصل تھے۔ مصباح کے والدین کو اُس کی جاب بہت پسند تھی۔ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی، ''تعلیم شعور دیتی ہے، شخصیت دبدبہ طاری کرتی ہے مگر پیٹ بھرنے کیلئے کوئی اچھا بزنس یا ملازمت ضروری ہوتی ہے۔ میرے والدین بڑے پریکٹیکل انداز میں سوچنے کے عادی ہیں۔ اُنہیں نظریات، تخیلات اور آئیڈیالوجی پر کچھ زیادہ بھروسہ نہیں ہے۔''

''بہ ہرحال! جو کچھ میرے پاس ہے، تم پر پورے صدق سے ظاہر کر چکا ہوں۔'' اُس نے کندھے اُچکا کر نیم مایوسی کی کیفیت میں کہا۔

''تو اِس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارا مستقبل محض تقدیر پر انحصار کرتا ہے؟'' مصباح نے قدرے ہچکچا کر دریافت کیا۔

شہاب نے چونک کر اُسے دیکھا۔ جسے اُس نے چاہا تھا، وہ ہر لحاظ سے منفرد تھی۔ سینہ فرطِ تفاخر سے پھیل گیا۔ نفی میں سر ہلا کر غیر معمولی سنجیدگی سے گویا ہوا، ''مصباح! اگر تقدیر کو ہمارا ملن گوارا نہ ہوا تو میں تقدیر کی تمام تھیوری کو جھٹلا دوں گا۔ منکر اور کافر کسی بھی انداز میں دریافت کر سکتا ہے کہ بتلا! تم نے ہمیں ملایا ہی کیوں تھا؟ میں باپ دادا کے نام اور اعمال کی بیساکھی پر چل کر اپنے عشق کی تعبیر پانا قبول نہیں کروں گا۔ میں دولت کے بَل پر اپنی محبوبہ کو خریدنے کی گستاخی نہیں کروں گا۔ کسی اختیار کو بروئے کار لاتے ہوئے تمہارے والدین کو بلیک میل نہیں کروں گا۔ ہاں! پیچھے بھی نہیں ہٹوں گا۔

تمہیں میرا بننا ہوگا۔نہیں بنو گی تو یہ یقین کرلو کہ میں کسی کی گود میں تمہاری سہاگ رات کو ہمکنے کی اجازت نہیں دوں گا۔تم رہو گی تو فقط میری وگرنہ نہیں رہو گی۔ میں رہوں گا تو محض تمہارے سہارے پر وگرنہ نہیں رہوں گا۔''

''مگر......''

''کوئی اگر مگر نہیں، جو کہہ دیا، وہی مدعائے آخر ہے۔'' شہاب کے حتمی اور اَٹل لہجے نے مصباح کو ہلا کر رکھ دیا۔ وہ چند دنوں میں اتنا آگے نکل جائے گا، اُس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ شاید مرد ایسے ہی ہوتے ہیں۔ وہ کافی دیر تک سر جھکائے بیٹھی سوچتی رہی، پھر سر اُٹھا کر بولی،''مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

''تمہیں میرا انتظار کرنا ہوگا۔''

''ہمارا معاشرہ اَبھی اتنا بولڈ نہیں ہوا کہ کوئی لڑکی کسی کے انتظار میں غیر معینہ وقت تک گھر میں بیٹھی رہے۔ نہ خود مختار عورت، نہ ہی پیرا سائٹ لڑکی۔'' اُس نے بڑی دانش مندی کی بات کی۔

وہ بولا،''میں جان چکا ہوں کہ تمہارے والدین افتخار بیگ کو مجھ پر ترجیح دیں گے۔تم بھی شاید اپنے کزن کی محبت سے مغلوب ہو کر مجھے چھوڑنے کی کوشش کرو۔ کچھ ایسا ہی ماحول میرے گھر میں بھی پیدا ہوتا دکھائی دیتا ہے۔''

چند لمحوں کیلئے رُکا، سانس لے کر بولا،''میرا چچا بہت بڑا زمیندار ہے۔ میرے باپ کی نظریں اُس کی جائیداد پر گڑی ہوئی ہیں۔ لالچ کی پٹی تلے مسلسل ایک رُخ کو دیکھتی ہوئی آنکھیں بیٹے کے جذبات کی طرف متوجہ نہیں ہوں گی مگر میں مرد ہوں، ڈٹ سکتا ہوں، لڑ سکتا ہوں۔ بغاوت کر کے باپ کا گھر چھوڑ سکتا ہوں۔تم عورت ہونے کے ناتے شاید یہ سب کچھ نہ کرسکو مگر میری محبت تمہیں ہر اُس کٹھن راستے سے گزارے گی جس کا تم نے سر دست سوچا تک نہیں۔''

وہ گھبرا کر بولی،''میں اپنے والدین کو کوئی تکلیف نہیں دوں گی۔''

''محبت کے جس مقام پر میں پہنچ چکا ہوں، اُس مقام پر پہنچ کر تمہارے ارادوں میں غیر معمولی تغیر پیدا ہو جائے گا۔ میں سوچ کی اُس تبدیلی کا انتظار کروں گا۔'' شہاب نے کہا۔

رِسٹ واچ پر نگاہ پڑی تو وہ گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔ بہت دیر ہوگئی تھی۔ شہاب نے بھی ساتھ دیا۔

زینے اُترتے ہوئے شہاب نے کہا، ''مصباح! میں ناکارہ انسان ہوں، محبت کے علاوہ کوئی کام بھی ڈھنگ سے نہیں کرسکتا۔ تم اپنی محبت کی سکت سے مجھ سے ہر کام کرواسکتی ہو، کامیاب انسان بناسکتی ہو۔ پیار سے چھوؤ گی تو سونا بن جاؤں گا، بے رُخی سے چھوڑ دو گی تو مجھے مُردہ کردو گی۔ یہ طے ہے، اِس دعوے کی صحت پر شبہ کرنا نہائت بچگانہ ہوگا۔''

وہ زینوں کے وسط میں رُک گئی۔ نظریں اُٹھا کر اپنے دیوانے کو دیکھا پھر گھبرا کر ریلنگ پر جھک گئی۔ بڑبڑانے لگی، جانے سمجھا رہی تھی، جانے سمجھ رہی تھی۔ شہاب کو اُس کے منہ سے نکلنے والے بے ربط الفاظ کی سمجھ نہیں آرہی تھی مگر ایسی باتیں سمجھنے کیلئے تو نہیں ہوتیں۔

...❀...

قسمت اپنی ماما کے ساتھ خریداری کرنے نکلی ہوئی تھی۔ ایسے میں ہنس کو تنہائی بُری طرح کھل رہی تھی۔ وہ اکیلا بیٹھا پوڈو کے ساتھ دُنیا جہان کی باتیں کررہا تھا۔ آج گرمی زیادہ تھی۔ اُس کی باریک بنیان پسینے سے تر تھی۔ گردن اور ماتھے پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ وہ کبھی گردن پونچھتا تو کبھی ہاتھ کی پشت سے پیشانی پر آیا پسینہ صاف کرتا۔ باتیں کرتے کرتے بوریت محسوس کرنے لگا۔

بچپنا یہ سمجھانے پر قادر نہیں تھا کہ قسمت کی عدم موجودگی کے باعث بوریت اُس کے اندر بھر گئی تھی جو کسی بھی صورت محو ہونے والی نہیں تھی۔ وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اُٹھا اور اپنے کمرے سے کھلونا موبائل فون اُٹھا لایا۔ اُسے آن کیا تو کسی گیت کا میوزک بجنے لگا۔ اُس نے بڑی احتیاط سے فون پوڈو کے کندھے پر رکھ دیا۔ زیرلب بڑبڑایا، ''پوڈو! تم بھی کیا یاد رکھو گے۔ فون میں بہت سارا بیلنس موجود ہے۔ جی بھر کر اپنے فرینڈز سے باتیں کرو۔ قسمت آ گئی تو پھر موقع نہیں ملے گا۔''

پوڈو فون پر باتیں کرنے لگا۔ وہ کشتی کے سامنے سے اُٹھا اور سنتھّے کی باڑ کے قریب آ کر لیٹ گیا۔ آنکھوں پر ہاتھ رکھے تو قسمت کی سرخ و سپید شبیہہ اُبھر آئی۔ جلدی سے ہاتھ ہٹائے، وہ غائب ہوگئی۔ سمجھ میں آیا کہ وہ پلاٹ میں نہیں، اُس کے ذہن میں جلوہ افروز ہوئی تھی۔

کھڑکی میں سنگی بُت کی طرح ایستادہ، اُس کا باپ، اُس کی حرکات وسکنات کا عمیق نظروں سے

جائزہ لے رہا تھا۔ سوچ رہا تھا، ''یہی تو دُنیا کا سب سے پہلا اور کبھی نہ جھٹلایا جانے والا فلسفہ ہے۔ نہ سمجھ میں آنے والا عرفان ہے۔ ہنس بے چینی محسوس کر رہا ہے کیونکہ وہ قسمت کو نہیں دیکھ رہا۔ جونہی وہ سامنے آئے گی، ساری کلفت آپوں آپ دور ہوجائے گی۔ انسان......صرف انسان ہی انسان کا مداوا ہے۔''

شناں ہاتھ میں فرائنگ پین اُٹھائے قریب آئی۔ پہلے باپ کو دیکھا۔ پھر کھڑی سے جھانک کر بیٹے کو دیکھا۔ بولی، ''قسمت دکھائی نہیں دے رہی؟''

''بیٹے کی بے قراری تو دکھائی دے رہی ہے۔''

ہنس کبھی لیٹ جاتا، کبھی بڑوں کی طرح پیٹھ پر ہاتھ باندھ کر ٹہلنے لگتا اور کبھی پوڈو کو مخاطب کر کے کچھ کہنے سننے لگتا۔ شناں نے دیکھا کہ اُس نے محض دو چار منٹوں میں متعدد بار قسمت کے کوارٹر کی طرف دیکھا تھا۔ اپنے شوہر سے مخاطب ہوئی، ''یہ تو بڑی ہی غلط بات ہے۔ سرکاری کوارٹر کب آباد ہوجائے، کب اُجڑ جائے، کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ ڈاکٹر عثمان کی فیملی یہاں سے چلی گئی تو کیا ہوگا؟ ہمارا دانہ پانی یہاں سے اُٹھ گیا تو کیا ہوگا؟ ہنس تو شاید ہنسنا ہی بھول جائے گا۔''

''فکر نہ کرو شناں!'' شوہر نے اُسے پیار سے اپنے قریب کرلیا، ''بچپن میں ہی جدائی کے سانحوں سے روشناس ہوجائے گا تو زندگی کا ہر زینہ مضبوط قدموں سے عبور کرتا جائے گا اور کبھی جذباتی شکست وریخت کا شکار نہیں ہوگا۔''

''کیا جدائیوں کے عادی شخص پر جدائی اثر انداز نہیں ہوتی؟'' شناں نے بے ساختگی سے دریافت کیا۔

اُس کے شوہر کی اٹمل خاموشی نے بھید کھول دیا کہ اُس کے پاس اِس سوال کا جواب موجود نہیں ہے۔

......

سیاہ بادلوں نے دوپہر کو شام بنادیا تھا۔ پروفیسر کنکریٹ کے ستون پر کھڑا تھا۔ چہرے پر ٹھنڈی

ہوا کے تھپیڑے عجیب سی طمانیت بکھیر رہے تھے۔قریب ہی کہیں بارش ہو رہی تھی تبھی ہوا میں نمی اور خنکی قدرے زیادہ تھی۔محکمہ موسمیات نے خبردار کیا تھا کہ آنے والے چند دنوں میں دریائے سندھ میں نچلے درجے کی طغیانی آئے گی۔ پروفیسر نے سرکاری چینل پر یہ خبر سنی تھی۔ فلک شگاف قہقہہ لگاتے ہوئے مشرق کی جانب منہ کر کے بلند آواز میں چیخ کر یوں کہا کہ جیسے اُس کی آواز لاہور مرکز کی عمارت تک پہنچ رہی ہو۔ ''اے سرکاری دانش ورو! تم نے کبھی یہ سوچنے کی زحمت نہیں کی کہ لاہور، اسلام آباد اور کراچی والوں کو دریائے سندھ میں گھٹتے بڑھتے پانی سے کوئی غرض نہیں۔ جن لوگوں کو پانی کا چڑھاؤ آن کی آن میں نگل لیتا ہے، جن لوگوں کے مویشیوں کو اپنے ساتھ بہا کر لے جاتا ہے اُن کے پاس ٹیلی وژن کی سہولت موجود نہیں ہے۔ اُنہیں تمہاری ان اطلاعات کا کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ یہ لوگ بہاؤ کے مزاج اور ہوا میں پھیلی مٹی کی خوشبو کو سونگھ کر اندازہ کرتے ہیں کہ سیلاب آنے والا ہے۔شمال کی جانب منہ کر کے نتھنے کھینچتے ہوئے یہ مور، یہ گھاڑو، یہ کیہل، یہ کنگر مُہانے تبھی تمہاری نظر میں کتے قرار پاتے ہیں......ایسی ناکارہ خبریں دینے والو! کبھی تم نے سوچا کہ اِن لوگوں کو سیلاب کی قبل از وقت اطّلاع دینے کیلیئے تم نے آج تک کوئی مناسب بندوبست نہیں کیا؟''

نہ جانے کیوں اُس کی آواز نے آج بازگشت پیدا نہیں کی تھی۔ بارش نے چند آزمائشی قطرے دریا کے پیلے پانی پر ٹپکا دیے۔ عجیب سی موسیقی فضا میں پھیل گئی۔ساعت کو بھلی لگی۔ پانی پر گرتا ہوُا پانی، جوانی پر لڑھکتی ہوئی جوانی......دونوں انسانی ذہن پر نشہ سوار کر دیتے ہیں۔ وہ ایڑیوں کے بل گھوم گیا۔ ہر طرف مسرت ہی مسرت تھی۔ تاحدِ نگاہ سکون تھا۔اُس نے دونوں بانہیں سوئے آسمان پھیلا دیں۔نظریں فلک پر گاڑیں تو چند بوندیں چہرے پر گریں۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش برسنے لگی۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے کبھی آسمان کی جانب، کبھی مچلتے ٹپکتے پانی کی طرف والہانہ نگاہوں سے دیکھنے لگا، کتنا کیف آگیں ماحول بن گیا تھا۔شہر یاد آ گیا۔نفرت سے ہونٹ بھنچ گئے۔شہر کا وہ محلہ نگاہوں میں گھومنے لگا جس پر بارش رحمت کے بجائے زحمت کی صورت اُترتی تھی اور گلیوں میں بارش اور نالیوں کا پانی بھر جاتا۔ بارش رُکنے سے قبل گٹروں کے دہانے بھی اُبل پڑتے۔ بچے پانی میں کھیلتے، لت پت ہو کر کلکاریاں مارتے۔ ایسے میں والدین

کے دل اندیشوں اور واہموں سے لرزنے لگتے۔ شام تک آدھے بچوں کو گندے پانی میں بھیگنے کے باعث بخار آن لیتا۔ آدھے مختلف نوعیت کی جلدی بیماریوں میں مبتلا ہو کر والدین کیلئے مصیبت بن جاتے۔

یہاں ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ اوپر سے اترتی ہوئی پانی کی شفاف چادر، یوں کہ جیسے سیدھی حوضِ کوثر سے نکل کر آ رہی ہو، نیچے سرکتا ہوٗا پانی کا سلوٹ زدہ مست قالین یوں جیسے زندگی پہاڑوں سے نکل کر سمندروں تک خاموش سفر کرنے چلی ہو......

اُس نے اپنی دھاری دار شرٹ اور ٹراوٗزا اُتار کر عرشے پر پھینک دیا۔ تن پر صرف ایک گہرے رنگ کا کچھا (انڈرویئر) رہ گیا۔ چند ہی لمحوں میں پورا بدن بھیگ گیا۔ بھیگے بدن پر ٹھنڈی ہوا کے تھپیڑوں نے خوش گواریت لپیٹ دی۔ وہ بے خود ہو کر پاگلوں کی طرح قہقہے لگانے لگا۔ شہر میں اگر یوں مچلتا تو چہار جانب سے اَن گنت پتھر اُس پر برسنے لگتے۔ یہاں نہ تو پتھر تھا، نہ پتھر پھینکنے والا کوئی ہاتھ...... اچانک جنت کے قریب ہی چند مچھلیاں پانی سے باہر اچھل اچھل کر اپنی ہویت کا احساس دلانے لگیں۔ منظر دیکھ کر نظر ہٹانے کو جی نہیں چاہا اور وہ ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا۔

فون کی بیل سن کر چونک پڑا۔ اُس کا موبائل فون ٹراوٗزر کی ہپ پاکٹ میں تھا۔ وہ ستون سے اُتر کر عرشے پر آیا۔ موبائل نکال کر آن کیا اور کانوں سے لگا کر وفورِ مسرت سے بولا، ''مرشد! میں، قسمت اور اتفاقات پر یقین نہ کرنے والا پروفیسر وسیم بزدار حیرت کناں ہوں کہ آسمان نے شراب پلا دی، قسمت نے تمہاری ملاقات بخش دی۔ خوش نصیبی کہوں یا اتفاق، کسی ایک کو ماننا پڑ رہا ہے۔''

ڈاکٹر اَشولال کی پُر زندگی آواز کانوں میں رَس گھولنے لگی، ''کبھی کبھی میں یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہوں کہ تم نے انسانوں کو چھوڑ کر فطرت سے یارانہ گانٹھ کر بہت اچھا کیا ہے۔ دیکھو ناں! ہم کپڑے بھیگنے کے ڈر سے کمروں میں بند ہو کر بیٹھے ہیں جبکہ تم پوری آزادی سے کمرے سے نکل کر بھری بارش کے بیچ کھڑے ہو گے۔''

''تم بھی باہر نکل آؤ مرشد!'' اُس نے مشورہ دیا، ''تمہارا گھر ہسپتال کی ملحقہ سرکاری کالونی میں واقع ہے جہاں کھلی فضا موجود ہے اور گندے پانی کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر بھی نہیں ہے، چاہو تو حظ اُٹھا

سکتے ہو۔''

''ارے کہاں سئیں!'' اَشو نے حسرت سے کہا،''میں نے باہر نکلنا چاہا تو تمہاری بھابھی نے فوراً دوسرے کپڑے الماری سے نکال کر میرے ہاتھ میں تھما دیے۔موڈ ہی غارت ہو گیا۔''

وہ ہنسنے لگا۔کہنا چاہتا تھا کہ''عورت کبھی بھی سُکھ نہیں دیتی۔اس کے وجود سے چوبیس گھنٹے جواز، اصول اور بہانے پھوٹتے رہتے ہیں۔'' کہہ نہ پایا۔خاموش پا کر اَشولال نے کہا،''کیا تمہیں اتنے خوبصورت موسم میں کوئی یاد آ رہا ہے؟''

اچانک درد کی ایک کٹیلی لہر پروفیسر کے بھیگے بدن میں پھر گئی۔وہ ہکلا سا گیا،''کک......کیا کہنا چاہتے ہو مُرشد؟''

''جو کہنا چاہتا ہوں،اُسے تم سمجھ کر ہی ٹوٹنے بکھرنے لگے ہو۔''

''تم شاعر ہو، نامور لکھاری ہو، بات کا بتنگڑ بنانا جانتے ہو۔مجھے کوئی بھی یاد نہیں آ رہا۔'' پروفیسر کے لہجے میں خفگی کا مہین سا احساس عود کر آیا۔

''کیا رُباب بھی یاد نہیں آ رہی؟''

''کیا تم نے مجھے ذلیل کرنے کیلئے فون کیا ہے؟''

''لاحول ولاقوۃ......نہ جانے تم ہمیشہ اپنی کھوپڑی گرم کیوں رکھتے ہو۔'' اَشولال نے جلدی سے کہا،''انسان چند گھنٹے کے سفر کے دوران ملنے والے اجنبی کو یاد کر لیتا ہے،تم تین سالوں کی ہمراہی کو یاد نہیں کرتے۔کیا یہ غیر انسانی اور غیر فطری رویہ نہیں ہے؟''

''پلیز مُرشد!اِس تذکرے پر مٹی ڈالو۔کوئی نئی بات کرو۔'' پروفیسر خود پر قابو پانے کی کوشش میں کراہا۔

''بالکل ٹھیک سئیں!میں پہلو بدل کر وار کرنے لگا ہوں۔کیا مریم کا وجود بھی فراموشی کی گرد میں پوری طرح اَٹ چکا ہے؟''

پروفیسر پر اَشولال کا جملہ قیامت بن کر ٹوٹ پڑا۔وہ دانت پیس کر غرایا۔ہاتھ میں تھامے ہوئے موبائل فون پر گرفت غیر معمولی حد تک سخت ہو گئی۔اُسے دھیان ہی نہیں رہا اور کال منقطع کرنے والا

بٹن پش ہو گیا۔ٹوں ٹوں کی آواز کانوں میں پڑی تو حلق پھاڑ کر چیخا،''او...... ہائے...... میرا دُنیا میں کوئی نہیں۔ میری کوئی رباب نہیں، میری کوئی مریم نہیں، میں تنہا تھا اور ہمیشہ تنہا ہی رہوں گا۔ ارے ڈاکٹر! اوئے اَشو! کیوں گڑے مُردے اُکھاڑنے لگا ہے۔ کہہ دیا کہ سب مر گئے، کوئی باقی نہیں بچا۔ کسی کی یاد بھی زندہ نہیں رہی...... کیوں مجھے قبروں کے کتبے پڑھنے کا حکم دیتا ہے......''

فون کا بزر پھر بجا۔ اُس نے سکرین پر نظر دوڑائی۔ انگریزی کے حروف میں لکھا ہوا اُردو کا لفظ ''مرشد'' جگمگا رہا تھا۔ اُس نے دانت پیس کر کال اٹینڈ کرنے کے بجائے کینسل کر دی اور فون کو ٹراؤزر پر اُچھال دیا۔ تیز قدموں سے چلتا ہوا کچن میں آیا۔ فریج سے ٹھنڈا پانی نکال کر غٹا غٹ پینے لگا۔

اَشولال نے جو آگ لفظوں سے لگائی تھی، وہ ٹھنڈے پانی کے بس سے کہیں باہر تھی۔ وہ بے بسی سے کچن کے دروازے میں بیٹھ گیا۔ اُس کی حالت بہتر نہیں رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے اُس کی رگوں سے دو تین بلڈ بیگ نکال لئے ہوں۔ لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے بڑبڑایا،''مجھے اَشو سے رابطہ ہی نہیں رکھنا چاہیے تھا۔ وہ مجھے دُنیا کی طرف کھینچتا ہے، میں دُنیا سے دور رہنا چاہتا ہوں۔ ایسے آدمی کی دوستی مجھے کسی دِن بھٹکا دے گی۔ میں اِدھر کا رہوں گا، نہ اُدھر کا......''

ذہنی رو بھٹک کر دور تک چلی گئی۔ مریم کا خوبصورت چہرہ آنکھوں کے سامنے لہرانے لگا۔ وہی مریم جس نے تین ازدواجی مہینے گزار کر ایک شام میں جذبات بار آواز میں کہا تھا،''وسیم! تم قریب آتے ہو تو تمہارے بدن سے پھوٹنے والی مہک بے خود کرنے لگتی ہے۔ کام کے وقت میرے قریب نہ آیا کرو، کام میں حرج ہوتا ہے۔''

ہاں......اُسی مریم کا اَشولال نے نام لیا تھا جس نے جدا ہوتے ہوئے بڑے زہر بار لہجے میں کہا تھا،''مجھے اپنے وجود سے بھی گھن آنے لگتی ہے جب میں سوچتی ہوں کہ تم نے دو سال تک مجھے نوچا گھسوٹا ہے۔ تمہارے بدن سے اُٹھنے والی باسی مچھلیوں کی بساند ایسی بدبو جانے کتنا عرصہ میرے نتھنوں میں گھسی رہے گی......''

وہ ایلومینیم کے اینگل کی بنی ہوئی دہلیز کو تھام کر بدقّت تمام کھڑا ہوا۔ اچانک بڑھاپا عود کر آیا تھا۔

بدن کو گھسیٹتے ہوئے پانی میں اُترتی ہوئی سیڑھیوں تک آیا۔ رُکتی بارش کی آخری بوندوں کو جھٹک کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر پہلے سب کچھ اچھا لگ رہا تھا۔ اَب کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اُس نے ایک طویل سانس لی اور آنکھیں موند لیں۔ اچانک شکست کا احساس دماغ میں جاگزیں ہو گیا۔ سال بھر پیشتر اَشولال نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا تھا،''یہ غیر فطری تنہا پسندی حقیقت سے فرار کا راستہ ہے۔ خدا کو انسان سے بے حساب انس ہے۔ تم نے دیکھا کہ خدا نے کبھی بھی نسل در نسل آگے کی طرف بڑھتے ہوئے انسان کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ کہیں بھی انسان کے ارتقاء میں رکاوٹ کھڑی نہیں کی بلکہ لاکھوں مرتبہ اپنے قوانین میں ترمیم کی۔ انسان کے جدیدیت کی طرف بڑھتے قدموں کو روکنا آسان تھا۔ اپنے کہے پر کہنا مشکل تھا مگر وہ مشکل کام کرتا رہا۔ اگر اُسے انسان کا دوسرے انسان سے دور رہنا پسند تھا تو اُسے کوئی قاعدہ، کوئی لائحہ عمل یا قانون تیار کر کے نافذ کرنے کا کشٹ اُٹھانے کی کیا ضرورت تھی؟ ہر کوئی اپنی اپنی آگ جلا کر سینکتا رہتا۔''

اُس نے پوچھا تھا،''تو کیا اِن معاشرتی ناانصافیوں پر احتجاج بھی نہ کیا جائے؟''

''بھلے سئیں! اسمبلی سے احتجاجاً واک آؤٹ کرنے والے کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ اسمبلی میں رہ کر بحث کرنے اور فلاحی جستجو کرنے والے کچھ نہ کچھ کر لیتے ہیں۔ تم جنگلوں میں مت جاؤ، انسانوں کے جنگل میں پھول کھلانے کی کوشش کرو۔''

''نہیں مُرشد! یہ دُنیا ایسی ہرگز نہیں ہے کہ یہاں رہا جائے۔''

''یہ ایسی بھی نہیں کہ اِسے رَد کر دیا جائے۔''

''تو کیسی ہے؟''

''اپنے دامن میں فلاح اور ارتقاء کی لامتناہی گنجائش رکھنے والی دُنیا ہمارے رویوں کی از سرِ نو تعمیر کی منتظر ہے۔ ہمیں لوگوں کو احساس دلاتے رہنا چاہیے کہ محبت کی کلید کو پھینک دینے سے زندگی پر لگا قفل کبھی نہیں کھلے گا۔'' اشولال نے کہا تھا۔

اُس نے ایک بھی دلیل کو نہیں مانا تھا۔ دلیل کو دلیل سے جھٹلاتے ہوئے فاخرانہ انداز میں اُسے گھورتا رہا۔

پھر ایک مرتبہ اُس نے پروفیسر کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا تھا، ''محبت ہر ماحول، ہر مقام اور ہر عمر میں تقویت دینے والا جذبہ ہے۔تم یاد کرو۔اپنے والدین کی زندگی کی وہ تصویر جو تم نے گھر سے بھاگتے ہوئے اپنی چشمِ تصور میں بسائی تھی۔اپنے باپ کو سوچو۔کیا چاچا فقیرو کے تن پر کبھی پورا لباس ہوتا تھا؟ کیا اُسے کوئی 'فقیر صاحب' یا 'سر' کہہ کر پکارتا تھا؟ تم نے ہی بتلایا تھا کہ اُس کا پیٹ پچک کر کمر سے لگا رہتا تھا۔اپنی ماں کو سوچو۔کیا فضاں مائی تمہیں اپنی ڈھاک پر بیٹھا کر بیلے میں لکڑیاں چننے کیلئے نہیں جاتی تھی؟ تم نے بتلایا تھا کہ ڈھاک پر بیٹھنے سے ماں کی پسلیاں اور کولھے کی ہڈیاں تمہیں چبھتی رہتی تھیں...... کہو! کیا بغل میں دَبے ڈیڑھ دو سال کے بچے اور کالر میں جڑے گلاب کے پھول کے اوزان میں کوئی فرق نہیں ہوتا؟ کیا دونوں مسام مسام سے پسینہ نکال کر کمایا گیا بھوجن پہلے تمہارے منہ میں نہیں ڈالتے تھے؟...... کبھی سوچا کہ ایسا کیوں تھا؟''

وہ سر جھکائے بیٹھا رہا۔

ڈاکٹر اَشولال کی آواز جوش سے بھرانے لگی تھی، ''غربت سے بڑی کوئی بیماری نہیں۔یہ جان لیوا بیماری بھی محبت کے سرخ خلیوں کو نگل نہیں سکتی۔تمہارے علاوہ اُن کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی، پھر بھی دونوں تمام عمر اکٹھے رہے۔کیوں؟ انسان ایک جوتے کو تمام عمر پہن نہیں سکتا۔ایک لباس کو مسلسل پہن کر سال بھر میں ہی اکتا جاتا ہے۔پھر وہ کیا احساس ہے کہ انسان پچاس سال تک ایک ہی عورت یا ایک ہی مرد کے لمس پر گزار دیتا ہے اور اکتاتا نہیں، اوبھتا نہیں۔بھلے حقیقت سے آنکھیں چراؤ مگر تمہیں ماننا پڑے گا کہ محبت ہی انسانوں کو ایک دوسرے کے قریب لاتی ہے۔اِسی جذبے کی پرورش کو مختلف عبادات کی شکل میں حکم بنا کر اُتارا گیا ہے۔''

وہ اِس لاحاصل گفت گو سے اکتایا بیٹھا تھا۔بولا، ''مُرشد! یہ روزِ اول سے غلطیوں پر غلطیاں کرنے والا جانور ہے، نہ کبھی سدھرا ہے، نہ سدھرے گا۔میں خوش قسمت ہوں کہ مجھے اِس ماحول سے نکلنے کا موقع مل رہا ہے۔تم اگر ان بے وفاؤں میں رہنا چاہتے ہو تو بھلے رہو، مجھے نہ روکو۔''

''ٹھیک ہے سئیں! میں تجھے کیسے روک سکتا ہوں۔جاؤ، شوق سے دُنیا کو ٹھکراؤ مگر یہ دھیان رکھنا کہ تم محض دو عورتوں کی بے وفائی پر اِس محبت بھری دُنیا کو موردِ الزام ٹھہرا رہے ہو۔وہ اپنی سیماب

فطرت سمیت تمہارے اندر تک گھسی ہوئی ہیں۔ جیسے مریم کا دُکھ رُباب نے غلط کیا تھا، ایسے ہی کوئی تیسری عورت تمہیں سہارا دے گی۔ قدرت کے اِس حقیقی حسن سے آنکھیں چراؤ گے تو یہ درد کا احساس بن کر تمہارے ذہن میں نقش ہو جائے گا۔ جتنا جھٹکو گے، اتنا ہی قریب آ کر سلگانے لگے گا۔ جاؤ میرے دوست! جاؤ میرے یار! بے اصول دُنیا کو جھٹلانے والا بااصول پروفیسر اتنا باظرف ضرور ثابت ہوگا کہ جب بھی میرے دعوؤں کے سامنے ہار جائے گا، اعتراف کرنے کیلئے چلا آئے گا۔ سوہنے رَب سائیں دے حوالے میڈا سئیں!''

بارش رُکنے کے بعد ہوا میں خنکی کا تناسب زیادہ ہوگیا۔ اُس پر ہلکی سی کپکپی طاری ہونے لگی۔ سورج نے کسی طرف سے کنی نکالی تھی۔ کہیں چھاؤں، کہیں دھوپ...... یہ امتزاج عام دِنوں میں اُسے بھلا لگتا تھا۔ آج غیر اہم ہوگیا تھا۔ کچن میں آ کر چائے بنانے لگا۔ ایسے میں رُباب یاد آ گئی۔ چائے والا ڈِبہ ہاتھ میں تھامے کا تھامارہ گیا۔ بے دھیانی میں اُس نے چمچ واپس ڈِبے میں رکھ دیا۔

رُباب چائے بناتے وقت چائے کی پتی پہلے ہتھیلی پر ڈالتی تھی۔ بہ غور کچھ دیکھتی تھی۔ ہونٹ سکیڑ کر بڑبڑایا کرتی تھی، ''ہر شئے میں ملاوٹ، ہر شئے ناخالص......شاید زہر پینے والا نچ نکلنے پر یہی کہنے پر مجبور ہوگا۔''

پھر اِسی انداز میں چینی کو ہتھیلی پر انڈیلتی، کچھ دیکھ کر، کچھ چُن کر کیتلی میں ڈال دیتی۔ کبھی کبھی ہتھیلی گیلی ہوتی تو چینی کے ذرات چپک کر کیتلی میں گرنے سے بچ جاتے۔ اس باقی ماندہ چینی کو بڑی تیزی سے زبان سے چاٹ کر نگل جاتی۔ ایسے میں پروفیسر اُسے ڈانٹ دیتا، ''رَبو! یہ کیا بچوں جیسی حرکتیں کرنے لگتی ہو؟''

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑتی۔ چھیڑنے کیلئے کہتی، ''آپ قدم قدم پر اتنے پیار سے ڈانٹتے ہیں، سمجھاتے ہیں کہ جی کرتا ہے کہ میں تمام عمریوں ہی بچی بنی رہوں۔''

ہمیشہ کیلئے چھوڑ کر جاتے ہوئے چیخی تھی، ''تم نے زندگی میں سوائے مجھے نفرت سے ڈانٹنے اور جھڑکنے کے کیا ہی کیا ہے؟''

اُس نے بے دھیانی میں چائے کی پتی ہتھیلی پر انڈیل دی۔ پہلی مرتبہ پتہ چلا کہ رُباب کی پُرگداز

اور سپید ہتھیلی پر پتی نظروں کو کتنی بھلی لگتی تھی۔ یہ بھی یاد آیا کہ پتی کو ہر مرتبہ بہ غور دیکھنے والی نے کبھی بھی اُس میں سے کچھ نکال کر باہر نہیں پھینکا تھا۔ وہ عادتاً ایسا کرتی تھی، ضرورتاً نہیں۔ اُس نے بالکل اُسی کے انداز میں کیتلی میں پتی پھینک دی۔

چائے پی لینے تک رُباب کے بارے میں سوچتا رہا۔ سر جھٹک کر اسٹڈی روم میں آ گیا۔ کمپیوٹر آن کیا۔ ایسے میں خیال سوجھا کہ کوئی نئی فلم ہی اُسے موجودہ کیفیت سے نکال سکے گی۔ آرٹ فلمیں دیکھنے کا دلدادہ تھا۔ پہلی سی ڈی لگا کر بیٹھ گیا۔ اُس کی توقع کے مطابق چند ہی منٹوں میں اُسے اَشولال کے طعنے بھول گئے، مریم اور رُباب کے چہرے محو ہو گئے اور وہ پرسکون ہو گیا۔

پہلی سی ڈی ختم ہونے سے پہلے ہی وہ گہری نیند سو گیا۔ شام تک سویا رہا۔ جاگا تو دماغ بھاری بھاری محسوس ہوا۔ باتھ روم میں جا کر کافی دیر تک شاور لیتا رہا۔ نکلا تو بالکل فریش تھا۔ کنٹرول روم میں آ کر جنت کو روشن کرنا چاہتا تھا کہ اچانک خیال آیا۔ بارش کے باعث اطراف کی زمین سے نکلنے والے پروانے وہاں جمع ہو جائیں گے۔ پروانوں کا اجتماع اُسے شروع سے ہی کوفت میں مبتلا کر دیتا تھا۔ عقبی بالکونی میں آ کر کرسی میں بیٹھ گیا۔ سیگرٹ سلگا کر گہرے گہرے کش لینے لگا۔

تمام عمر ایک لگے بندھے معمول میں بغیر خواہش کے کولہو کے بیل کی طرح جتا رہا تھا۔ آزادی کا پہلی مرتبہ احساس پا کر اترانے لگا تھا۔ جب پڑھتا تھا تب علی الصبح اُٹھ کر منہ اندھیرے جنرل بس اسٹینڈ پر جاتا۔ وہاں کچھ دیر انتظار کرتا۔ ایک معروف ٹرانسپورٹ کمپنی کا پکا ٹائم اُس کی روزی کا سامان لے کر آیا کرتا تھا۔ کچھ منٹ اوپر نیچے چھ بجے وہ بس کی چھت پر سے اخبارات کا بنڈل اتارتا۔ سائیکل پر لاد کر متعلقہ نیوز ایجنسی پر جاتا۔ جہاں سے سائیکل کے اگلے کیریئر میں اخبار رکھتا اور شہر میں بانٹنے کیلئے نکل کھڑا ہوتا۔ ایک گھنٹے میں وہ اتنی جان ماری کر لیتا تھا کہ شام تک گھٹنے اور کمر دکھتی رہتی تھی۔ آخری اخبار اپنے کالج کے اسٹاف روم میں رکھتا اور سائیکل اسٹینڈ میں کھڑی کر کے کلاس روم میں چلا جاتا جہاں دن بھر اپنے ہم عمروں کے مذاق کا نشانہ بنتا مگر اپنے ہر استاد کی نظر میں ترجیح کا اہل ٹھہرتا۔

کالج سے تین بجے فارغ ہوتا اور سیدھا ایک پبلک کال آفس پر پہنچ جاتا جہاں اُس کی ڈیوٹی

رات گئے تک جاری رہتی۔

اُسے دیپک چند یاد آیا۔ دل میں دکھ کی کسک جاگ پڑی۔ جب سندھ ساگر کے کنارے سرکنڈوں کے بنے ہوئے بڑے سے جھونپڑے کو خیر باد کہہ کر شہر میں بھٹکنے کیلئے پہنچا تھا تو سب سے پہلے ملنے والا دیپک چند ہی تھا جو صدر بازار میں کریانہ کی چھوٹی سی دکان چلا کر اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالا کرتا تھا۔ پھٹے پرانے چولے میں ملبوس سیمو کو دیکھ کر اُس نے اپنے پاس بلا لیا۔ پوچھا، ''اللہ کے نام پر مانگتے ہو یا رام کے نام پر؟''

وہ تمام دِن بھوکا پیاسا رہا تھا۔ سوال کے جواب میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ بتلانے لگا کہ وہ نہ تو اللہ کو جانتا ہے، نہ رام کو، وہ تو فقط اُس آگ کو جانتا ہے جو انتڑیوں اور معدے میں جل اُٹھی ہے۔ دیپک چند نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ سمجھ گیا کہ وہ بھکاری نہیں، گھر سے بھاگا ہوُا ہے اور اُسے کسی نے بھی کام پر نہیں رکھا۔ دیپک چند کی دکان پر اُسے شہر میں پہلا نوالہ ملا۔ یہ نوالہ میٹرک پاس کرنے تک اُس کے حلق میں اُترتا رہا۔ دیپک چند نے اُسے اپنی دکان پر رکھ لیا۔ رات کو اپنے ساتھ گھر لے جاتا۔ جانے کیسے اُس کے دل میں جذبہ ہمدردی بھر گیا اور اُس نے سیمو کو وسیم کا نام دے کر سکول میں داخل کرادیا۔ سکول کے پہلے استاد نے اُس سے پوچھا،''تم مسلمان ہو یا ہندو؟''

اُس نے گھبرا کر دیپک چند کی طرف مددطلب نظروں سے دیکھا۔

دیپک چند نے گلا کھنکار کر کہا،''ماسٹر جی! یہ نہیں جانتا، میں بھی نہیں جانتا۔ بس ایک نشانی دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا ہے کہ یہ کسی مسلمان گھر کا بَال ہے۔''

اُس نے نشانی بتلائی۔ ماسٹر جی نے سر ہلا کر داخلہ رجسٹر میں اُس کا نام محمد وسیم لکھ دیا۔ قوم پوچھنے پر بھی وہ کچھ بتلا نہ پایا۔ ماسٹر بلوچوں کے قبیلہ بزدار سے تعلق رکھتا تھا۔ اُس نے ذات کے خانے میں بزدار لکھ دیا۔ یوں وہ مُہانوں کا لباس اُتار کر بلوچوں کی پگڑی پہن کر جون بدلنے میں کامیاب ہو گیا۔ اگر اُس دن اُسے مُہانہ لکھ دیا جاتا تو تمام عمر لوگوں کی تضحیک آمیز نگاہوں کا نشانہ بنتا رہتا۔

دیپک چند اُسے پڑھاتا رہا، گھر اور دکان پر کام لیتا رہا۔ اُس نے امیر نہ ہونے کے باوجود اپنا حق ادا کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔ وہ فطرتاً عظیم انسان تھا۔ چاہتا تو بڑی آسانی سے وسیم کو اپنے مذہب

کی چھتری تلے بیٹھا دیتا مگر وہ وسیم کو ہر صبح مسجد میں قرآن کا سبق لینے کیلئے بھیج دیتا تھا۔ پھر اپنے ہم جماعتوں اور محلے دار لڑکوں کی غیر معمولی اور مسلسل تضحیک کے زخم ناپختہ بدن پر جمع کرتے ہوئے جب اُس نے میٹرک کا امتحان پاس کرلیا تب دیپک چند نے اُسے سمجھایا،"کالج کی پڑھائی کا خرچہ شاید مجھ سے اُٹھایا نہیں جاسکے گا۔تم ایسا کرو کہ کالج سے واپس آنے سے پہلے سائیکل پر اخبارات پھینکا کرو۔کچھ نہ کچھ رقم وہاں سے حاصل ہوجائے گی۔یوں تمہارا گزارا چلتا رہے گا۔"

اُس نے فوری طور پر نیوز ایجنٹ کی ڈیوٹی سنبھال لی۔شاید ایسے ہی سب کچھ ٹھیک ٹھاک انداز میں چلتا رہتا مگر اُس کے اندر کروٹیں بدلنے والا انسان انگڑائی لے کر بیدار ہوگیا۔دیپک چند کی بیٹی سموں نے ٹھہرے ہوئے پانی میں پیار کا پہلا پتھر پھینک کر اُسے بھٹکا دیا۔سانولی سلونی سی سموں کا لڑکپن خاموش رہا تھا، جوانی بولنے کا ہنر سیکھ کر کچھ زیادہ ہی خطرناک ہوگئی۔

دو کمروں والے چھوٹے سے پرانی طرز کے مکان میں دو جوانیاں ٹکرائیں تو چوری چھپے دیکھنے سے بات بڑھتے ہوئے وصل کی چوریوں پر کمر بستہ ہوگئی۔دونوں ناسمجھ عاشق ثابت ہوئے۔عشق کے پہلے مہینے میں ہی اپنا راز فاش کر بیٹھے۔دیپک چند کو پتہ چلا تو اُس نے سموں اور وسیم کو جی بھر کر پیٹا۔سموں کی پڑھائی روک دی۔

وہ زندگی کی پہلی جذباتی شکست وریخت کا شکار ہوکر اپنے محسن کے قدموں میں گر گیا اور تڑپ تڑپ کر فریاد کی۔بڑے خشوع سے اپنا آپ پیش کرتے ہوئے سموں کا ہاتھ مانگا۔اُس نے تو یہ تک کہہ دیا تھا کہ سموں اپنے مذہب پر کاربند رہے گی، وہ اپنے مذہب پر قائم رہے گا مگر دیپک چند کو اُس سے جتنی محبت تھی، اُتنی ہی نفرت ہوگئی تھی۔

ندامت سے سر جھکائے کھڑے وسیم کو اُس نے کہا،"میرا بیٹا نہیں تھا، بھگوان کی کرپا رہی کہ اُس نے دیا ہی نہیں۔اگر دیتا اور وہ تم جیسا پاپی نکلتا تو میں جیتے جی مرجاتا۔تمہارے لئے بس یہی بہتر ہوگا کہ آئندہ مجھے اپنی منحوس شکل نہ دکھانا۔"

اُسے اپنا ادا کیا ہوا ایک ایک حرف یاد تھا جو اُس نے گھر سے نکلتے ہوئے دہلیز پر رکھا تھا،"اے باپ بن کر پالنے والے! سُن...... میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔لوگوں نے

ناروا رویے سے میرے تن بدن میں تضحیک اور نفرت بھری، تم نے محبت کا یوں عملی درس دیا کہ میری رَگ رگ میں محبت بھر گئی ہے۔ تمہاری محبت نے تو مجھے زندگی بھر اپنی اصل کی جانب پلٹنے کی مہلت بھی نہیں دی۔ جب تک بچہ تھا، سموں کو بھائی بن کر پیار کرتا رہا۔ جب لڑکپن میں آیا تو پَل پَل حیا اُس کے کچے پکے وجود میں بھرتا رہا۔ جوانی نے قدم بہکا دیے۔ سمجھا دیا کہ دُنیا کی سب سے سچی محبت یہ ہے، میں اُس کے بہلاوے میں آ گیا۔ کیا یہ اتنا بڑا جرم ہے کہ پیروں میں گر کر معافی مانگنے اور رو رو کر توبہ کرنے سے بھی نہیں دُھلتا؟ اگر ایسا ہے تو مجھے نمک حرامی کے طعنے دینے کے بجائے اپنے ہاتھ سے موت کے گھاٹ اُتار دے۔ میرا تمہارے سوا کوئی بھی نہیں جو میرے قتل کا حساب مانگنے کیلئے تمہارے پاس آئے گا۔''

دیپک چند کا غصہ فرو نہ ہوا۔ وہ اُس سچے اور بے لوث ہمدرد کے گھر سے یوں نکلا جیسے کسی حرماں نصیب کے گھر سے جنازہ اُٹھتا ہے۔ اُس نے کالج کو خیر باد کہنے کا ارادہ کیا مگر اُس کی خوش قسمتی کہ انہی دنوں پی ٹی سی کی کلاسز میں داخلہ شروع تھا۔ اُس نے اخبارات کی ترسیل اور پی سی او کی ملازمت جاری رکھتے ہوئے ایلیمنٹری کالج میں داخلہ لے لیا۔ اِنہی دنوں اُسے پتہ چلا کہ سموں کو اپنی جاتی کے ایک اٹھائیس سالہ تنومند جوان سے بیاہ دیا گیا۔ وہ روتی سسکتی گھر، محلہ اور شہر چھوڑ کر دوسرے ضلع میں چلی گئی۔

کورس کرنے کے چھ ماہ بعد اُسے شہر کے ایک مضافاتی گاؤں میں پی ٹی سی ٹیچر کی سرکاری نوکری میسر آ گئی۔ وہ مٹھائی کا ڈِبہ لے کر دیپک چند کی دکان پر گیا۔ وہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ دیپک چند دکان اور مکان بیچ کر اپنی اکلوتی بیٹی سموں کے شہر میں ہمیشہ کیلئے جا چکا تھا۔

تنگ اور پُر ہجوم صدر بازار کے بیچوں بیچ مٹھائی والا ڈبہ ہاتھوں میں تھامے عجیب سی کیفیت میں کھڑا تھا۔ دیپک چند چلا گیا، کس شخص کو اپنی خوشی میں شریک کرے۔ ایسے میں پہلی مرتبہ ماں اور باپ کی یاد آئی۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ قدم اُٹھ گئے، سر جھک گیا۔ لاری اَڈے پر آیا۔ ماں، فضاں مائی کے پاس لے جانے والی کھٹارا سی بس پر بیٹھ گیا۔ بس نے اُسے ماں کے جھونپڑے سے ایک میل کے فاصلے پر اتار دیا۔ وہ ڈِبہ دونوں ہاتھوں میں تھامے پیدل ناک کی سیدھ میں چل پڑا۔

اتنے سالوں کے بعد بھی اُسے یہ راستہ دیکھا بھالا لگ رہا تھا۔ اِسی راستے کی اخیر پر دریا کی کندھی پر کسی ناتواں بوڑھے کی طرح کندھے جھکائے ایستادہ جھونپڑا دکھائی دے رہا تھا جہاں اُس کی ماں موجود تھی۔ دھڑکتے دِل کے ساتھ جب قریب پہنچا تو ایک بوڑھی عورت کو سرکنڈوں سے نکلتے دیکھا۔ رُک گیا۔ سیاہ فام بڑھیا قریب آ کر آنکھوں پر ہاتھ کا چھجا بنا کر دیکھتے ہوئے سرائیکی زبان میں دریافت کرنے لگی کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ کس سے ملنا چاہتا ہے؟

اُس نے غور سے بڑھیا کو دیکھا۔ وہ یقیناً اُس کی ماں نہیں تھی۔ ماں ہوتی تو پوچھے بنا ہی پہچان جاتی یا اُسے دیکھ کر دل بے قابو ہونے لگتا۔ کچھ بھی نہیں ہوُا تو وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولا،''میں محمد وسیم......اوہ! نہیں، سیمو ہوں۔ فقیرے مُہانے کا پتر!''

بُڈھی اور نزدیک آ گئی۔ بڑے غور سے دیکھتے ہوئے چیخی،''اڑے! تیکوں موئیاں تاں مدلنگھی، توں ہُن کتھوں نکھتا اِیں بھاگ سڑا؟''

(ارے! تجھے مرے ہوئے مدت گزر گئی ہے۔ بدبخت! تو اَب کہاں سے نکل آیا ہے؟)

وہ جواب دینے کے بجائے سسک پڑا۔ بڈھی نے سینے سے لگا لیا۔ وہ بھی ہچکیاں لیتے ہوئے رونے لگی۔ روتے ہوئے بتلانے لگی،''وے مویا نانگ آ! توں جتھوں آئیاں اِیں، اُتھائیں وَل وَنج......اِتھاں تیڈا کوئی بھاگ وندجیندا نئیں بچیا......''

(تو جہاں سے آیا ہے، وہیں لوٹ جا۔ یہاں تیرا کوئی بھی والی وارث زندہ نہیں رہا۔)

اُس کے استفسار پر بڈھی نے بتلایا کہ تین سال پہلے یہاں گردن توڑ بخار کی وباء پھوٹ پڑی تھی جس نے فقیرو مُہانے اور فضاں مائی سمیت بیسیوں سندھ واسیوں کو نگل لیا تھا۔ اُس نے یہ بھی بتلایا کہ فضاں آخری سانس تک ''سیمو، سیمو'' کا راگ الاپتی رہی تھی۔ وہ اُس کی معیت میں جھونپڑے کے اندر آیا۔ جہاں اُس کی ماں کا سرکنڈوں کا بناہوُا بستر بچھا ہوتا تھا، وہاں اَب برابر میں دو قبریں بنی ہوئی تھی۔

بڈھی جس نے اپنا نام حیاتاں بتلایا تھا، نے میلی چادر سے اپنے بوڑھے آنسو پونچھتے ہوئے کہا، ''میڈا پُتر! تیڈے ماء پیو اِتھاہیں سُتے لاتھِن، میکوں پک کائے نی جو کیہڑا کیں قبرء چ لاتھاے،

رَب سوہنا سچیاں جانے......''

(بیٹے! تمہارے ماں باپ اِنہی قبروں میں دفن ہیں۔کون کس قبر میں ہے، میں نہیں جانتی، رَب ہی جانتا ہے کہ حقیقت کیا ہے؟)

وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح دونوں قبروں کے بیچ تھوڑی سی خالی جگہ پر اوندھے منہ گر گیا۔مٹھائی کا ڈِبہ پچک گیا۔رَس گلوں کا شیرہ غمزدہ بیٹے کے آنسوؤں کی طرح بہنے لگا۔جانے کتنی دیر گزر گئی، کبھی ایک قبر پر روتا، کبھی دوسری پر۔اُسے شام گزرنے کا، رات ڈھلنے کا کچھ پتہ نہیں تھا۔بڑھی کے دم توڑتے دلاسوں نے بھی کوئی پُرسہ نہیں دیا۔رات کے جانے کس پہر بڑھی کا جواں سال سیاہ فام بیٹا کمر پر مچھلیاں پکڑنے والا جال لادے جھونپڑے میں آیا۔بڑھی حیاتاں نے اُسے بتلایا کہ لاوارث قبروں کو سنبھالنے والا آن پہنچا ہے۔

اُس نے وسیم کو سنبھالا دیا۔سمجھایا کہ جانے والے چلے گئے ہیں، رہ جانے والوں نے بھی ایک دِن چلے جانا ہے۔ایسے میں غم کیسا؟

وہ دونوں قبروں کے بیچ میں کھڑا ہو گیا۔سرسوں کے تیل کے بھرے پیالے والی بتی کی لرزتی ہوئی روشنی میں اُس کا چہرہ غم واندوہ کی اَن مٹ تصویر بنا ہوا تھا۔ہونٹوں کے دونوں گوشوں سے رالیں بہہ کر گردن بھگو رہی تھیں۔چونکہ آنسوؤں نے پورا چہرہ تَر کر دیا تھا، اِس لئے منہ کے بل اوندھا لیٹنے سے چکنی مٹی چہرے پر جابہ جا چمٹی ہوئی تھی۔بال خاک وخس آلود تھے۔گلوگیر آواز میں بولا،''اماں! ہائے میری اماں! تو نے کیوں مجھے گھر سے نکال کر شہر بھیجا تھا۔کیوں مجھے کہا تھا کہ یہاں رہے گا تو تمام عمر کشتیاں کھینے میں گزر جائے گی۔یہاں رہے گا تو مچھلیوں کی مہک خون میں رَچ بس جائے گی۔ یہاں رہے گا تو کچے کے بلوچوں کی جھڑکیاں مقدر کا حصہ بن جائیں گی۔''

بڑھی کے بیٹے نے تسلی دینے کیلئے اُسے گلے سے لگا کر زور سے بھینچا۔چہرے پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔سیاہ فام کے بدن سے وہی مخصوص بو پھوٹ رہی تھی جو اُس کے باپ اور ماں کے بدنوں میں رَچی بسی تھی۔وہ اچانک بلند آواز میں چیخ پڑا،''دیکھ ماں! اِس کے بدن سے بھی وہی مہک پھوٹ رہی ہے مگر کیا اِس نے اپنی ممتا کو اِس پر قربان کرنے کا جرم کیا ہے؟ نہیں۔یہ دُنیا کا خوش قسمت

انسان ہے کیوں کہ اِس کی ماں اِس کو دکھائی دیتی رہتی ہے۔ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ میں مُہانہ نہیں رہا، میں مہانوں کی نظر میں بڑا آدمی بن گیا ہوں مگر مجھے اپنے آپ سے گھن آنے لگی ہے۔ ایسی گھن جس سے مچھلیوں کی بو بھلی تھی۔''

اُس نے یکبارگی سے بڈھی کے بیٹے کو دھکا دیا۔ وہ پشت کے بل پیچھے گر گیا۔ خوف اور ترحم کے ملے جلے تاثرات اُس کے چہرے پر ثبت ہو گئے۔ وسیم لہرا کر پھر قبروں کے بیچ میں گر گیا۔ ایک ہاتھ ایک قبر پر، دوسرا ہاتھ دوسری قبر پر...... ہچکیاں لے کر روتے ہوئے بلند آواز میں بڑبڑانے لگا، ''ہائے میری اماں! میں نہیں جانتا کہ تم کس طرف لیٹی ہوئی ہو، دائیں یا بائیں؟ مگر تم جہاں بھی ہو، سن لو کہ میں تمھیں خوش خبری سنانے کیلئے آیا ہوں کہ میں اُستاد بن گیا ہوں۔ جس کا باپ دو چار مچھلیوں کے وزن کا حساب نہیں کر سکتا تھا وہ قوم کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے پر مامور ہو گیا ہے۔ اماں! بڑی نصیبے والی نکلی ہو۔ تم نے جو چاہا تھا، وہ ہو گیا مگر میں نے جو چاہا تھا، وہ نہیں ہوا۔''

وہ بہت کچھ کہتا رہا۔ کچھ سمجھ میں آتا تھا، کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ بڈھی نے پیار سے کھانا کھلایا، دلاسہ دیا اور سمجھایا کہ فضاں مائی کی روح کو اُس وقت سکون نصیب ہوگا جب تم بہت بڑے آدمی بن کر زمین کے سینے پر نخرے سے گھوما کرو گے۔ زمین کسی پیغام کو اپنے پاس نہیں رکھتی، متعلقین تک پہنچا دیتی ہے۔

وہ اگلے دِن لوٹ آیا۔ نوکری کا سلسلہ چل نکلا۔ اُن دِنوں ٹیوشن پڑھانے کا رواج نسبتاً کم تھا جس کی وجہ سے اُس نے اخبار تقسیم کرنے والی نوکری کو ترک نہیں کیا۔ کچھ ہی عرصے میں اُس کی معاشی حالت کافی بہتر ہو گئی۔ ہر ماہ سرکاری خزانے سے ملنے والی تنخواہ صاف بچ جایا کرتی تھی۔ اِنہیں دِنوں اُس کے ایک ساتھی ٹیچر نے شہر کے مضافات میں موجود اپنی زمین بیچنے کا ارادہ کیا۔ وسیم کو پتہ چلا تو اُس نے اپنی پہنچ کے مطابق ایک ایکڑ زمین خرید لی۔ کچھ رقم ادا کر دی، کچھ قسطوں میں دینے کا وعدہ کر لیا۔ قسطیں چکتا ہونے پر اُس نے تمام ساتھی استادوں کو مٹھائی کھلائی۔ اِس خوشی میں کہ وہ دُنیا کا حصہ دار بن گیا ہے۔

چند دِنوں کے بعد ایک اور ٹیچر نے اپنی دکان بیچنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ یہ دکان شہر میں واقع تھی۔ وسیم

کے پاس نقد رقم نہیں تھی مگر اُس نے رِسک لینے کا ارادہ کر لیا۔ جی پی فنڈ کی رقم نکلوائی، کچھ ساتھیوں سے اکٹھی کی اور یوں سودا کر لیا۔ آدھی رقم فروخت کنندہ کو مل چکی تھی، بقیہ نصف رقم بھی اُسے سال بھر میں مل گئی اور یوں اُس کی ماہانہ آمدنی میں دکان کا کرایہ بھی شامل ہونے لگا۔

بے حد مصروفیت کے باوجود اُس نے اپنی تعلیم کا سلسلہ بحال رکھا۔ پرائیویٹ طالب علم کی حیثیت سے اُس نے چھ برسوں میں ماسٹر ڈگری حاصل کر لی۔ اُسے یہ اعتراف تھا کہ تعلیم کے اِس سلسلہ وار حصول میں جہاں اُس کی انتھک محنت کا مرکزی کردار تھا وہاں مریم کو حاصل کرنے کی لگن بھی تحریک بن کر ذہن میں رَچ بس گئی تھی۔

مریم کون تھی؟...... جان لیوا حسن کا سینہ سپر شاہکار جو دل کی دھڑکن کو مہمیز کر کے سانس کے رستے میں تن کر بیٹھ گیا تھا۔

اچانک ایک مَلھی مچھلی نے سطحِ آب پر آ کر اپنی دُم کو زور سے پانی پر مارا۔ ''چھپ'' کی زوردار آواز نے پروفیسر کے انہماک کو توڑ دیا۔ آنکھیں کھول کر اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اندازہ ہؤا کہ اُسے یہاں بیٹھے بہت دیر گزر چکی ہے۔

گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اُٹھا۔ سگرٹ کیس اور لائٹر اُٹھایا اور نیم مردہ قدموں سے چلتا ہؤا بیڈ روم کی طرف بڑھ گیا۔ بڑبڑاتا جاتا تھا، ''میرے مُرشد! تم نے اچھا نہیں کیا...... تم نے ہرگز اچھا نہیں کیا۔ سوئے مردوں کو جگانے سے قبریں پھٹنے لگتی ہیں۔ دیکھنے والے ڈر کے مارے بھاگنے لگتے ہیں۔ تم نے ہرگز اچھا نہیں کیا...... پَر تجھے کون سمجھائے، تجھے کون روکے؟ دِل تجھے مرشد مانتا ہے مگر تم روح کو کچوکے لگا کر اپنی بلند مسند کے پائیوں پر آری چلانے لگتے ہو...... ہائے! کون تجھے سمجھائے؟''

اُسے آپوں آپ ہی یاد آیا کہ مُرشد، اَشولال، اکثر کہا کرتا تھا کہ سمجھانے والے نے براہِ راست سمجھانے کا عمل صدیوں پہلے مکمل کر دیا تھا۔ اَب وہ بالواسطہ طور پر سمجھاتا ہے مگر عام انسان اِس سمجھائے ہوئے کو تقدیر کی ٹھوکر سمجھ کر رَد کر دیتا ہے۔

پروفیسر وسیم بزدار کی بدقسمتی یہاں سے شروع ہوتی تھی کہ وہ اَشولال کو دل سے چاہنے اور مُرشد ماننے کے باوجود مانتا نہیں تھا۔ اُس کی باتوں کو کتابی اور نظریاتی جھوٹ قرار دے کر جھٹلا دیتا تھا۔ اَشو

بہ صد کوشش اُسے سمجھانے میں بُری طرح ناکام ثابت ہوا تھا۔

...۞...

دونوں اپنے پوڈو کی کشتی کے پاس بیٹھے تھے جب قسمت کی ماما نے کھڑکی سے جھانک کر آواز دی، ''قسمت بیٹا! آندھی آرہی ہے، جلدی سے گھر آجاؤ۔''

دوسری کھڑکی میں شناں کھڑی ہنس کو پکار رہی تھی، ''ہنس! ارے او ہنس! گھر آجاؤ۔ زور کی آندھی چلنے والی ہے۔''

دونوں ہاتھ جھاڑ کر کھڑے ہو گئے۔ ہاتھ سے ہاتھ ملایا۔ ایک دوسرے کو دیکھا اور اپنی اپنی راہ ہو لئے۔ چند قدم ہی چلے تھے کہ قسمت نے آواز دی، ''ہنس! میرے ساتھ آجاؤ، دونوں وہیں بیٹھ کر کھیلیں گے۔''

ہنس رُک گیا۔ عقب سے آواز آئی، ''کم آن ہنس بیٹا! دیر مت کرو ورنہ مٹی سے بھر جاؤ گے۔''

ننھا سا دماغ ہل چل پکڑنے لگا۔ ماما کا حکم مانے یا قسمت کے قدموں پر چل پڑے۔ ایسے میں پہلی سیاست لبوں سے پھوٹی، ''ماما! مجھے قسمت بلا رہی ہے۔ وہ اکیلی ہے۔ کہتی ہے مجھے ڈر لگتا ہے۔''

قسمت نے ننھے ننھے ہاتھوں کا بھونپو بنایا، چیخی، ''آنٹی! آندھی رُکنے پر ہم دونوں آپ کے پاس آجائیں گے۔''

شناں کے لبوں پر مسکراہٹ تیر گئی۔

''ماما! آج فینی کو مدھو نے پروپوز کرنا ہے، میرا قسمت کے ساتھ جانا ضروری ہے۔'' ہنس نے کہا، ''کیا میں جاؤں ماما؟''

شناں نے سر ہلا کر اجازت دے دی۔ وہ بھاگ کر قسمت کے پاس پہنچا اور دونوں ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے تیز تیز قدموں سے کوارٹر میں گھستے چلے گئے۔

قسمت کی ماما نے دونوں کیلئے روح افزاء کا شربت تیار کیا۔ پلانے کیلئے اُن کے کمرے میں گئی، قسمت کو کاپی پر جھک کر کچھ لکھتے دیکھ کر ہنس کر پوچھنے لگی، ''میرا بیٹا کیا لکھ رہا ہے؟''

کاپی پر جھک کر دیکھا۔لیڈ پنسل کے ساتھ ٹیڑھے میڑھے لفظوں میں قسمت نے لکھا تھا،''ڈیئر فینی! میں تمہارا بھائی......''

اُس نے زیرلب پڑھا۔قسمت نے فوراً ہی کاپی پر ہاتھ رکھ دیا اور غصے سے بولی،''ماما! آپ کو نہیں پتہ کہ کسی کا خط نہیں پڑھتے؟''

ماما نے شرمندگی سے کہا،''اچھا بابا! غلطی ہوگئی،معافی دے دو۔''

اُس نے ہنکارا بھرا اور شربت کا گلاس تھام کر سیدھی ہو بیٹھی۔

''تمہاری فینی کے فرینڈ نے اُسے پروپوز کر دیا ہے؟''

''نہیں ماما۔ابھی نہیں کیا۔لگتا ہے وہ مجھ سے مار کھائے گا تب پیاری سی فینی کو پروپوز کرے گا۔'' وہ خفگی سے بولی۔

''فینی کا بھائی کیا کر رہا ہے؟'' ماما نے پوچھا۔

بولی،''ماما! فینی کے بھائی نے ایک فرینڈ بنائی ہے۔اپنی بہن کو خط لکھ کر بتانے لگا تھا کہ آپ آ گئیں۔اَب آپ کے سامنے تو بے چارہ خط نہیں لکھ سکتا ناں!''

ایسے ہی وقت میں آندھی کا شور کوارٹر کے اندرونی کمروں تک پہنچ گیا۔ماما جلدی سے دروازے بند کرنے کیلئے کمرے سے نکل گئی جبکہ قسمت پھر کاپی پر جھک گئی۔

ہنس قسمت کے لکھے کو پڑھنے کی کوشش میں جُت گیا۔

...❁...

محبت عجیب کسک ہوتی ہے۔کبھی چبھتی ہے،کبھی شرمانے اور کبھی گدگدا کر بے سبب ہنسنے پر مجبور کر دیتی ہے۔وہ تنہائی کی لمبی رات کے شکنجے میں اپنے ہی پیروں کے لمس کو محسوس کرتے ہوئے کبھی مسکرا رہی تھی،کبھی کروٹ کروٹ لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔

گزشتہ شام میں روزینہ نے چھیڑتے ہوئے کہا تھا،''مصباح! تم بہت چالاک ہو۔''

وہ دانت پیس کر بولی،''یہ تمہیں کس نے بتا دیا؟''

''کسی دُشمن نے کہا ہے مگر کہا بالکل ٹھیک ہے کیونکہ تم بڑی معصومیت کے ساتھ ایک تیر سے دو شکار کر رہی ہو۔''

''وہ کیسے؟'' وہ چونکی۔

''شہاب خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ بہت امیر اور با اختیار باپ کا بیٹا ہے۔ وہ مستقبل کا ضلعی ناظم ہے۔ تم ایک آدمی کے دل پر قبضہ جما کر لاکھوں دماغوں پر راج کرو گی۔''

مصباح نے نتھنے سکیڑ کر لمبا سانس کھینچا۔ ادھر ادھر دیکھ کر سنجیدگی سے بولی، '' کچھ جلنے کی بو آ رہی ہے، کیا تم جل بھن رہی ہو؟''

''نہیں بلکہ مجھے خوشی ہو رہی ہے۔ کوئی کام پڑا تو گردن پر انگوٹھا رکھ کر کروا لیا کروں گی۔'' روزینہ نے ہنس کر کہا۔

اَب ائر کنڈیشنر کی ٹھنڈک میں پسینے سے شرابور لیٹی سوچ رہی تھی کہ روزینہ نے ٹھیک ہی تو کہا تھا۔ شہاب کو دیکھ لینے کے بعد کسی اور کو دیکھنے کا احتیاج نہیں رہا تھا۔ شہاب کے جھوٹ پر مسکرانے لگی۔ اُس نے کتنی ڈھٹائی سے کہا تھا کہ اُس کے باپ کا ایک زرعی فارم ہے جس سے اتنی آمدنی ہو جاتی ہے کہ گزر بسر ممکن ہے۔ خود کو بے روزگار قرار دیتے ہوئے اُس کی خواہش پر نوکری کرنے کا ارادہ ظاہر کرتا ہؤا کتنا عجیب لگا تھا۔

وہ جھوٹ کیوں بول رہا تھا؟ لوگ سیر ہوتے ہیں، خود کو سوا سیر ظاہر کر کے مقابل پر رعب جماتے ہیں۔ وہ دو سیر تھا، میزان پر پاؤ کا باٹ رکھ کر برابر وزن ثابت کرنے پر تلا ہؤا تھا۔ سمجھ میں نہ آنے والی بات تھی۔ تھک گئی تو سر جھٹک کر دل میں بولی، ''وہ خود کو چھپا کر سامنے آتا ہے تو مجھے کیا؟ اَچھا ہی ہے۔ اگر وہ چاہتا ہے کہ میں ناظم کے بیٹے سے پیار نہ کروں بلکہ اُس کی اپنی شخصیت سے متاثر ہو کر اُسے قبول کروں تو مجھے بھی یہی کہنا چاہیے کہ میں اصلیت جانے بغیر اُس سے بغیر محبت کرتی ہوں۔''

وہ نہیں جانتا کہ محبت میں اپنا قد جتنا اونچا کرتا جاتا تھا، مصباح کی قامت بھی آپوں آپ اتنی ہی بلند ہوتی جا رہی تھی۔ وہ شہاب کے تصور سے کھیل رہی تھی کہ ناگاہ انداوان یاد آ گئی۔ اُس کے بے حد اصرار پر اُس کے بھائی نے انداوان کی بیس پچیس تصویریں بھیجی تھیں جن میں سے مصباح نے چند

ایک چھانٹ کر علیحدہ کر لی تھیں۔

اُس نے بیڈ کے باکس سے سفید رنگ کا لفافہ نکالا۔ اِس میں عمران کا خط بھی تھا۔ خط میں لکھا تو بہت کچھ تھا مگر فقط ایک فقرہ ایسا تھا جسے پڑھ کر بار بار پڑھنے کو جی چاہتا تھا۔ عمران نے لکھا تھا،
''مصباح! وہ مترجم ہے، مشکل سے مشکل چینی تحریر کو منٹوں میں اتنا خوبصورت اور عام فہم کر دیتی ہے کہ میرا بھی جی چاہنے لگا ہے کہ میں کسی پیراگراف کی طرح اُس کی نظروں میں کھل جاؤں اور وہ مجھے خوبصورت کر دے، اتنا کہ ہر کوئی پڑھنے پر مجبور ہو جائے......''

مصباح نے مسکرا کر چھ ضرب چار انچ کی پورٹریٹ فوٹوگراف پر نگاہ جمائی۔ انداوان واقعی ایسی ہی دکھائی دیتی تھی۔ بائیں آنکھ کے عین اوپر سیاہ اور بھورے چمکدار بالوں کی ٹیڑھی میڑھی مانگ، دو شاخوں میں منقسم ندی کے چمکدار بہاؤ کی طرح چہرے کا احاطہ کر کے گردن میں بکھرتے ہوئے ریشمی بال اور پھر بالوں کے بکھراؤ میں قدرتی نظم......دھوپ میں کھیلتے بچوں کی طرح چندھیائی ہوئی شفاف آنکھیں، ننھی سی کھڑے نتھنوں والی ناک، گلابی چہرہ اور نہائت معصوم چہرے پر سے توجہ ہٹانے والی دلکش مسکراہٹ......گلاب کی پتیوں میں اَوس کے قطروں کی طرح چمکتے دانت، بایاں ہاتھ گردن اور کندھے کی وادی میں سفید قمیص کی پٹی کو تھامے ہوئے بالوں میں آدھا نظر آتا تھا، آدھا بدلیوں میں چھپے چاند کی طرح کھویا کھویا......مصباح کو ماننا پڑا کہ انداوان سے خوبصورت لڑکی اُس نے اپنی پوری زندگی میں کہیں نہیں دیکھی تھی۔ غور کرنے پر بھی بمشکل پندرہ سال کی دکھائی دی۔ بلاشبہ اُس نے عمر چوری کی قدرتی اَدا چینیوں سے پائی تھی، حسن کی تندی سب کانٹی نینٹل تھی۔

سینے پر بکھرے بالوں کے بیچ سے جھانکتا سرخ مصنوعی گلاب اور پھر بالوں کے آبشار کے نیچے انداوان کا اپنا ہاتھ......حسن نے فوٹو پیپر پر ٹھہر کر مصباح کے سانس کی ڈوری کو مضبوطی سے تھام لیا تھا۔ انسانی اعضاء کی شکست و ریخت کا مطالعہ کرنے کیلئے وین ژو جانے والا عمران اگر اُس پر مر مٹا تھا تو اچنبھے کی کوئی بات نہیں تھی۔

اُس نے اپنے البم میں سے عمران کی ایک تصویر نکالی۔ دونوں کو جوڑ کر بننے والی جوڑی کا جائزہ لیا۔ لبوں پر بے ساختہ تیرنے والی مسکراہٹ نے دل کی چوری عیاں کر دی اور بتلا دیا کہ اُس نے

بھابھی کے رُوپ میں انداوان کو قبول کرلیا ہے۔عمران نے اپنے خط میں لکھا تھا،''انداوان مذہب میں دلچسپی نہ رکھنے والی لڑکی ہے۔میری خاطر اُسے کلمہ گو بننے میں کسی کوفت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔''

دِل نے بھٹکا دیا۔سوچنے لگی۔دُنیا خوب سے خوب تر سے بھری پڑی ہے۔ایسے میں اگر کوئی دُنیا کا چکر کاٹ کر اُس پر مرمٹا ہے تو وہ یقیناً سب سے الگ تر ہے۔شہاب کی نظریں جھوٹی نہیں،اُس کی تعریف آئینوی نہیں بلکہ سچ سے زیادہ سچی اور پانی سے زیادہ گیلی ہے۔

وہ بہ خوبی سمجھتی تھی کہ عمران نے اتنی بےتکلفی کا مظاہرہ کیوں کیا تھا۔وہ چاہتا تھا کہ مصباح اُس کے عشق کا مقدمہ گھر کی عدالت میں تندہی سے لڑے اور عمران کی کامیاب وکالت کرتے ہوئے انداوان سے شادی کا اجازت نامہ حاصل کرے۔وہ کوئی غلط قدم نہیں اُٹھانا چاہتی تھی۔تبھی اُس نے تصویروں کے بعد فون پر انداوان سے گفتگو کی شرط عائد کردی۔عمران نے فون پر کہا تھا،''وہ بڑی روانی سے انگلش بولتی ہے،تم پڑھی لکھی ہو مگر انگریزی بولنے اور سننے پر عبور نہیں رکھتی ہو۔کہیں یہ نہ ہو کہ اُس کی سمجھ میں نہ آنے والی گفتگو تمہیں اُس سے بددل کردے؟''

مصباح نے ہنس کر کہا تھا،''بھائی! بعض اوقات بچوں جیسی باتیں کرنے لگتے ہو۔تم دس پندرہ دِنوں کے بعد فون پر انداوان سے میری بات کروانا۔تب تک میں کوئی انگلش سپوکن کورس جائن کرلیتی ہوں۔''

پھر اُس نے ایسا ہی کیا۔کچھ زبان میں روانی آ گئی تھی،کچھ آنے والی تھی۔ایسے میں اُس نے شہاب کو اپنا مسئلہ بیان کردیا۔شہاب مسکرا کر خاموش رہا مگر اُس نے چند ہی دِنوں میں اُسے بلا جھجک انگریزی بولنے پر تیار کرلیا۔وہ دانستہ مگر غیر محسوس انداز میں اُس سے انگریزی میں بات چیت کرنے لگتا تھا۔اُس کی غلطیوں کی اصلاح کرنے اور ٹوکنے کے بجائے بات کو آگے بڑھاتا رہتا،یوں مصباح کی جھجک چند دِنوں میں ہی جاتی رہی۔

اُسے مطلق خبر ہی نہیں ہوئی کہ انداوان کی انگریزی سمجھنے کے شوق میں خود سمجھی جا چکی تھی۔وہ چند ہی دِنوں میں شہاب کے اتنا قریب آ گئی تھی جتنی شاید برسوں میں بھی نہ آ پاتی۔پھر جب اُس نے

عمران کو گرین سگنل دیا، اُس نے وقت ضائع کئے بغیر اُس کے کانوں میں انداوان کی آواز اُتار دی۔ بلاشبہ اُس کی آواز بھی اُس کے وجود کی طرح بہت خوبصورت تھی۔ وہ غیر معمولی روانی سے انگریزی بولتی تھی۔

مصباح فرطِ اشتیاق سے لرزتی ہوئی آواز میں بولی، ''بھابھی! ہاؤ آر یو؟''

انداوان نے تعجب سے پوچھا، ''ہائے مصباح! میں بالکل فریش ہوں مگر تم بتاؤ کہ یہ 'بھابھی' کیا ہے؟ میرا نام تو انداوان ہے۔''

اُس نے مصباح کے تلفظ کی درست ادائیگی کی تھی۔ غالباً عمران نے اُس پر غیر معمولی محنت کر ڈالی تھی۔ انداوان کے استفسار پر مصباح ہنس پڑی۔ اپنی حماقت پر از خود نادم ہو کر بتلانے لگی، ''اردو زبان میں بھائی کی بیوی کو بھابھی کہا جاتا ہے۔''

ایک کھلکھلاتا قہقہہ فون میں گونجا۔ فون میں کچھ کہنے کے بجائے عمران سے مخاطب ہو کر کہنے لگی، ''تمہاری بہن نے مجھے دیکھے اور پرکھے بغیر تمہاری بیوی تسلیم کر لیا ہے۔ تم کہتے تھے کہ تمہاری سوسائٹی میں کسی غیر ملکی لڑکی کو بہ مشکل قبول کیا جاتا ہے۔'' پھر فون میں بولی، ''ساری مصباح! تمہارے بھائی نے مجھے خاصا نروس کر رکھا تھا۔ تم جتنی محبت سے پیش آ رہی ہو، جی چاہتا ہے کہ عمران کو چھوڑ دوں، تجھے تھام لوں۔ کیا ایسا ممکن ہے؟''

''تمہاری گرفت اگر میرے بھائی پر بدستور مضبوط رہی تو پھر ہم سب تمہارے ہیں۔'' مصباح نے مسکراتے ہوئے کہا، ''ہماری سوسائٹی میں اپنوں کو کبھی اکیلا نہیں چھوڑا جاتا۔''

''کیا شوہر اور بیوی کو بھی؟'' وہ پریشان ہو گئی۔

مصباح کو اُس پر ڈھیر سارا پیار آیا۔ چھیڑنے لگی، ''ہاں! یہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔''

''تو پھر پاکستان میں بچے کیسے پیدا ہوتے ہیں؟'' وہ مزید الجھ گئی۔

عقب سے عمران کی آواز سنائی دی، ''ارے بے وقوف لڑکی! مصباح کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرو۔ وہ مذاق کر رہی ہے۔''

مصباح نے ہنس کر کہا، ''جان سے پیاری انداوان! بھائی جھوٹ کہتا ہے۔ میں سچ کہتی ہوں۔

یہاں آؤ گی تو میری خوشامد کرنے پر ہی اپنے شوہر سے کچھ وقت حاصل کرنے میں کامیاب ہوسکو گی ورنہ ہرگز نہیں......''

انداوان نے بچوں کی طرح کھلکھلا کر جلترنگ بکھیر دی۔ مصباح کو دورانِ گفتگو بعض جملوں کی سمجھ نہیں آتی تھی۔ بے تکلفی سے روک کر پوچھ لیتی۔ انداوان نسبتاً آسان الفاظ میں دُہرا دیتی۔ یوں پہلے سے مطمئن مصباح نے مطمئن ہونے کیلئے پینتالیس منٹ گفتگو کی۔ رابطہ منقطع کرنے سے پہلے عمران نے دریافت کیا، ''کہو! کیسی لگی؟''

وہ خوشی سے بولی، ''بھائی! تم بڑے خوش قسمت ہو۔ دیکھنے اور سننے میں تو بلاشبہ مس یونیورس ہے۔''

عمران نے ہنس کر کہا، ''مجھے یقین ہے کہ بھگتنے میں بھی دُنیا سے منفرد ثابت ہوگی۔''

فون خاموش ہوگیا۔ انداوان کی دل موہ لینے والی آواز نیند آنے تک سماعت میں شیرینیاں گھولتی رہی۔ صبح وہ کالج جانے کے بجائے ماں کے گھٹنے سے جُڑ کر بیٹھ گئی۔ ماں نے تیکھی نظروں سے گھورا، پوچھا، ''کیا بات ہے مصباح! اتنی چاپلوسی کیوں کررہی ہو؟''

وہ مصنوعی خفگی سے بولی، ''کیا ماما سے پیار کو چاپلوسی کا نام دیا جاتا ہے؟''

ماما ہنس پڑی۔ لاڈلی کا منہ چوم کر بلائیں لینے لگی۔ ماما کو مہربان پا کر اُس نے عمران اور انداوان کا مقدمہ پیش کر دیا۔ ماما پُر استعجاب نظروں سے اُسے گھورنے لگی۔ بولی، ''ہائیں! وہ تو بڑا گھنا نکلا۔ دیکھنے میں تو......''

''ماما جانے بھی دو۔ آج کے لڑکے اتنے بھی دَبّو نہیں ہوتے۔''

ماما نے فوری طور پر انکار کر دیا۔ خاندان کی لڑکیوں کے نام گنوانے لگی۔ سمجھانے لگی کہ خاندان میں ایک سے بڑھ کر ایک لڑکی بیٹھی ہے۔ امپورٹڈ بہولا کر وہ تضحیک کا نشانہ نہیں بننا چاہتی تھی۔ مصباح نے انداوان کی شخصیت کو بڑے پرزور انداز میں پیش کیا تھا مگر ماما نے نفی میں سر ہلا کر رَد کر دیا۔ وہ اپنے کمرے میں آئی۔ تصویریں لے کر پھر ماما کے پاس پہنچ گئی۔ باری باری دکھاتی رہی۔ بریفنگ دیتی رہی۔ ماما نے تمام تصویریں بڑی توجہ سے دیکھیں اور اپنی تحویل میں لیتے ہوئے کہا، ''واقعی

مصباح! میرے بیٹے کی پسند کا جواب نہیں مگر میرے پاس بھی سوائے انکار کے کوئی جواب نہیں ہے۔''

وہ بولی،''آپ پاپا سے بات تو کریں ناں!''

''فائدہ؟'' ماما نے ناک بھوں چڑھائی۔

''ہوسکتا ہے پاپا مان جائیں اور بھائی کا کام بن جائے۔''

''میں تمہارے پاپا سے بات کیوں کروں گی؟'' ماما نے غصے سے کہا،''میرے بیٹے کی شادی پاکستانی لڑکی سے ہوگی، اُسے وہاں سے میم لانے کی اجازت نہیں دوں گی۔ واہ رانی واہ! بھائی کیلئے چاپلوسی کرنے چلی ہو، یہ نہیں سوچا کہ اُس کا نہ کوئی خاندان، نہ ولی وارث اور نہ ہی زبان اور مذہب......لگتی پھبتی بات کرتیں تو میں کچھ سوچتی۔''

پہلے قدم پر ملنے والی ناکامی نے اُسے مایوس نہیں کیا۔ وہ ماما کے پاس سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں آئی۔ فون پر شہاب سے رابطہ کیا۔ اُسے مخصوص ہوٹل میں بلوایا اور خود جلدی جلدی تیار ہو کر کالج کے بہانے وہاں پہنچ گئی۔ دَس پندرہ منٹ کے بعد شہاب اُس کے سامنے بیٹھا پوچھ رہا تھا،''خیریت تو ہے ناں؟''

اُس نے مسکراہٹ میں اُس کے سوال کا جواب دیا۔ آئس کریم سے لطف اندوز ہونے کے بعد اُس نے انداواں اور عمران کے درمیان پیدا ہونے والے غیر معمولی لگاؤ کا تفصیل کے ساتھ تذکرہ کیا۔ عمران کی خواہش کے بارے میں بتلایا اور موجودہ پریشانی سے آگاہ کیا۔ بولی،''میں چاہتی ہوں کہ عمران کی خواہش پوری ہو جائے مگر مجھے نہیں لگتا کہ ماما اور پاپا بہ آسانی مان جائیں گے۔ تمہیں یہاں بلوانے کا مقصد یہ ہے کہ مجھے کوئی ترکیب بتلاؤ جو کارگر ثابت ہو۔''

شہاب نے عام سے لہجے میں کہا،''بہتر یہی ہے کہ عمران کو اپنی جنگ خود لڑنے دو اور تم دخل اندازی مت کرو۔''

وہ سختی سے انکار کرتے ہوئے بولی،''نہیں شہاب! میں جانتی ہوں کہ عمران اکیلا اِس محاذ پر ناکام ہو جائے گا۔''

''ہوتا ہے تو ہوتا رہے، تمہیں کیا؟'' شہاب کا لہجہ سپاٹ رہا۔

وہ سمجھانے کے سے انداز میں بولی، ''سمجھنے کی کوشش کرو شہاب! تمہاری اور میری شادی بھائی کی اجازت کے بغیر نہیں ہوسکتی۔ ہمارے خاندان میں باہر شادی کرنے کا رواج نہیں ہے اور نہ ہی اَب تک کسی نے برادری سے باہر شادی کی ہے۔ عمران کی انداوان سے شادی ایک روائت بن جائے گی جس کا سہارا لے کر میں اپنے لئے کچھ کر سکوں گی۔''

شہاب مسکرا دیا۔ شوخی سے بولا، ''تو یوں کہو ناں! تم اُس پر احسان کر رہی ہو تا کہ وہ کل تمہارے کام آئے۔''

وہ جھینپ کر بولی، ''تو اور کیا؟ اَب کوئی ترکیب اپنی شیطانی کھوپڑی سے برآمد کرو......''

دونوں کافی دیر تک سر جوڑے بیٹھے رہے۔ سوچتے رہے۔ سردست یہی فیصلہ ہوُا کہ مصباح کو فوری طور پر اپنے پاپا سے بات کرنی چاہیے۔ ہوسکتا ہے کہ ماما کے برعکس وہ بہ آسانی مان جائیں۔ اگر ایسا نہ ہوُا تو پھر مصباح کو وجدان کا سہارا لینا پڑے گا۔

شام کو وہ پاپا کی تنہائی میں عمران کیلئے بول رہی تھی۔ پاپا نے لڑکی کی تصویریں دیکھیں۔ غصے سے لال بھبوکا ہوتی بیوی کو دیکھا پھر کہا، ''مصباح! تم عمران سے کہہ دو کہ وہ اپنی پوری توجہ پڑھائی پر مرکوز رکھے۔ ڈگری ملنے پر اُس کی شادی کے موضوع پر سوچا جائے گا۔ میری طرف سے اُسے تسلی دے دو کہ جیسا وہ چاہے گا، ویسا ہی ہوگا۔''

ماما نے جل بھن کر کہا، ''آپ عمران کو شہہ دے رہے ہیں۔ میں اپنے گھر میں کسی ایری غیری کو داخل نہیں ہونے دوں گی۔''

پاپا نے سمجھانے کے سے انداز میں کہا، ''تم سوچو اگر ہم فوری طور پر انکار کر دیتے ہیں تو وہ کیا کرے گا؟ ہماری اجازت کے بغیر ہی اُس لڑکی سے شادی کر لے گا جس کا نہ تو خاندانی پس منظر ہے اور نہ ہی کوئی دولت جائیداد۔ ہم کچھ بھی نہیں کر پائیں گے۔''

''حوصلہ افزائی کرنے کا مطلب بھی آپ بخوبی جانتے ہیں۔''

''ہاں جانتا ہوں مگر تم نہیں جانتی ہو۔ چینیوں کا رہن سہن اور عادات بہت مختلف ہیں۔ ایک سال

کے عرصے میں تمہارا ہونہار بیٹا اِس لڑکی کے بعد تین چار لڑکیوں سے شادی کا وعدہ کر چکا ہوگا اور اُن سے بدظن بھی ہو چکا ہوگا۔ جب یہاں آئے گا، تب سب کو بھول چکا ہوگا۔'' پاپا نے پورے یقین کے ساتھ کہا۔ مصباح سمجھ گئی کہ وہ کبھی بھی کسی چینی لڑکی سے شادی کی اجازت نہیں دیں گے۔ دوسرے دِن اُس نے وجدان سے بات کی۔ وجدان کچھ دیر کی بحث کے بعد اُس کا ہم خیال ہو گیا۔

کہتے ہیں کہ ایک اور ایک مل کر گیارہ بن جاتے ہیں۔ وہ گیارہ کیا بنے، ماما اور پاپا کیلئے وبالِ جان بن گئے۔ دونوں نے خاموش احتجاج اور عمران کی وکالت کا سلسلہ بڑی عقلمندی سے چھیڑ دیا۔ آئے روز نیا طریقہ، ہر دِن نئی واردات...... مجبوراً ایک دن پاپا نے دونوں کو بلا کر پوچھا، ''تم دونوں نے اپنے بھائی کیلئے سرد جنگ چھیڑ رکھی ہے۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں اُس لڑکی سے اتنی ہمدردی کیوں ہے؟ کیا عمران نے تمہیں ڈرایا دھمکایا ہے؟''

وجدان چھوٹا ہونے کے سبب ماما اور پاپا سے زیادہ فری تھا۔ اِس لئے بے دھڑک بولا، ''ہم تینوں کو یہ سمجھ نہیں آتی کہ آپ کو انداوان میں کیا برائی دکھائی دی ہے جو اُسے بلا سوچے سمجھے مسترد کر رہے ہیں؟''

''برائیوں کا علم خدا کو ہے۔ مجھے تو صرف اُس شادی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل کا اندازہ ہے۔ کیا تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ ایک چینی لڑکی کس طرح اپنے آپ کو اِس ماحول میں ایڈجسٹ کرے گی؟ خدارا! عقل کو استعمال میں لاتے ہوئے اِس رخ کو بھی مدنظر رکھو کہ انداوان سے شادی کر لینے کے بعد عمران مستقلاً وہیں رہائش پذیر ہو جائے گا۔ ہم اپنے پلے پوسے بیٹے کو ایک حماقت میں ہمیشہ کیلئے گنوا بیٹھیں گے۔''

''پاپا! میری عمران بھائی سے اِس موضوع پر بات ہوئی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ شادی پاکستان میں ہی ہوگی اور ہم دونوں ہمیشہ پاکستان میں ہی رہیں گے۔ سچ پاپا! بھائی آپ سے بہت پیار کرتا ہے۔ وہ انداوان کو چاہتا ہے مگر ایسا نہیں ہے کہ آپ اور ہم لوگوں پر اُسے ترجیح دیتا ہو۔'' مصباح نے وجدان کا سہارا پا کر دلیری سے کہہ دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد پاپا نے یکسر خاموشی اختیار کر لی۔ اُن کی ہر بات پر ''ہوں'' اور ''ہاں'' کہتے

رہے۔ عملی طور پر اُنہوں نے اپنے انکار کو اُن پر آشکار کر دیا تھا۔ مصباح نے وجدان سے کہا، ''چلو بھائی! جن والدین کو اپنے بچوں کی خوشی سے کوئی سروکار نہ ہو، اُن کے سامنے سر پھوڑنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔''

پاپا کے دل پر گھونسا لگا۔ بیٹی اور بیٹا سمجھا رہے تھے کہ اگر وہ نہیں بھی مانیں گے، تب بھی اُنہیں منوا لیا جائے گا۔ مصباح وجدان کو لے کر اپنے کمرے میں آئی۔ غصے سے اُس کا چہرہ سرخ تھا۔ وجدان نے مسکرا کر کہا، ''اپنا خون جلانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ بھائی سے بات کرو۔ اُسے بتلاؤ کہ ہم دونوں اُس کے ساتھ ہیں۔ پاپا اور ماما آج رات کو اُس سے بات کر کے اُسے سمجھانے کی کوشش کریں گے۔ ڈرائیں دھمکائیں گے۔ تم فون کر کے اُسے کہہ دو کہ اُن کی باتوں میں ہرگز نہ آئے۔''

مصباح نے مس کال دی۔ کچھ دیر کے بعد عمران کی کال آ گئی۔ پوچھنے لگا، ''کیا بات ہے مصباح ڈیئر؟''

اُس نے ماما اور پاپا کے رویے پر تفصیلی رپورٹ دی۔ بولی، ''میں اور وجدان ایک طرف ہیں، ماما اور پاپا ایک طرف ہیں۔ ہوسکتا ہے وہ تمہیں فون کریں اور انداوان سے کنارہ کش ہونے کا حکم دیں۔ تم نے ہرگز نہیں ماننا۔''

وہ بولا، ''وجدان کو فون دو۔''

اُس نے فون وجدان کو دیا۔ وجدان نے کان سے لگایا، بولا، ''بھائی! ہمارے خاندان نے طے کر رکھا ہے کہ دُنیا میں اُن کے علاوہ سب ناکارہ اور برے کردار کے مالک ہیں حالانکہ اَب وقت تبدیل ہو چکا ہے۔ اچھے اور برے ہر سوسائٹی میں موجود ہوتے ہیں۔ لوگ اپنے بچوں کی شادیاں خاندان کی قید سے آزاد ہو کر کرنے لگے ہیں۔''

عمران نے کہا، ''یہ تو ٹھیک ہے مگر ماں باپ کو ناراض کر کے سچی خوشی حاصل نہیں کی جاسکتی۔ مصباح نے کوئی بدتمیزی تو نہیں کی ماما پاپا کے ساتھ؟''

''نہیں بھائی! ہم دونوں نے اُن کا احترام ملحوظ رکھ کر بات کی تھی مگر وہ لائن پر نہیں آئے۔''

''تمہارا کیا مشورہ ہے، مجھے کیا کرنا چاہیے؟'' عمران نے قدرے غم زدہ لہجے میں دریافت کیا،

''مطلب یہ ہے کہ میں انداوان کے بغیر اپنی زندگی کو نامکمل اور ناکارہ سمجھنے لگا ہوں۔ شاید میں اُس کے علاوہ کسی لڑکی کے ساتھ مطمئن زندگی نہ بسر کرسکوں۔ پاپا کو منانا بھی ضروری خیال کرتا ہوں۔ کوئی ایسی ترکیب سوچو کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔''

وجدان نے پوری بات سن کر کہا،''ٹھیک ہے بھائی! ہم جو کریں گے، سوچ سمجھ کر کریں گے۔ دریافت کرنے پر تھوڑا سا جھوٹ بول دینا کہ انداوان بہت اونچے خاندان کی امیر کبیر لڑکی ہے۔ اُس کی اچھی خاصی جائیداد ہے۔ پھر پاپا کا ایک اعتراض ختم ہوجائے گا۔ دوسرے اعتراض کے ساتھ ہم بہ آسانی نبٹ لیں گے۔''

فون بند ہوگیا۔ احتجاج بند ہونے کے بجائے تیز تَر ہوگیا۔ چند دِنوں ہی ماما اور پاپا کو بہ خوبی پتہ چل گیا کہ اولاد نہ صرف جوان ہوچکی ہے بلکہ بچپن سے اَب تک آپس میں لڑنے اور جھگڑنے والے بچے جوانی کے تقاضوں پر ہم آہنگ ہوگئے ہیں۔ پاپا نے اپنے مخصوص طریقے سے اُن میں پھوٹ ڈالنا چاہی مگر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اُسے یہ علم نہیں تھا کہ وجدان نے سدرہ نامی سکول ٹیچر اور مصباح نے شہاب کے حصول کیلئے جاری ہونے والی متوقع جنگ میں اپنے تیر و ترکش پر انداوان کا نام کندہ کردیا تھا۔ پاپا کے مضبوط ارادوں کی فصیل میں ایک دراڑ پڑ چکی تھی۔ دوسری اگلے دِن شام کو پڑ گئی جب وجدان نے اپنی ماما سے کہا کہ وہ اپنی خالہ زاد نورین سے شادی نہیں کرے گا بلکہ سدرہ کو اپنا شریک سفر بنائے گا۔

ماما نے سمجھایا کہ اُس کی منگنی نورین سے ہوچکی ہے۔ انکار کرنے سے بہت بگاڑ پیدا ہوگا۔ اُس نے نہائت لاپرواہی سے کہہ دیا،''ماما! آپ کو میری شادی سے غرض ہے یا نورین کی؟ آپ کا رویہ دیکھ کر مجھے شبہ ہونے لگتا ہے کہ آپ اپنی اولاد پر دوسروں کی اولاد کو ترجیح دیتی ہیں۔ پاپا کا رویہ بھی ایسا ہی ہے۔''

ماما رونے بیٹھ گئیں۔ وجدان کا دل پسیجا، آنسو پونچھتے ہوئے سمجھانے لگا،''ماما! آپ اپنی بہن اور بھانجی کی محبت میں گرفتار ہیں۔ میں سدرہ کی محبت میں گرفتار ہوں۔ آپ اگر اپنی دلچسپی سے دست بردار ہونے پر تیار نہیں تو میں کیسے سدرہ کو چھوڑ سکتا ہوں؟''

ماما نے دوپٹے سے آنسو پونچھ لئے۔ سمجھ گئی کہ وہ بے دست و پا ہو چکی ہے۔ جو بیٹا چاہے گا، وہی کرنا پڑے گا۔ رات میں اپنے مجازی خدا کے سامنے سر جھکائے بیٹھی بیٹے کے اعلان کے بارے میں بتلانے لگی۔ پاپا نے پوری توجہ اور ہمت سے سنا۔ برداشت نہ کرنے والی بات تھی مگر اِس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ وہ محض نام کا سلطان نہیں تھا، اِس گھر کا سلطان بھی تھا۔ حکم عدولی پر تلملا اُٹھا۔ بیوی سے مخاطب ہوا، ''پہلے عمران نے چچا کے گھر منگنی کرنے پر انکار کر کے میری سبکی کرائی تھی۔ اَب انگوٹھی واپس کرتے ہوئے ہمارے سر شرم سے جھک جائیں گے۔ پورا خاندان ہم پر تھوتھو کرے گا۔ تم جانتی ہو کہ عائشہ باجی اپنے بیٹے افتخار کیلئے مصباح کا ہاتھ مانگتی رہتی ہے، اُسے خبر ہوگی تو وہ پیچھے ہٹ جائے گی۔ مصباح کیلئے افتخار سے بہتر لڑکا آسمان سے اترے گا کیا؟''

ماما آنسو بہانے لگیں۔ دل ہی دل میں کوسنے لگیں۔ کہیں تربیت میں کمی رہ گئی تھی؟ کیا خون سفید ہو گیا تھا؟ شوہر کے پیروں پر گر کر زار و قطار اشک بہانے لگی۔ سلطان علی نے دلاسہ دیا۔ سمجھایا کہ وہ سب کو سمجھا لے گا۔ وہ نفی میں سر ہلا کر بولی، ''آپ کس کس کو سمجھائیں گے؟ عمران کے بعد وجدان نے بھی خاندان میں شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ رہ گئی مصباح، آپ جانتے ہی ہیں کہ وہ دونوں بیٹوں سے زیادہ آپ کی سر چڑھی اور منہ پھٹ ہے۔ وہ تڑاخ سے انکار کر دے گی۔ رہی سہی عزت بھی خاک میں مل جائے گی۔''

دوسری طرف وجدان اپنی بہن کے کمرے میں بیٹھا ہوا کہہ رہا تھا، ''میں کسی کا محتاج نہیں ہوں۔ اگر پاپا مان گئے تو ٹھیک ورنہ میں گھر چھوڑ دوں گا۔ میں بھائی کی طرح بزدل نہیں ہوں۔ اپنا اور سدرہ کا پیٹ پالنے کی اہلیت رکھتا ہوں۔''

مصباح سمجھا رہی تھی، ''نہیں بھائی! وہ بزدل نہیں، تم بزدل ہو۔ گھر ہم تینوں کا بھی ہے۔ ہم معاملے کو ناکامی کے اِس موڑ تک پہنچنے نہیں دیں گے جہاں ہمیں گھر چھوڑنا پڑ جائے۔ تم اپنی ضد پر قائم رہو، عمران اپنی ہٹ پر قائم رہتا ہے، دیکھتے ہیں، کب تک ماما اور پاپا اپنی خاندان نوازی پر اَڑے رہتے ہیں۔''

دونوں سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔

اگلی شام کو دونوں میاں بیوی مصباح کی موجودگی میں وجدان کو زمانے کی اونچ نیچ پر ناصحانہ لیکچر جھاڑ رہے تھے۔ وجدان سر جھکائے بیٹھا تھا۔ باپ سمجھ رہا تھا کہ وہ ندامت سے سر نہیں اُٹھاتا۔ مصباح سمجھتی تھی کہ وہ ایک کان سے سن رہا ہے، دوسرے کان سے باہر نکال رہا ہے۔ وجدان نے کن اکھیوں سے مصباح کو دیکھا، آنکھوں سے اشارہ کیا اور بغیر کچھ کہے بولے وہاں اُٹھ گیا۔

اس کے جانے کے بعد پاپا نے باوثوق لہجے میں کہا، ''لگتا ہے میرے بیٹے کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔''

ماما نے تائید کی، ''لگتا تو یہی ہے ورنہ وہ نچلا بیٹھنے والا نہیں ہے۔''

بمشکل دَس منٹ گزرے تھے کہ مصباح کی خالہ اور خالو آن دھمکے۔ اُن کے چہروں پر برستی ہوئی وحشت اور برہمی خطرے کی گھنٹی بجا رہی تھی۔ پاپا نے گھبرا کر پوچھا، ''کیا بات ہے صدیق بھائی!''

ماما کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ بڑبڑائی، ''یا اللہ خیر!'' پھر اپنی بہن کا بازو تھام کر لرزتی ہوئی آواز میں پوچھنے لگی، ''آپ اور اِس وقت یہاں؟ خیریت تو ہے؟''

خالہ تڑخ کر بولی، ''خیریت اپنے بیٹے سے پوچھیں جس نے دیدہ دلیری سے منگنی کی انگوٹھی ہمارے منہ پر کھینچ ماری ہے۔''

تعجب کے مارے ماما اور پاپا کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ماما نے دل پر ہاتھ رکھ کر پوچھا، ''کب؟''

''ابھی چند منٹ پہلے!'' خالو نے غصے سے کہا۔

خالہ نے باقاعدہ طور پر رونا شروع کر دیا۔ نسبتاً بلند آواز میں زہر اگلنے لگی، ''اگر بھری برادری میں تذلیل کرنا ہی مقصد تھا تو اپنے لوفر بیٹے کے ہاتھ میں انگوٹھی بھیجنے کے بجائے آپ خود آ جاتے۔ ہماری بے بسی کا تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور بدنامی کے اشتہار بانٹتے۔''

خالو نے ہونقوں کی طرح کھڑے سلطان علی کی نظروں کے سامنے کھلی انگلیوں والا ہاتھ لہرایا اور دانت پیس کر کہا، ''جب کوئی نہیں ملتی تھی تب آپ کہتے تھے کہ نورین مجھے اپنی مصباح سے بھی زیادہ پیاری ہے، اَب کوئی اور نظر آ گئی ہے تو فوراً ہی گرگٹ کی طرح آپ نے رنگ بدل لیا۔''

معاملہ بہت بگڑ گیا۔ گفتگو میں لحہ بہ لحہ تندی عود کرنے لگی۔ ماما اور پاپا کے چہروں پر ثبت لاچارگی اور ندامت دیکھ کر مصباح زیادہ دیر تک وہاں بیٹھی نہ رہ سکی۔ آنکھوں میں آنسو لئے اُٹھ گئی۔ اپنے کمرے میں آئی۔ دیکھا، وجدان آنکھوں پر بازو رکھے بے حس وحرکت بیڈ پر دراز تھا۔ وہ صوفے پر نیم دراز ہوگئی۔ گراؤنڈ فلور سے اَبھی تک سرد گرم ملی جلی آوازیں ماحول کے غیر معمولی تناؤ کی خبر دے رہی تھیں۔

دونوں اپنی اپنی جگہ پر بے چینی محسوس کرتے رہے، خاموشی سے سوچتے رہے اور آتش فشاں کے پھٹنے کا انتظار کرتے رہے تاوقتیکہ نیند کی دیوی نے دونوں کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

ناشتے کی میز پر ہر آن دل دھڑکتا رہا مگر کچھ بھی نہیں ہوا۔ پاپا نے ایک دُکھ بھری نگاہ وجدان پر ڈالی اور ٹائی کی گرہ درست کرتے ہوئے ڈائننگ روم سے نکل گئے۔ وجدان نے عافیت کا سانس لیا۔ شام تک کیلئے خطرہ ٹل گیا تھا۔

ماما نے شکوہ کناں لہجے میں نظریں چُراتے ہوئے کہا، ''تمہارے پاپا تمام رات بیڈ روم میں ٹہلتے رہے ہیں، ایک پل بھی سو نہیں پائے۔''

مصباح نے کہا، ''کیا آپ بھی؟''

''ظاہر ہے۔ وہ جاگتے رہیں اور میں سو جاؤں، کیسے ممکن ہے؟''

وجدان نے کندھے اُچکا کر کہا، ''آپ ایک رات جاگے ہیں، آپ کی بات مان لینے کی صورت میں مَیں تمام عمر جاگتا رہوں گا۔''

''تم نے بہت بُرا کیا وجدان!'' ماما نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

''زندگی میں ایک ہی لحہ ایسا ملتا ہے جب انسان خود کو انگوٹھی بنا کر کسی کی انگلی میں اوڑھا دیتا ہے۔ اس میں بھی اپنی مرضی شامل نہ ہو تو پھر زندگی رایئگاں چلی جاتی ہے۔'' مصباح نے دھیمے انداز میں کہا۔

''ہاں بیٹا! شاید ہم ہی سٹھیا گئے ہیں۔''

''نہیں ماما!'' وجدان نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا، ''آپ ہمارے چُناؤ پر اعتماد نہیں

کرتیں، نہ ہی پاپا کرتے ہیں۔''

ماما برتن اُٹھا کر کھڑی ہوگئی۔ گلوگیر لہجے میں بولی، ''تم ٹھیک ہی تو کہتے ہو۔ جب تم اپنی ننھی ننھی انگلیاں بجلی کے سوئچ بورڈ میں گھسانے کی کوشش کرتے تھے، جب چلتے ہوئے پنکھے کے پَروں کو پکڑنے لگتے تھے، جب گرم استری پر ہاتھ پھیرنا چاہتے تھے، جب ہیٹر کے سرخ سپرنگ کو چھونے کیلئے مچل جاتے تھے تب بھی ہمیں تمہاری نظر اور صلاحیتوں پر اعتماد کرنا چاہیے تھا۔''

دونوں نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر ایک ہی وقت میں ماما کو دیکھا جو آنسوؤں سے تَر چہرہ لئے برتن اُٹھا کر کچن کی طرف چل پڑی تھی۔ ندامت کا ایک گہرا احساس دِل میں جاگزیں ہوگیا۔

نظامِ قدرت ہے۔ ایک فضا میں پیدا ہوجانے والے خلا کو پُر کرنے کیلئے آندھی کسی اور علاقے کی ہوا کو گھسیٹ کر وہاں پہنچا دیتی ہے، پیچھے خلا پیدا کر دیتی ہے۔ محبت بھی ایسا ہی جذبہ ہے۔ مصباح ایسی جنت کی تعمیر کا تہیہ کئے بیٹھی تھی جس میں ہر طرف شہاب ہی شہاب دکھائی پڑتا تھا اور اُس کے پہلو میں پُرشباب حور وہ خود ہی تھی، شہاب کے ہاتھ میں تھامے جاوداں مَے کے لبالب جام میں بھی اُسی کا عکس ٹھہرا ہوُا تھا۔ مصباح کو احساس ضرور تھا کہ وہ ایک جنت کے حصول کیلئے تین اطراف میں جہنم کی آگ کو دہکانے کیلئے دیا سلائی جلا رہی ہے مگر...... کہتے ہیں کہ محبت خودغرض ہوتی ہے۔

...❀...

بارشوں نے موسم نمایاں تبدیلی لا کر بیماریوں کا بازار گرم کر دیا تھا۔ بچے چونکہ زیادہ بے احتیاطی برتتے ہیں، اِس لئے وہ موسمیاتی بیماریوں کا آسانی کے ساتھ شکار ہوجاتے ہیں۔ ہنس کو بھی بخار نے آن دَبوچا۔ اَکلوتا ہونے کے سبب گھر کا سارا نظام درہم برہم ہوگیا۔ شناں نہ تو خود کسی پَل قرار لیتی اور نہ ہی اپنے ڈاکٹر شوہر کو ٹکنے دیتی۔ وہ کہتا، ''شناں! میں اِسے ہائی انٹی بیاٹک نہیں دینا چاہتا۔ بچوں کی قوتِ مزاحمت کمزور پڑ جاتی ہے۔ یہ موسمی بخار ہے، ایک آدھ دِن میں جان چھوڑ جائے گا۔''

''دیکھیں تو سہی۔ ایک دو دنوں میں ہی میرے ہنس کی کیا حالت بن گئی ہے۔ ہڈیاں نکل آئی

ہیں۔ چہرہ پیلا پڑ گیا ہے۔ مجھے ڈاکٹری سکھانے کے بجائے اِس کا کچھ کریں ورنہ میں اِسے لے کر چائلڈ اسپیشلسٹ کے پاس چلی جاؤں گی۔'' وہ رونے بیٹھ گئی۔

''شناں!''

''مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا۔''

''میں جانتا ہوں مگر تم یہ بھی تو سوچو کہ آج کل میں ہی کتنا بڑا سیلاب آنے والا ہے۔ میں صبح سے شام تک مصروف رہتا ہوں۔ گھروں کے گھر اُجڑ رہے ہیں، بستیاں ملیا میٹ ہو رہی ہیں اور نہ جانے کتنے ہنس اپنی آخری پروازوں کیلئے پَر تول رہے ہیں۔ اِسے تم سنبھالو، مجھے اُن بے آسراؤں کو سنبھالنے دو۔ یہ تمہارے اور میرے تعلق کے بیچ پُرلطف خاموش معاہدہ طے پایا تھا۔''

ایسے میں غنودگی بھری نیند سے بیدار ہو کر ہنس نے ماما کو پکارا۔ وہ بھاگتی ہوئی گئی۔ بے اختیار سینے سے لپٹا کر روتے ہوئے پوچھنے لگی کہ اُسے کیا چاہیے۔ وہ اپنے چپچپے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا، ''قسمت آ گئی ہے ماما؟''

میاں بیوی نے بہ یک وقت ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اپنے ماموں کے ہاں چند روز پیشتر جانے والی قسمت غنودگی بھری بیداری میں بیمار بیٹے کے لبوں پر چپکی ہوئی تھی، وہ سامنے بیٹھی بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ اُس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھتے ہوئے بلائیں لینے لگی۔ سمجھانے لگی کہ آج نہیں تو کل، قسمت اُس کے پاس ہوگی۔ فکر نہ کرو۔

''سیلاب آ گیا ماما؟'' ہنس کا تنفس اور دل کی دھڑکن غیر معمولی حد تک تیز تھی۔ لہجہ بھی ٹوٹا پھوٹا سا تھا۔

''اَبھی نہیں آیا ہنس بیٹا!'' پاپا نے بتایا۔

''کب آئے گا؟''

''سنا ہے کہ آج ہمارے علاقے میں پہنچ رہا ہے۔''

''کس وقت پاپا؟''

باپ نے رِسٹ واچ پر نگاہ ڈالی۔ اچانک متفکر ہو گیا۔ ایسے میں کوارٹر کے باہر کسی گاڑی کا ہارن

بجا۔ وہ اپنی بیوی سے مخاطب ہوُا، ''شناں! میری ٹیم تیار ہو کر پہنچ آئی ہے، میں جا رہا ہوں۔ ادویات اور استعمال کے بارے میں تم بہت اچھی طرح جانتی ہو۔ خدا حافظ!''

اُس نے ہنس کو چوم کر الوداع کہا اور تیز قدموں سے چلتا ہوُا کوارٹر سے نکل گیا۔

ہنس نے فوراً بیڈ چھوڑ دیا۔ ماما کے روکنے کے باوجود بھاگتا ہوُا کوارٹر سے باہر نکلا۔ باپ کو بڑی سی گاڑی میں بیٹھ کر جاتے دیکھا اور بائی بائی کرتا ہوں خاردار تار کا دروازہ نما خلا عبور کر کے اپنی کشتی کے پاس جا پہنچا۔ مالی عموماً شام کو پانی چھوڑتا تھا۔ آج خلافِ معمول دریا میں پانی بہہ رہا تھا۔ صبح دم برسنے والی بارش کا پانی شاید اکٹھا ہو گیا تھا جسے مالی نے اِس جانب دھکیل دیا تھا۔ پہلے صاف شفاف پانی بہتا تھا، آج پیلا مٹی آلود پانی بہہ رہا تھا۔ ہنس کا دِل دھک سے رہ گیا۔ چند دِنوں سے ٹی وی پر سنتا آ رہا تھا کہ دریائے سندھ میں اونچے درجے کا سیلاب آنے والا ہے۔ دل نے تصدیق کر دی کہ وہ گھڑی آن پہنچی ہے۔ اپنے دائیں بائیں دیکھا۔ قسمت ساتھ دینے کیلئے پاس موجود نہیں تھی۔

وہ کشتی کے بالکل قریب ہی آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور ایک ٹک بہتے ہوئے پیلے پانی کو دیکھنے لگا۔ اُس کا سویا ہوُا در یا جاگ رہا تھا۔

دِل میں خوف بیٹھنے لگا۔ سیلاب میں پوڈو کا کیا بنے گا۔ اُس نے دیکھا کہ پوڈو بڑا مغموم بیٹھا ہوُا تھا۔ وہ بڑبڑایا، ''پوڈو! تم اگر اتنے ہی بزدل تھے تو یہاں آئے ہی کیوں تھے؟''

پوڈو نے کوئی جواب نہ دیا۔

''تم سیلاب سے ڈر گئے ہو پوڈو۔ ہے ناں؟''

ہنس کے سر میں درد ہونے لگا۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ نبض کے ساتھ ساتھ ننھے ننھے پٹاخے سے چھوٹنے لگے تھے۔ جسم پر بخار نے خاصی نقاہت طاری کر دی تھی۔ جب سردی لگنے لگی تب اُس نے جانا کہ اُسے پھر بخار ہو گیا ہے۔

وہ بدقّت تمام اُٹھا۔ قدموں نے بوجھ کو مکمل سہارا نہیں دیا تو لڑکھڑا گیا۔ سر میں درد اچانک تیز ہو گیا تھا۔ ایسے میں اُس کی نگاہ اپنے بنائے ہوئے ڈیم پر پڑی۔ نہ جانے کیسے اچانک کافی ساری مٹی بہہ گئی اور ڈیم میں جمع بہت سارا پانی چھلانگ لگا کر باہر نکلا اور تیز رفتاری سے کشتی کی طرف بڑھنے لگا۔

اُسے یوں لگا جیسے وہ اِس ریلے میں بہہ جائے گا، اُس کا پوڈو کشتی سمیت غرق ہو جائے گا......اُس نے چیخنا چاہا، مدد کیلئے ماما کو بلانا چاہا مگر وہ ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکال سکا۔ پھٹی پھٹی نگاہوں سے سانپ کی طرح لہرا کر آتے ہوئے پانی کو دیکھنے لگا۔ اُسے یقین ہو گیا کہ کشتی اُلٹ جائے گی اور پوڈو پانی میں بہہ جائے گا۔

وہ زمین پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گیا۔ لبوں سے بے اختیار نکلا، ''پوڈو مرنے والا ہے قسمت! تم کہاں ہو؟ ہائے! ہمارا پوڈو......''

...(❁)...

سندھ ساگر بپھر گیا تھا۔ شاید پھر کسی نے ''مویا نانگ'' (مردہ سانپ) کہہ کر اُسے ہڑبڑا کر اُٹھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دو دِنوں میں ہی مٹی آلود پانی کی سطح خاصی بلند ہو گئی۔ جنت کے ستون پر لگے پیمانے پر نگاہ پڑی تو پروفیسر وسیم بزدار کا دِل دھک سے رہ گیا۔ یقینا سیلاب نیچے درجے کا نہیں تھا۔ ٹی وی آن کیا۔ موسمیات والے بتلا رہے تھے کہ پانی کا بڑا ریلا میانوالی کے علاقے میں پہنچنے والا ہے۔ یہ اطّلاع بھی دی جا رہی تھی کہ گزشتہ دس سالوں میں اتنا بڑا سیلاب نہیں آیا تھا۔

اُس نے بڑی احتیاط سے اپنی جنت کا دفاعی نقطہ نظر سے جائزہ لیا۔ اَبھی تک پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ شام تک دریا کے پانی میں درختوں کی بڑی بڑی شاخیں، مُردہ مویشی اور عام استعمال کی اشیاء دکھائی دینے لگیں۔ سندھ ساگر کے پانی نے پہاڑوں سے نکل کر اپنا جوش اور غیض دکھانا شروع کر دیا تھا۔

وہ خاصی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ اپنی بے چینی کی وجہ بھانپنے میں بھی بری طرح ناکام ہو رہا تھا۔ مجبوراً اُس نے افتخار بیگ سے فون پر رابطہ کیا اور دریا کی صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ افتخار نے کہا، ''بے فکر رہیں پروفیسر صاحب! جنت پانی کے پندرہ بیس فٹ کے ریلے کو اپنے نیچے سے گزارنے پر قدرت رکھتی ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر نہ جانے کیوں دل گھبرا رہا ہے۔''

''اگر ایسی بات ہے تو میرے گھر تشریف لے آئیں۔ چند دِن ماحول کی تبدیلی کا لطف اُٹھائیں، آبی ریلا گزرنے کے بعد واپس اپنی جنت میں چلے جائیں۔''

''نہیں۔ میں بے وفا نہیں ہوں۔''

''واٹر فلور میں لمبا سا بانس پڑا ہے۔ اُس کے ایک سرے پر چوب اور دوسرے پر کڑا نصب ہے۔ آپ بانس کو ستون پر لے جائیں۔ کڑے کو ستون کی ہُک میں پھنسا دیں۔ دھیان رکھیں کہ جب بھی کوئی بھاری شئے بہتی ہوئی جنت کی طرف بڑھے، اُسے بانس کی مدد سے دھکیل کر پَرے کر دیں۔ کسی ٹوٹے ہوئے درخت یا کسی بھی بھاری بھر کم شئے کو ستون یا جنت کے ساتھ اَٹکنا نہیں چاہیے ورنہ نقصان ہو سکتا ہے۔'' افتخار بیگ نے کہا۔

''بَرموقع یاد دلانے کا بے حد شکریہ!'' پروفیسر نے متشکرانہ لہجے میں کہا، ''مجھے دوسری احتیاطی تدبیر بھی یاد آ گئی ہے۔ میں نے اَبھی تک جنریٹر کو بند نہیں کیا۔ اَبھی بند کر دیتا ہوں۔''

''پانی میں اُترنے والی سیڑھیوں کے لیور کھینچ کر اُنہیں اوپر اُٹھا لیں۔ سیلاب کے دوران بہت زیادہ تعداد میں سانپ اور بچھو پانی میں بہہ کر آتے ہیں اور سُنا ہے کہ بہت زہریلے اور خطرناک ہوتے ہیں۔ یہ نہ ہو کہ جنت حوروں کے بجائے سانپوں سے بھر جائے۔'' افتخار نے ہنستے ہوئے کہا اور اجازت لے کر فون بند کر دیا۔

اندازہ تھا کہ بڑا ریلا اگلی صبح دس سے گیارہ بجے کے لگ بھگ جنت کے پاس سے گزرے گا مگر اُسے شب بھر نیند نہیں آئی۔ کبھی ستون پر کھڑا ہو کر بانس کی مدد سے بہتی ہوئی مختلف اشیاء کو دھکیلتا، کبھی عرشے پر آ جاتا اور سست رَوی سے راہ داری کا چکر کاٹتا۔ جنت کی لائٹس آن تھیں۔ دریا بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ عجیب یہ تھا کہ اُسے ذرہ بھر تھکن یا بیزاری کا احساس نہیں تھا۔ وہ پانی کی بلند ہوتی سطح کے ساتھ ساتھ پرجوش ہوتا جا رہا تھا۔

سورج نکلا اور وہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ تاحدِ نگاہ ہر سُو پانی پھیلا ہوا تھا۔ باتھ روم میں غسل کیا۔ تازہ دم ہو کر چائے بنائی، ناشتہ تیار کیا اور پیٹ پوجا کر کے دوبارہ دریا کی اَٹھکیلیاں ملاحظہ کرنے لگا۔ پانی

کی رفتار خاصی تیز ہوگئی تھی اور فضا میں عجیب سا شور گونجنے لگا تھا۔ دور کہیں انسانوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں بھی ابھر رہی تھیں۔ وہ ریلنگ کو مضبوطی سے تھامے دریا میں بہتے ہوئے مویشی اور انسانوں کے استعمال کی اشیاء کے بارے میں سوچنے لگا۔ کیا تھا، کیا ہوگیا؟ دریا ایسا ہی بے رحم واقع ہورہا تھا کہ لوگوں کی برسوں کی جمع پونجی کو سمیٹ کر ان جانی منزل کی طرف رواں دواں تھا۔ اُسے کسی کی اجازت درکار نہیں تھی، کوئی خوف لاحق نہیں تھا اور نہ ہی اُس کے قلب میں کہیں جذبہ ترحم موجود تھا۔

دس بجنے میں کچھ وقت ہی باقی تھا کہ اُسے دریا میں بہتی ہوئی پہلی انسانی نعش دکھائی دی۔ دور تھی تو کپڑوں کی گٹھڑی محسوس ہورہی تھی، نزدیک آنے پر مردہ عورت کا رُوپ دھار گئی۔ وہ سیدھی ستون کی طرف آئی اور اَٹک گئی۔ پروفیسر لپک کر ستون پر چڑھا۔ بانس پر گرفت کانپ اُٹھی۔ بدقّت تمام اُس نے چوب نعش میں چبھوئی اور پوری قوت صرف کر کے اُسے مغرب کی جانب زور سے دھکیل دیا۔ نعش جنت کی فاؤنڈیشن سے رگڑ کھاتی ہوئی آگے نکل گئی۔ گزشتہ رات میں اُس نے کافی وزنی درخت اور گھریلو سامان دھکیلا تھا، کچھ نہیں ہوُا تھا۔ ایک نعش نے اُسے پسینے میں شرابور کر دیا۔ سوچنے لگا، ''نہ جانے کون تھی بے چاری جو سندھوسئیں کے غیض وغضب کا شکار ہوگئی۔ ہاہ!''

آنکھوں پر ہاتھ کا چھجا بنا کر شمالی سمت میں بہت دور تک دیکھا۔ کوئی شئے بہتی ہوئی دکھائی نہیں دی تو بانس پر سے گرفت ہٹا کر زور سے چیخا، ''اے سندھوسئیں! آج تیری موج ہی موج ہے۔ اپنے دُشمنوں تک پہنچنے کی کوشش کر مگر ہائے! تو ایسا دلیر بھی واقع نہیں ہوا۔ تو اپنے ہی بچوں کو نگلنے والا سانپ ہے۔''

اچانک چونک پڑا۔ تقریباً دو میٹر لانبا مُشکی ناگ تیز رفتاری سے بل کھاتا ہوُا پانی کو چیر کر جنت کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اُس نے برق رفتاری سے بانس تھاما۔ کڑا ہک سے نکالا اور عرشے پر کود گیا۔ جنت بُری طرح ڈول گئی۔ وہ خود کو سنبھالتا ہوُا مستعدی سے ریلنگ تک آیا۔ سانپ اِس وقت جنت کی فاؤنڈیشن پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر بار بار ناکام ہورہا تھا۔ اُس نے پوری قوت سے بانس کی چوب ماری۔ وہ پلٹا کھا کر صاف بچ گیا۔ بہت کائیاں تھا۔ چھ سات وار خطا گئے تو پروفیسر نے ہانپتے

ہوئے بانس اوپر اُٹھالیا۔ انتظار کرنے لگا کہ وہ فاؤنڈیشن پر چڑھ کر ریلنگ تک آئے اور وہ بانس کی مدد سے اُسے کچل دے۔ سانپ بہ صد کوشش چڑھ نہ پایا تو جنت کے گرد پورا چکر کاٹ کر مختلف جگہوں پر سے اوپر چڑھنے کی کوشش کرتا رہا۔ بار بار کی ناکامی نے نہ صرف تھکا دیا بلکہ حوصلہ بھی توڑ دیا۔ ایسے میں پروفیسر کا وار چل گیا۔ چوب گردن سے کچھ نیچے یوں چبھی کہ پار ہوگئی۔ پانی کی سطح پر سرخی پھیل گئی۔ پروفیسر نے تڑپتے ہوئے سانپ سمیت بانس اوپر اٹھالیا۔ خون کے چند قطرے اُس پر گرے۔ کراہت کے مارے اُس نے فوراً ہی سانپ کو دریا میں پھینک دیا۔ سانپ کے جسم میں اَٹکی ہوئی چوب باہر نکلی تو وہ یکبارگی سے پوری قوت کے ساتھ تڑپا۔ خون کا فوارا سا اُبل پڑا۔ دوفٹ کی بلندی تک اُچھلا پھر بَل کھاتا لہراتا مغربی سمت میں تیرنے لگا۔ دس بیس گز کے فاصلے پر جا کر وہ بے ہوش ہوگیا۔ یہ بے ہوشی موت کا پہلا زینہ تھا۔

بانس کو ستون کے ہُک میں لٹکا کر سٹور میں گیا۔ ہینڈی کیم میں کیسٹ فٹ کی۔ بیٹری لگائی اور کیمرہ کندھے پر لٹکا کر ستون پر آ گیا۔ وہ پانی کے بلند ریلے کی یلغار کو نہ صرف اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا بلکہ اُسے ہمیشہ کیلئے محفوظ بھی کرنا چاہتا تھا۔ دور دور تک پانی کی سطح ہموار تھی۔

کیمرے کی ایل سی ڈی میں پانی کی موجیں دیکھتے ہوئے اچانک چونک پڑا۔ زوم اِن کیا۔ چونکنے کی وجہ جنت سے سوڈیڑھ سوفٹ کے فاصلے پر سے گزرنے والا بڑا سا درخت تھا جس کی پھیلی ہوئی شاخوں پر عام استعمال کی چارپائی اَٹکی ہوئی تھی۔ چارپائی پر دو عورتیں اور چار بچے ایک دوسرے کے ساتھ چمٹ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ چونکہ وہ جنت کی مخالف سمت کی طرف متوجہ تھے اِس لئے جنت کو دیکھ ہی نہ پائے۔ مزید زوم اِن کرنے پر اُس نے دیکھا کہ ایک عورت کی جھولی میں دو تین سالہ بچہ بیماری یا بھوک کے باعث بے ہوش یا بہت زیادہ نڈھال ہو چکا تھا۔ اچانک اُس کے سینے میں پتھرائے ہوئے دِل میں درد جاگ اُٹھا۔ وہ لپک کر کچن میں گیا۔ پیراسیٹامول کا سیرپ، بریڈ کے دو پیکٹ، دودھ اور بسکٹوں کے چند ڈبے اُٹھائے اور اپنی ریموٹ کنٹرول بوٹ میں آ گیا۔

بوٹ کو فل سپیڈ سے دوڑاتے ہوئے چند ہی منٹوں میں درخت کے پاس پہنچ گیا۔ دونوں عورتیں اُس کی جانب متوجہ ہو چکی تھیں۔ بچے بھی بڑی دلچسپی سے اُس کی بوٹ کو دیکھ رہے تھے۔ وہ ایک حد

تک قریب آ سکتا تھا۔ زیادہ قریب ہونے پر خطرہ تھا کہ کہیں درخت رُخ پھیر کر بوٹ کو اپنی لپیٹ میں نہ لے لے۔ اُس نے باری باری تمام ڈِبے چارپائی پر پھینکے۔ چیخ کر پوچھا کہ بچہ نڈھال کیوں ہے۔ ایک عورت نے سرائیکی زبان میں کہا کہ بچہ بھوک کی وجہ سے نڈھال ہے۔ عورتوں نے مدد کا شکریہ ادا کیا اور منت سماجت کی کہ اُنہیں کسی طرح باہر نکال دے۔ اُس نے اطراف میں نظر دوڑائی۔ پھر مایوسی سے سر ہلا کر بولا،''چاروں طرف پانی ہے۔ میں تم لوگوں کو خشکی پر نہیں پہنچا سکتا۔ خدا سے دعا کروں گا کہ تم دونوں بچو، نہ بچو، بچے بچ جائیں۔''

اُس نے جونہی بوٹ کا سٹیئرنگ گھمایا، پانی کے بہاؤ کی طاقت کا اندازہ ہوگیا۔ پانی کے اتنے تیز بہاؤ میں عام کشتی یا بیڑی اُلٹے رُخ پر نہیں چل سکتی تھی۔ بوٹ کی رفتار بھی نسبتاً کم تھی۔ دَس منٹ بعد وہ جنت کے بوٹ گیرج میں تھا۔ وڈیو کیمرے کی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ گیارہ بجنے والے تھے۔ خطرے کی گھنٹی بج اُٹھی۔ ریلا کسی دم پہنچا ہی چاہتا تھا۔

وہ ستون پر آ گیا۔ کیمرے میں سیلاب کے مناظر کو محفوظ کرنے لگا۔ کوئی بھینس کیسے زندگی طلب کرتی ہے، کسی بکری کا پیٹ پھول جائے تو کیسی لگتی ہے، کتے ڈبکیاں کھاتے کیسے بھونکنا بھول جاتے ہیں، وہ فلماتا رہا۔ جی اوب گیا تو کیمرے کو کندھے پر لٹکا کر حلق کے بل چیخا،''اشولال! کہاں ہو؟ تمہارا سندھ ساگر بپھر گیا ہے۔ تم کہتے ہو کہ سندھو کے دَس بیٹے تھے جن میں سے اکثر کو زمانے کی بے مہار ترقی نے نگل لیا۔ آ کر دیکھو! لالہ، چھتا، بودو اور جمنا کیسے اپنے گم شدہ بھائیوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے ہیں...... اِن کا غضب دیکھنے کیلئے آ جاؤ۔ یہاں دُنیا کی نام نہاد ترقی کا کھوکھلا پن دیکھ کر ماتم کرو، سینہ پیٹو، سر پیٹو......''

(ڈاکٹر اشولال اپنی کتاب،''سندھ ساگر نال ہمیشاں'' میں اپنی فقید المثال کھوج پیش کرتا ہے کہ سندھ ساگر راجن شاہ دربار سے بستی رانواں تک دَس ٹکڑوں میں بٹا ہوا تھا۔ ہر لڑ، ایک مکمل دریا کا درجہ رکھتا تھا۔ اُس نے غیر معمولی عرق ریزی کے بعد اُن کے نام بھی درج کئے ہیں جو پرانے باسیوں کو اَبھی تک یاد ہیں۔ وہ نام یہ ہیں۔ لالہ، چھتا، شیرا، کالی، کس، راٹھی، بودو، کماں، جمنا، پران......)

پروفیسر گزشتہ رات وقفے وقفے سے ٹی وی کی نشریات دیکھتا رہا تھا۔ بار بار حکومت کی طرف سے یقین دہانی کرائی گئی کہ سیلاب زدگان کی حفاظت اور اُنہیں پانی سے نکالنے کیلئے تمام بندوبست مکمل کر لئے گئے ہیں۔ پروفیسر بہتے ہوئے انسانوں، نعشوں، مویشیوں اور سامان کو دیکھ کر سوچنے لگا، ''کتنا جھوٹ بولا جاتا ہے۔ مجھے تاحدِ نگاہ پانی دکھائی دے رہا ہے، پانی کے عفریت سے بچانے والا کوئی دکھائی نہیں دیتا۔ نہ جانے کن لوگوں کو سندھو سئیں کے غضب سے بچانے پر کروڑوں روپے کے فنڈ لٹا دیے گئے ہیں۔'' مشرق کی سمت میں منہ کر کے بلند آواز میں چیخا، ''اے مکار حکمرانو! کچھ نہیں کر سکتے ہو تو میری طرح خاموش ہو جاؤ۔ منافقت کی جھولی میں بیٹھ کر غریب کی داڑھی کیوں نوچتے ہو؟''

وہ ہیجانی کیفیت میں کبھی اپنے مُرشد کو کوسنے دیتا، کبھی حکومت کو اور کبھی بہہ کر آنے والے لوگوں کو بُرا بھلا کہنے لگتا۔ جنت کے قریب سے جب ایک چھوٹی بیڑی میں ننگے پنڈے والے لوری چپو لہراتے ہوئے گزرے تو اُس نے چیخ کر مقامی زبان میں کہا، ''یہ طوفانِ نوح ہے، سب کچھ غرق کر دے گا۔ تم بھی مٹی میں مل جاؤ گے، میں بھی، دُنیا بھی...... جو بھی سندھو دیوتا سے پیار کرے گا اور اِس کی گود میں اچھے دِن گزارے گا، وہ بچ جائے گا۔ جو نفرت کرے گا، اِس کی رگیں کاٹے گا، وہ مر جائے گا۔ یہ میں نہیں، میرا مُرشد کہتا ہے۔''

ایک لمبی ریش والے سیاہ فام بُڈھے نے باچھیں چیر کر کہا، ''تم اپنے مُرشد کی نہیں، اپنی بات کرو۔''

''میری بات تو صاف اور سیدھی سی ہے۔ ہر کسی کی سمجھ میں آ سکتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جس نے بھی سندھو سے پیار کیا، اِس کے گن گائے وہی اِس کی برہمی کا شکار ہو گیا۔ ہر کوئی کہتا ہے، کیا مُہانے، کیا گھاڑو، کیا لوری، سب یہی کہتے ہیں کہ سندھو جنت ہے۔ کوئی یہ کیوں نہیں سوچتا کہ جنت ہمیشہ مرنے کے بعد ملتی ہے۔''

لوریوں نے مل کر نعرہ لگایا اور چپو فضا میں بلند کرتے ہوئے آگے نکل گئے۔ وہ دور تک اُسے مخاطب کر کے کچھ کہتے رہے مگر اُسے پانی کے شور اور ہوا کی پھانٹوں میں کچھ سنائی نہ دیا۔

اچانک فضا میں نامانوس سی بو پھیل گئی۔ شور میں بے تحاشا اضافہ ہوگیا۔ یوں لگنے لگا جیسے کوئی طوفان آنے والا ہو۔ اُس نے ستون کی آہنی ریلنگ کو تھام لیا۔ شمالی جانب دیکھا تو سارے بدن کا خون چہرے میں سمٹ آیا۔ پانی کا خونی ریلا آن پہنچا تھا۔ دور، بہت دور، پانی کی ایک چادر زمین سے اُٹھ کر اَدھ فلک تک جاتی دکھائی دے رہی تھی۔ درختوں کے درخت خوفناک آوازوں کے ساتھ چَٹ ہو رہے تھے۔ اضطراب اور خوف کی لہر پورے بدن میں پھر گئی۔ چند ہی لمحوں میں شور اتنا زیادہ بڑھ گیا کہ اُسے اپنے چیخنے چنگھاڑنے کی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اُسے یقین ہو گیا کہ اُس کی جنت اِس طوفانی لہر کا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔

یہ یقین موت کا سندیسہ تھا۔ وہ مرنا نہیں چاہتا تھا۔ اپنی جنت کو تباہ و برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اُس کے پاس بچاؤ کا وقت نہیں رہا تھا۔ ایسے میں افتخار بیگ کا کہا ہوا ایک جملہ یاد آ گیا، ''اگر پانی ستون سے اونچا ہوتا دکھائی دے تو ستون کو چھوڑ کر جنت کی چھت پر چلے جائیں۔ ستون ڈوب سکتا ہے، جنت نہیں ڈوب سکتی۔''

اُس نے بانس کو چھوڑا اور بجلی کی سی تیزی سے عرشے پر کود گیا۔ جسم کی پوری قوت کو بروئے کار لا کر بھاگتا ہوا زینوں تک آیا۔ چند لمحوں میں ہی وہ چھت پر پہنچ کر ریلنگ کو مضبوطی سے تھام چکا تھا۔ پانی کی چادر نصف میل کے فاصلے پر پہنچ چکی تھی۔ اُس کی اُٹھان اور درختوں کے ٹوٹنے اور اکھڑنے کی آوازوں نے پروفیسر پر موت کی سی کیفیت طاری کر دی۔ کیمرہ اُس کے کندھے سے لڑھک گیا اور وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اپنی طرف بڑھتی ہوئی موت کو دیکھنے لگا۔

دُنیا میں اپنی جنت بنانے والے کو بخوبی علم تھا کہ جنت ہمیشہ مرنے کے بعد ملتی ہے۔ اُسے یہ علم نہیں تھا کہ زندگی میں ملنے والی جنت محض ایک بہلاوا ہوتی ہے۔

...❀...

سکول میں چھٹیاں تھیں۔ قسمت کی ماما اُسے لے کر اپنے بھائی کے گھر آئی ہوئی تھی۔ قسمت یہاں بہت خوش رہا کرتی تھی مگر اِس مرتبہ معاملہ قدرے مختلف دکھائی دیتا تھا۔ وہ جب سے یہاں آئی تھی،

بے چینی اُس کے اَنگ اَنگ سے عیاں تھی۔ اپنے کزنز کے ساتھ زیادہ گھل مل بھی نہیں رہی تھی۔ بار بار اپنے گھر جانے پر مصر ہو جاتی۔

ماما کو اس غیر معمولی تغیر کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ ایک دِن اُس نے قسمت کو بُری طرح ڈانٹ دیا۔ وہ بجائے ماننے کے، رونے مچلنے لگ گئی۔ اُس کی گھر جانے کی ضد نے پورے گھر کو پریشان کر دیا۔ ماما نے ہر طریقہ آزما لینے کے بعد تنگ آ کر اُس سے پوچھا،''کیا مصیبت ہے قسمت! گھر میں کیا ہے جو تم یوں رو رو کر ہلکان ہوئی جا رہی ہو؟''

وہ روتے روتے چپ ہو گئی۔ سر جھکا کر بولی،''ماما! میری فینی پرابلم میں ہے۔ وہ مجھے مدد کیلئے بلا رہی ہے۔''

ماما نے سر تھام لیا۔ بڑبڑائی،''بھلا ایسا بھی کہیں ہوتا ہے؟ بے وقوف لڑکی وہ تو بے جان گڑیا ہے۔ نہ بولتی ہے، نہ کھاتی پیتی ہے، بس لیٹی رہتی ہے۔ گھر جائیں گے تو جی بھر کے اُس کی مدد کر لینا۔''

وہ پھر رونے لگی۔ چیختے چیختے منہ سے رالیں بہنے لگیں۔ چہرہ سرخ ہو گیا۔ ماما نے جلدی سے پکڑ کر چھاتی سے لگا لیا۔ جانتی تھی کہ یہی حالت زیادہ دیر تک رہی تو اُسے بخار چڑھ جائے گا۔ جلدی جلدی اپنا سامان پیک کرنے لگی۔ بھائی اور بھابھی نے قسمت کو منانے کی بہت کوشش کی مگر کون سمجھے، کون جانے کہ قسمت سمجھائے سے نہیں سمجھتی۔ منائے سے نہیں مانا کرتی...... یہ تو مرضی کی مالک ہے، جس پر اِس کا دل آ جائے، اُسے زمین سے اُٹھا کر اپنی پلکوں پر بیٹھا دے۔ جسے چاہے اپنی پلکوں سے جھٹک کر بے نشاں کر دے......کون جانے؟

......

سلطان علی نے محسوس کیا کہ اُس کا بڑھاپا تین جوانیوں کے سامنے کمزور پڑتا جا رہا ہے۔ اُس نے افتخار اور نورین کو اپنے دُکھ میں شامل کر لیا۔ اُن سے مدد طلب کرتے ہوئے اُسے یقین تھا کہ وہ وجدان اور مصباح پر خاندانی تعلقات کی اہمیت کو ثابت کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ چونکہ نورین وجدان سے بات نہیں کر سکتی تھی اِس لئے دونوں کے درمیان یہ طے پایا کہ افتخار وجدان کو

سمجھائے گا، نورین مصباح کا دماغ ٹھکانے لانے کی کوشش کرے گی۔ افتخار نے وجدان کو اعتماد میں لیتے ہوئے سمجھایا، ''دیکھو وجدان! زندگی اتنی بھی عام شئے نہیں کہ اِسے بچگانہ فیصلوں کی نذر کردیا جائے۔''

وجدان نے کہا، ''مگر یہ ایسی بھی نہیں کہ اِسے اپنی خواہش پر نثار کردیا جائے۔''

''تو پھر کیسی ہے؟''

''جیسی بھی ہے مگر جیسی تم کہہ رہے ہو، ویسی ہرگز نہیں ہے۔'' وجدان نے کہا، ''بھائی! میں جانتا ہوں کہ تمہیں پاپا نے میرے پیچھے لگایا ہے مگر کان کھول کر سن لو۔ اگر دُنیا میں کوئی شخص پروفیسر کو اپنی جنت میں جا کر رہنے سے روک نہیں پایا اور اُس نے بھری پُری دُنیا کو اپنی خواہش پر قربان کردیا تو میں کیوں اپنی مرضی نہیں کرسکتا؟ تم نے ہی تو مجھے کہا تھا کہ پروفیسر اُن چند ایک خوش نصیبوں میں سے ایک ہے جس نے جو چاہا، حاصل کرلیا۔ میں بھی خوش نصیبوں کی فہرست میں اپنا نام لکھوانا چاہتا ہوں۔''

''تم نے اِس رُخ پر نظر نہیں دوڑائی کہ پروفیسر کا دُنیا میں کوئی بھی نہیں جبکہ تم ایک مربوط خاندان کے ساتھ وابستہ ہو۔'' افتخار بیگ کے لہجے میں مخصوص ٹھہراؤ تھا۔

''کیا یہ خاندان ہمیشہ میرے ساتھ رہے گا؟''

''کیوں نہیں؟'' افتخار بیگ کو اُس کی سوچ پر افسوس ہوا، ''تمہارے پاپا کو خاندان نے کبھی اکیلا چھوڑا ہے جو تمہیں خود سے علیحدہ کردیا جائے گا۔ شاید تم احساسِ کمتری کا شکار ہو رہے ہو؟''

''نہیں۔ اگر میرا خاندان میرے ساتھ مخلص ہے اور کبھی بھی تنہا چھوڑنے کا ارادہ نہیں رکھتا تو اسے میری خواہش کو تسلیم کرنا چاہیے۔''

دونوں ہوٹل کی ایک ٹیبل پر آمنے سامنے بیٹھے اپنا اپنا مقدمہ لڑ رہے تھے۔ ایسے میں دوسرا مذاکراتی پنچ مصباح کے کمرے میں ڈیرہ جمائے بیٹھا تھا۔ نورین اور صادقہ نے مصباح کو گھیر رکھا تھا۔ نورین اُسے سمجھا رہی تھی، ''دیکھو مصباح! کیا عمران بھائی کی پسند انداوان ہماری محبت کو شیئر کرسکے گی؟ وہ اُس کمیونٹی سے تعلق رکھتی ہے جہاں فیملی ایسوسی ایشن کا رواج نہیں پایا جاتا۔ پرندوں

کی طرح پَر نکلنے پر اُڑ جانے والے لوگ محبت کو کیا جانیں، ایک دوسرے کے جذبات کو کیا سمجھیں؟''

مصباح نے مسکرا کر کہا،'' یہ عمران بھائی کا مسئلہ ہے، میرا یا تمہارا نہیں۔''

'' کیا وہ ہمارا کچھ نہیں لگتا؟''

صادقہ نے کہا،'' باجی! مجھے پتہ چلا ہے کہ آپ عمران بھائی کی اندھا دھند حمایت کر رہی ہیں۔ کیا یہ سچ ہے؟''

اُس کی نظروں کے سامنے انداوان کی تصویر لہرا گئی۔ دل میں بولی،'' ہے کوئی اِس کے جیسا تو سامنے آئے۔ وہ اپنی تمام تر خوبصورتی سمیت عمران کی زندگی میں آئے گی تو شہاب کا پُر کیف ساتھ مجھے میسر آ سکے گا۔ تم لوگ سمجھ نہیں سکتے کہ میں اپنے بھائی کیلئے نہیں، اپنے شہاب کیلئے لڑ رہی ہوں۔'' باری باری دونوں کو مسکرا کر دیکھا، بولی،'' تم لوگوں نے انداوان کو دیکھا نہیں ہے، اگر دیکھ لو تو تم بھی وہی کچھ کہنے لگو جو میں کہہ رہی ہوں۔''

نورین نے استہزائیہ انداز میں کہا،'' کیا وہ آسمان سے اُتری ہے؟''

'' آسمان سے ہر کوئی اُترتا ہے، اُس نے تو تمہارے خالہ زاد کو ایک نظر دیکھ کر شیشے میں اُتار لیا ہے۔''

'' کیا تمہارے گھر سے شروع ہونے والی روایت خاندان کو تنکا تنکا نہیں کر دے گی؟''

'' نورین! تم ایک چھوٹی سی بات کو خواہ مخواہ دل پر لے رہی ہو۔ کیا ہوا جو وجدان نے تمہارے ساتھ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اُس سے بہتر مَرد اِس معاشرے میں موجود ہیں۔ آج وہ وقت نہیں کہ ماں باپ نے جس کھونٹے سے باندھنے کا فیصلہ کر دیا، بچوں نے سر جھکا کر طوق گلے میں ڈال لیا۔ میں جانتی ہوں کہ سدرہ تم سے زیادہ خوبصورت نہیں، اتنے بڑے خاندان کی بھی نہیں مگر اِس کا کیا کیا جائے کہ وجدان کو اُس سے زیادہ اچھی کوئی لڑکی دُنیا میں دکھائی نہیں دیتی۔'' مصباح نے کہا،'' تم بہت اچھی ہو۔ خود کو پستی میں مت دھکیلو اور یہ ثابت کرو کہ اگر تمہیں وجدان نے قبول نہیں کیا تو تم بھی اُسے جوتے کی نوک پر رکھتی ہو۔''

نورین کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ سر جھک گیا۔ کن اکھیوں سے صادقہ کو دیکھ کر بولی،'' جسے آدھی عمر پلکوں

پر بیٹھائے رکھا ہوا اُسے کیسے جوتے کی نوک پر بیٹھایا جا سکتا ہے؟''

مصباح کے دل پر گھونسہ لگا۔ ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی، ''تم شدّت پسند واقع ہو رہی ہو نورین!''

''ہاں اور شاید وجدان اور عمران بھائی بھی......'' وہ اپنا جملہ مکمل نہیں کر پائی۔ گلا رُندھ گیا۔ گھٹنوں پر سر رکھ کر رونے لگی۔ دونوں اُسے چپ کراتے ہوئے ایک دوسرے کو عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگیں۔

اُن کے مایوس لوٹنے کے بعد اُس نے فون پر عمران کو اپنی کارگزاری کی رپورٹ دی۔ وہ پریشان ہو گیا۔ بولا، ''یہ تم دونوں کیا کرتے پھرتے ہو؟ میں نے ایسا کرنے کا تو ہرگز نہیں کہا تھا۔''

''سخت رویہ اپنائے بغیر کچھ حاصل ہوتا دکھائی نہیں دیتا بھائی!''

''مگر پھر بھی......''

وہ بات کاٹ کر بولی، ''اگر مگر کچھ نہیں۔ ہم ہر قدم سوچ سمجھ کر اُٹھا رہے ہیں، تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔''

عمران نے بادلِ نخواستہ وجدان کے منگنی توڑنے کے عمل کو برداشت کیا تھا۔ سدرہ کے بارے میں سنا تو یکبارگی سے اُسے احساس ہوا کہ معاملہ خاصا بگڑ چکا ہے مگر اس کی کمزور سی مزاحمت مصباح کی دلیلوں کے مقابلے میں زیادہ دیر ٹھہر نہ پائی۔ وہ ہتھیار ڈالتے ہوئے فکرمند لہجے میں بولا، ''اچھا خیر! میں اتنی دور بیٹھا ہوا ہوں کہ چاہوں بھی تو کچھ نہیں کر سکوں گا۔ جو مناسب خیال کرو، وہی راہ اختیار کرو مگر پاپا اور ماما کو اتنا بھی ہرٹ نہ کر دینا کہ ہم تینوں تمام عمر پچھتاتے رہیں۔''

آنے والے دو تین دِنوں میں ہی سلطان علی پےَ درپےَ ملنے والی ناکامیوں پر بجھ سا گیا۔ شکست کا احساس کمر توڑ رہا تھا۔ ایک رات میں اُس نے سبھی کو اپنے پاس بلا لیا۔ مصباح نے باپ کو دیکھا تو جگر کٹ کر رہ گیا۔ ارادہ پل بھر کیلئے ڈانواں ڈول ہوا مگر محبت کا جذبہ آن کی آن میں غالب آ گیا۔ پاپا نے سب سے پہلے اُسے ہی مخاطب کر لیا، ''مصباح! کیا تم تینوں بہن بھائیوں نے یہ طے کر لیا ہے کہ میں یا تمہاری ماما تمہاری خوشیوں کی راہ میں رکاوٹ بن رہے ہیں؟''

سر جھکا کر بولی، ''پاپا! ہم نے تو یہ سوچا تک نہیں۔''

ماما کچھ کہنا چاہتی تھیں مگر پاپا نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ بولے،''میں اِس خاندان کا بادشاہ ہوں۔ ہمیشہ سرنڈر کرنے کا عذاب سربراہ کو ہی جھیلنا پڑتا ہے۔''

وجدان اور مصباح کے سر جھکے ہوئے تھے۔

وہ بولے،''دیکھو بیٹا! نورین کو بہو بنانے کا فیصلہ غلط تھا۔ یہ کڑوی گولی ہمیں بہت پہلے نگل لینا چاہیے تھی کہ اِس گھر میں آنے والی عورتوں کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں ہے۔تمہاری خالہ کا گھرانہ ہم سے قطع تعلق کر چکا ہے اور میں نے بھی اِس حقیقت کے ساتھ مفاہمت کر لی ہے کہ مجھے اپنے خاندان کی نہیں،تمہاری ضرورت ہے۔''

وہ کچھ دیر کو رُکے۔مصباح نے دیکھا۔زندگی میں دادی کے انتقال پر پاپا کو غم سے نڈھال دیکھا تھا یا آج دیکھ رہی تھی۔

''عمران کو انداوان اور وجدان کو سدرہ مبارک ہو۔میں دونوں کے سر پر پیار کا ہاتھ رکھوں گا،دل اور آنکھ میں جگہ دوں گا۔مصباح تم فون کر کے اپنے بھائی کو خوش خبری سنا دینا۔'' پل پل چہرہ اور لہجہ تغیر پکڑ لیتا تھا۔سر جھکا کر بولے،''شریعت بیٹے اور بیٹی میں انصاف کا تقاضا کرتی ہے۔ مجھے بھی انصاف کرنا چاہیے۔مصباح! تمہارے دونوں بھائیوں نے من مانی کر لی ہے۔تم بھی کر سکتی ہو۔ جسے کہو گی،تمہیں دعاؤں کے ساتھ اُس کے ساتھ رخصت کر دوں گا۔''

ماما قدموں میں گر گئی۔اپنے نا کردہ گناہوں کی معافی مانگنے لگی۔مصباح کا حال دگرگوں ہو گیا۔ سوچنے لگی،''ہائے! میں کیسی بدقسمت ہوں۔ پاپا جیسے عظیم انسان کو اس حد تک غم زدہ کر چکی ہوں کہ اُنہوں نے اپنی اَنا کو بھی پس پشت ڈال دیا ہے۔ مجھے ہرگز ہرگز ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

کچھ کہنے کیلئے لب لرزے۔دل نے کمزوری پکڑ لی۔اپنی دُنیا کو اجڑتا ہوُا دیکھ نہیں سکتا تھا،فوراً کود پڑا۔خاموشی سے سمجھانے لگا،''تم ایک بے وقوفی کے بعد دوسری بے وقوفی کرنے چلی ہو نادان لڑکی! تمہیں رونے کے بجائے اپنی خوش بختی پر جشن منانا چاہیے تھا کہ سانپ بھی مر گیا اور لاٹھی بھی بچ گئی۔نافرمانی اور من مانی کا الزام بھائیوں پر آ رہا ہے،تمہیں مفت میں شہاب کی گود میں پھینکا جا رہا ہے......خاموش بیٹھی رہو۔آج نہیں تو کل،تمہارا باپ سنبھل جائے گا،مفاہمت کر لے گا اور ماہ دو ماہ

بعد اُسے یاد ہی نہیں رہے گا کہ اُس کی اولاد نے اُس کے فیصلے پر شدید نوعیت کی مزاحمت کی تھی۔''

لب بستہ اُٹھی۔ روتی ہوئی باپ سے لپٹ گئی۔ پھوٹ پھوٹ کر یوں روئی کہ پاپا کو بھی رُلا گئی۔ وجدان سر جھکائے، ماما سے نظریں چراتا ہوا بیڈ روم سے نکل کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ فون پر رابطہ کر کے اپنی سدرہ کو خوش خبری دینے لگا۔

سلطان علی اپنی بیٹی کو بہت چاہتا تھا۔ بچپن سے اُس کی حمایت میں بہت دور تک نکل جاتا تھا۔ اُس کی شکایت پر کان دھرتا تھا، دونوں بیٹوں کی شکایت پر دھیان تک نہیں دیتا تھا۔ جوان بیٹی سینے سے لگی ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ دل پسیج گیا۔ کھلی زلفوں کو چومتے ہوئے پیار سے کہنے لگا،''میری بیٹی! میری صَبو! کیوں روتی ہو؟ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں تمہاری آنکھ میں آنسو دیکھ کر بیمار پڑ جاتا ہوں، تم دُکھوں کی ندیاں بہانے پر تُلی ہو۔ تمہارا کوئی گناہ نہیں، گناہ تو تمہارے بھائیوں نے بھی کوئی نہیں کیا۔ بھلا کسی کو پسند کر لینا اور اُسے دنیا کے ہر رشتے، ہر فرد پر ترجیح دینا کوئی غیر فطری عمل ہے؟ نہیں میری جان! انسان بسا اوقات بہت بے اختیار ہو جاتا ہے۔ میں نے بھی تو نہ چاہتے ہوئے ہمیشہ تمہیں فوقیت دی ہے۔ اپنی بیوی پر، اپنے بیٹوں پر، اپنے خاندان پر......''

ماما کندھا سہلانے لگی۔ بولی،''آپ روتے ہوئے ہرگز اچھے نہیں لگ رہے۔''

پاپا نے جیسے سنا ہی نہیں، آنسوؤں سے رُندھی ہوئی آواز میں بولتا گیا،''یاد کرو بیگم! وہ رات جب مصباح بلاوجہ رو رہی تھی تو میں اِسے بہلانے کیلئے کندھے پر ڈالے شب بھر گلیوں میں، شہر کے پُر رونق بازاروں میں پاگلوں کی طرح ٹہلتا رہا تھا۔ یاد ہے ناں؟ وہ شب بھی یاد کرو جب عمران کو بے بی سائیکل پر سے گرنے کے باعث چوٹیں لگی تھیں اور وہ سونے کے بجائے ریں ریں کر رہا تھا۔ میں مصباح کو لے کر ڈرائنگ روم میں سونے کیلئے چلا گیا تھا......مصباح! میں زندگی میں صرف اپنی ماں کی تکلیف پر یا پھر تمہاری پریشانی میں جاگا ہوں۔''

مصباح کو اعتراف تھا۔ دُکھی ہونے کے ساتھ ساتھ نادم بھی ہو رہی تھی۔ دل سمجھ رہا تھا کہ وہ بازی ہارنے چلی ہے۔ اتنا اچھا موقع شاید پھر کبھی میسر آئے، فوراً زبان کو اپنی گرفت میں لے کر خود بولنے لگا،''پاپا! وہ شہاب......''

مصباح کے ریشمی بالوں میں سرکتا ہوا سلطان علی کا ہاتھ اچانک رُک گیا۔ آنکھیں ٹھہر سی گئیں۔ سنے پر اعتبار کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا مگر کانوں پر بھی مکمل بھروسہ تھا۔ لرزتی ہوئی آواز میں بولا، ''نہیں مصباح! اِس ایک لفظ کے آگے کچھ مت کہنا۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ تم کیا مانگ رہی ہو، جاؤ! شہاب جو کوئی بھی ہے، تمہارا ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

ماما نے چونک کر اپنے مجازی خدا کو دیکھا۔ وہ پہلے تو ایسا نہیں تھا؟ شروع شروع میں سارا دن اکیلی رہنے کے باعث بور ہو جاتی تھی۔ بڑے ہی چاؤ سے اُس نے ایک وصال شب میں ملازمت کی اجازت مانگی تھی جس کے جواب میں کئی دن تک اُسے آگ کی لپٹوں جیسے سوالات پر اشک بہانا پڑے تھے۔ آج بیٹی کی اَدھوری فرمائش پر مائل بہ سخاوت سلطان علی بہت مختلف اور عجیب دکھائی دے رہا تھا۔

......

بارش کا خاک آلود پانی جنت سے محض ایک فٹ کے فاصلے پر پہنچ چکا تھا جب ہنس کے منہ سے چیخ برآمد ہوئی اور اُس نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیے۔ ایک ہی لمحے میں اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی پھوٹ پڑی تھی۔

کافی دیر گزر گئی۔ اُسے یقین ہو گیا تھا کہ کشتی الٹ گئی ہے اور پوڈو پانی میں بہہ کر گڑھے میں پہنچ چکا ہے۔ اُس نے اپنی آنکھیں نہیں کھولیں اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، ''ہائے قسمت! ہماری کشتی تباہ ہو گئی۔ ہمارا پوڈو مر گیا۔ تم نہیں آئیں......''

ماما کی آواز کانوں میں پڑی۔ واہمہ سا تھا۔ بچپنا واہمے کو بھی پَرکھنے کا جذبہ رکھتا ہے۔ اُس نے جھٹ سے آنکھیں کھولیں۔ ماما کا دھندلا چہرہ دکھائی دیا۔ وہ اُس کے پاس ہی پیروں کے بَل بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ ماما سے لپٹ کر رونے لگا، ''ہائے ماما! میں قسمت کو کیا منہ دکھاؤں گا۔''

ماما نے اُس کے آنسو پونچھے، چوما اور پیار سے کہا، ''ہنس بیٹا! تم قسمت کو یہی پیارا پیارا منہ دکھاؤ۔ وہ تمہاری طرح بُزدل تھوڑی ہے۔ اُس نے تمہارے پوڈو کو بچا لیا ہے۔ وہ دیکھو!''

ہنس کا سینہ مسرت سے بھر گیا۔ اُس نے ماں کے اشارہ کناں ہاتھ کی طرف دیکھا۔ قسمت عین آنکھوں کے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اُس کی مسکراہٹ میں پوری زندگی کا چلن نہاں تھا۔ نصف عریاں سینے والی سفید فراک اور سیاہ نیکر پہنے قسمت اُس کے بہت قریب آ کر بیٹھ گئی۔ اُس کے کندھے پر اَبھی تک چھوٹا سا بیگ لٹک رہا تھا جس میں پانی کی چھوٹی سی فلاسک، لنچ بکس، ایک سوٹ اور جوتوں کا جوڑا ہر وقت موجود رہتا تھا۔ وہ ہنستی ہوئی آنکھوں سے اُسے دیکھتے ہوئے شرارت سے بولی، ''تم تو بڑے ڈرپوک ہو ہنس! اگر میں پہنچ نہ جاتی تو پوڈو مر جاتا، کشتی ڈوب جاتی۔''

ہنس نے کشتی کی طرف دیکھا۔ وہ سلامت تھی مگر پانی میں بھیگ گئی تھی۔ پوڈو کو دیکھا۔ یوں لگا جیسے وہ مسکرا رہا ہو۔ قسمت کا شکریہ ادا کر رہا ہو۔ وہ حیرت سے بولا، ''تم نے اِسے کیسے بچایا؟''

وہ اُٹھی۔ لہرا کر کشتی کے پاس گئی۔ دونوں ہاتھوں سے اُسے دو تین فٹ اوپر اُٹھاتے ہوئے بولی، ''یوں......''

ہنس نے خفت سے آنکھیں چُرا لیں۔ اتنا آسان سا کام وہ نہیں کر پایا تھا، قسمت نے کر دکھایا تھا۔ ماما نے قسمت کو چھاتی سے لگایا۔ ہنس کو اُٹھا کر کندھے پر ڈالا، قسمت کی انگلی پکڑی اور اپنے کوارٹر کی طرف بڑھ گئی۔ ہنس کا وجود تپنے لگا تھا۔ ایسے میں دوائی پلانا ضروری ہو گیا تھا۔

...❀...

پانی کی بلند لہر بس کسی پَل پہنچنے والی تھی۔ اچانک اُسے بے دھیانی میں سرزد ہو جانے والی غلطی کا شدّت سے احساس ہوا۔ اُس نے الیکٹرک جنریٹر پاورڈ آف کر دیا تھا مگر کنٹرول روم میں جا کر جنت کی تمام پاور سپلائی کو منقطع کرنے والا مین سوئچ کا لیور نہیں کھینچا تھا۔ اَب اُس کے پاس اتنا وقت نہیں رہا تھا کہ وہ کنٹرول روم تک پہنچ سکتا۔

وہ سانس روکے ریلنگ کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے تھامے کھڑا تھا۔ پھر اچانک جیسے اُس کی نظر دھندلا گئی ہو۔ ہر طرف پانی ہی پانی دکھائی دینے لگا۔ ریلے نے آن کی آن میں کنکریٹ کے بلند و بالا ستون کو نگل لیا۔ پانی کے چھینٹے بہت اوپر تک گئے۔ عرشے پر کافی سارا پانی آن گرا۔ جنت کو

جھٹکا لگا اور وہ ایک یا دو سیکنڈ میں دس فٹ کے لگ بھگ اونچی اُٹھ گئی۔ بری طرح ڈولتی رہی۔ پانی ''شَپ ڑَپ'' کی تیز آواز کے ساتھ نیچے سے گزرنے لگا۔ جنت میں اُمڈ آنے والے پانی نے اپنا کام دکھا دیا تھا۔ کنٹرول روم میں تڑتڑاہٹ کی مخصوص آواز گونجی اور اُس کے ساتھ ہی کئی ننھے ننھے دھماکے سنائی دیے۔ پروفیسر کا چہرہ بجھ گیا۔ اُس کا بجلی کا نظام ناکارہ ہوگیا تھا مگر اِس وقت اُس کی تمام تر توجہ اپنی جان اور جنت کو بچانے پر مرکوز تھی۔

اچانک لہر دم توڑ گئی۔ جنت ''شَپ'' کی تیز ناگوار آواز کے ساتھ نیچے آئی۔ ایسے میں پروفیسر اپنا توازن اور گرفت برقرار نہ رکھ سکا اور لڑھکتا ہوًا عقبی ریلنگ میں آ کر اَٹک گیا۔ اگر غیر ارادی طور پر اُس کا پیر ریلنگ میں اَٹک نہ جاتا تو وہ ریلے کے ساتھ ہی آناً فاناً میلوں دور نکل چکا ہوتا۔ ریلنگ نے اُس کا وزن بمشکل ایک یا دو منٹ تک سہارا پھر زوردار آواز کے ساتھ ریلنگ کی فاؤنڈیشن کا چوبی تختہ اکھڑ گیا۔ جنت کا اگلا حصہ اوپر کی جانب اُٹھا، پھر یک لخت نیچے گر گیا۔ وہ آگے کی جانب لڑھک آیا۔ ایسے ہی وقت میں اُسے زندگی کی قیمت کا اندازہ ہو رہا تھا۔

ایک درخت ستون کے ساتھ اَٹک گیا۔ پانی کا دباؤ نسبتاً کم ہوگیا۔ دس منٹ تک زندگی اور موت کی کش مکش جاری رہی، پھر ہر آنے والے منٹ میں زندگی کا گراف بلند ہونے لگا۔ موت کی لکیر نیچے کی طرف جھکنے لگی۔ پانی کی سطح اَبھی بھی کافی بلند تھی مگر خطرہ ٹل گیا تھا۔ پروفیسر تیزی سے ہلکورے لیتی جنت کی عقبی ریلنگ تک آیا۔ پاؤں کی ٹھوکر سے اکھڑے ہوئے تختے کو اپنی جگہ پر بیٹھایا اور فرسٹ فلور پر آ گیا۔ صحن نما عرشے میں کافی سارا پانی بھر گیا تھا۔ سرِ دست پانی نکالنے کا سسٹم غیر فعال تھا۔ وہ پانی میں سے گزر کر ٹاور پر چڑھا۔ دیکھا کہ مورچہ سوراخوں تک بھر چکا تھا۔ بجلی کی تاریں جل چکی تھیں۔ واٹر پمپ میں کئی شاخیں پھنسی ہوئی تھیں جنہیں فوری طور پر نکالنا ضروری نہیں تھا۔ ٹاور کے ساتھ اَٹکے ہوئے درخت سے جان چھڑانا بہت ضروری تھا۔ ایسا ہی ہوتا ہے۔ وہی درخت جو چند منٹ پہلے بہت اچھا لگ رہا تھا، وہی جان بچ جانے پر بُرا لگنے لگا تھا۔

درخت سے جان چھڑانے میں کافی سارا وقت لگ گیا۔ فارغ ہوًا تو اپنے اطراف میں پانی کا انسانی جانوں اور مال واسباب سے بھرا ہوًا شکم دیکھ کر فرطِ کرب سے بلبلا اُٹھا ''اے کم بخت ساگر!

کیا تیری پیاس ایک دو انسانوں کے خون سے بجھنے والی نہیں ہے جو تم نے بھری پُری بستیاں اُجاڑ کر رکھ دیے ہیں۔ یہ کیسی تشنگی ہے جو غریبوں کی شہ رگ چوسنے سے سیراب ہوتی ہے؟ کیا تجھ پر امیروں کا خون حرام قرار دے دیا گیا ہے؟''

پانی کی سطح بتدریج کم ہو رہی تھی مگر تاحدِ نگاہ دکھائی دینے والے پانی کو دیکھ کر پروفیسر کے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے۔ پانی میں جا بہ جا گھروں کی بکھری ہوئی چھتوں کا ملبہ، چار پائیاں، مویشیوں کے بے جان وجود اور کہیں کہیں آڑھی ترچھی بہتی ہوئی انسانی نعشیں جنہیں دیکھ کر ذہن چند ثانیوں کیلئے کام کرنا چھوڑ دیتا تھا۔ کسی جانب سے ڈکراتے مویشیوں کی سماعت شکن آوازیں، کہیں سے اُبھرتی، ڈوبتی، آخری جدوجہد میں مصروف عمل انسانی زندگی...... وہ سوچنے لگا ''یہ کیسی جنت ہے جس کے اطراف میں چاروں طرف موت اور جہنم کے شعلے آسمان تک بلند ہوتے دکھائی دیتے ہیں؟''

پھر اچانک اُس کے منہ سے قہقہہ اُبل پڑا۔ کوئی اُسے اِس کیفیت میں دیکھتا تو یقیناً پاگل قرار دیتا۔ ہنستے ہنستے اُس کی آنکھیں تر ہو گئیں۔ بدن پہلے ہی تر تھا۔ دونوں بانہیں آسمان کی طرف کر کے منہ اُٹھایا اور حلق پھاڑ کر چیخا ''دیکھ لے پروردگار! یہی کنگر، یہی غریب مُہانے جنہیں درست تلفظ کے ساتھ کلمہ گوئی کا ہنر بھی نہیں آتا، بدیشی زبان میں اپنے ہی منہ سے نکلنے والے الفاظ کی معنویت کا ادراک بھی نہیں رکھتے مگر یہ لوگ جب بھی بیڑی کو پہلی مرتبہ پانی میں اُتارتے ہیں تو تیرا نام لیتے ہیں۔ کہتے ہیں تو ہی اِس نیا کو پار لگانے والا ہے، ہم کچھ نہیں ہیں۔ جو کچھ بھی ہے، تو ہی ہے۔ یہی لوگ جیتے جی جہنم واصل ہو جاتے ہیں۔ جس پانی پر اِن کی گزران ہوتی ہے، وہی پانی اِن کیلئے تیزاب بن جاتا ہے اور جو لوگ......''

کڑاک کی زوردار آواز کے ساتھ بیلے میں کھڑا ایک یوکلپٹس کا درخت (سفیدہ) ٹوٹ کر گرا۔ پروفیسر نے چونک کر بیلے کی طرف دیکھا۔ درخت کا زمین سے رابطہ بحال رہا تھا مگر آسمان کی طرف لپک ختم ہو چکی تھی۔ وہ سر جھٹک کر اپنی ادھوری تان کو جوڑنے لگا ''ہاں اے پیدا کرنے والے! میں کہہ رہا تھا کہ جو لوگ فیکٹری لگاتے ہیں، کہتے ہیں کہ ہم نے بڑی جانفشانی سے لاکھوں روپے اکٹھے

کئے۔ رشوت دے کر پرمٹ حاصل کیا۔ فراڈ کر کے زمین حاصل کی۔ سفارش کرائی اور محکمہ بلڈنگ والوں نے عمارت کھڑی کر دی۔ غیر ملکی کمپنیوں نے قسطوں پر مشینری لگا دی۔ اَب ہم محنت کریں گے اور دونوں مگرمچھوں کا پیٹ کاٹنے کیلئے غریبوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹیں گے۔ جب زیادہ پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے، تب ناکارہ گانٹھوں کو آگ دِکھا کر انشورنس والوں سے دُگنی رقم حاصل کر لیتے ہیں۔ بُنت سے اُجاڑ تک کہیں بھی تمہارا نام نہیں لیتے۔ اُن کیلئے یہ دُنیا بھی جنت، وہ نگری بھی جنت...... یہ کیسا انصاف ہے؟ تمہیں ماننے والوں پر ملیریا بھی جان لیوا، گردن توڑ بخار بھی لاعلاج...... ایک طرف تمہاری خوشامد کرتے ہیں، ایک طرف تمہارے نوازے ہوؤں کی نازبرداریاں اُٹھاتے ہیں۔ جو چند لقمے جان توڑ محنت کے بعد کماتے ہیں اُن میں سے بھی تمہارے ایجنٹ حصہ مانگنے کیلئے موقع بے موقع پہنچ جاتے ہیں۔ یہ کیسا انصاف ہے؟ کبھی تم نے سوچا کہ اِن بے چاروں کو پیدا کرنے کا مقصد کیا تھا؟ کیا یہی کہ کبھی شیر کے جبڑوں میں آ گئے، کبھی تندوے کا شکم بھرنے لگے، کبھی بھیڑیا اُٹھا کر لے گیا......''

وہ جسے سُنا رہا تھا، وہ یقیناً سن رہا تھا۔ چیخ چیخ کر ہانپنے لگا۔ اندیشوں میں بیتنے والی گزشتہ تمام رات کا رت جگا بدن توڑنے لگا تھا۔ کافی دیر سے کچھ کھایا پیا بھی نہیں تھا۔ خود کو سنبھال کر فرسٹ فلور کا جائزہ لینے لگا۔ بیڈروم اور سٹور کا فرش کیچڑ آلود ہو چکا تھا۔ پانی نے بیڈروم کا قالین خراب کر دیا تھا۔ کنٹرول روم میں گیا۔ وہاں گھٹنوں تک پانی کھڑا تھا۔ تمام آلات ناکارہ ہو چکے تھے۔ اسٹڈی روم محفوظ رہا تھا۔

دانت پیس کر بڑبڑانے لگا۔ پہلے جان کے لالے پڑے ہوئے تھے، جان بچی تو جنت کی پامالی پر غصہ آنے لگا۔ جھنجلاتا ہوُا کچن میں آیا۔ چائے بنانے لگا۔ چائے پی کر عرشے پر آیا۔ اگر الیکٹرک سسٹم کارگر رہتا تو وہ ایک بٹن دبا کر سارا پانی نکال دیتا۔ اَب بالٹیاں بھر کر دریا میں پھینکنے کی مشقت اُٹھانا پڑی۔ نصف گھنٹہ بیت گیا۔ اِس دوران جنت کے قریب سے گزرنے والے کئی ڈوبتے ہوئے افراد نے اُس سے مدد مانگی مگر اُس نے کسی پر توجہ دینے کی زحمت نہیں کی۔ محکمہ موسمیات کی پیشین گوئی کے مطابق اَب کوئی خطرہ نہیں تھا۔ جو ہونا تھا، ہو چکا تھا۔ دریا نے جو گل کھلانا تھا، کھلا چکا تھا۔ وہ

شام تک جنت کی صفائی اور دیکھ بھال میں مصروف رہا۔شام کو تھک کر اپنے کام کا تنقیدی انداز میں جائزہ لیا۔سوائے بجلی کے نظام کے سب کچھ بالکل ٹھیک ہوگیا تھا۔اُسے اندازہ تھا کہ جنت کی شاید تمام وائرنگ از سرِنو کرنا پڑے۔

چھت پر آیا۔لوہے کے پائپوں والی چار پائی غائب ہوچکی تھی۔اُس کا غم کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔اَب تک تو وہ تونسہ بیراج کی یاترا کرچکی ہوگی۔ریلنگ کے ساتھ کمر ٹکا کر بیٹھ گیا۔موبائل بچ گیا تھا، ہینڈی کیم میں پانی گھس گیا تھا۔اتنا علم رکھتا تھا کہ ایسے میں اگر کیمرے کو آن کرے گا تو اُس کا تمام تر سرکٹ شارٹ ہوجائے گا اور وہ مکمل طور پر ناکارہ ہوجائے گا۔شاید مرمت کے قابل بھی نہ رہتا۔موبائل پر افتخار بیگ سے رابطہ کیا۔چھوٹتے ہی بولا ''افتخار بیٹا! پانی کے ریلے نے جنت میں تباہی مچادی ہے۔مجھے مین سوئچ بند کرنے کی مہلت نہیں ملی اور پانی نے جنت کی تمام وائرنگ جلا کر راکھ کردی ہے۔''

افتخار نے پریشان ہوکر پوچھا ''جنریٹر کی کیا پوزیشن ہے؟''

''میں اُس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

''چلا کر دیکھا ہے؟''

''نہیں۔وہ پانی میں ڈوب گیا تھا۔آن کرنے سے ڈرتا ہوں، کہیں وہ بھی داغِ مفارقت نہ دے جائے۔''

''کنٹرول روم کی کیا پوزیشن ہے؟''

پروفیسر نے کنٹرول روم کی صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے بعد فرداً فرداً جنت کے ہر حصے کی رپورٹ دی۔یہ بھی بتایا کہ ایک کرسی، ایک چار پائی اور چند برتنوں کے علاوہ ہر چیز محفوظ رہی ہے۔افتخار بیگ نے پوچھا ''میرے لئے کیا حکم ہے؟''

''وقت نکالو اور آکر میری جنت کو وہی شکل دے جاؤ جو پانی آنے سے پہلے تھی۔'' پروفیسر نے اُمید بھرے لہجے میں کہا۔

''کیا آپ کے پاس پہنچنے کا راستہ ہے؟'' افتخار بیگ نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ تم بہ آسانی یہاں نہیں پہنچ سکتے۔''

''تو پھر؟''

''انتہائی مخدوش صورت حال ہے۔ موٹر بوٹ پتن تک جا سکتی ہے۔ پتن دکھائی نہیں دیتا۔ پتن کے پار جہاں تک نظر جاتی ہے، پانی ہی پانی دکھائی دیتا ہے۔ ایسے میں سوائے دو چار روز صبر کرنے کے شاید کچھ نہیں کیا جا سکتا۔'' پروفیسر نے مشرقی جانب دور تک چمکتے ہوئے پانی کو دیکھتے ہوئے مایوسی سے کہا۔

''آپ کسی طرح وہاں سے نکل آئیں اور چند دِن شہر میں رہ لیں۔ پانی اُترنے پر اکٹھے جائیں گے اور جنت کا چیک اَپ کریں گے۔'' افتخار نے مشورہ دیا۔

وہ بولا ''یہ ناممکن ہے۔ میری عدم موجودگی میں مور اور کیہل میری جنت کے حصے بخرے کر لیں گے۔ ویسے بھی امدادی ٹیمیں آج یا کل یہاں پہنچ جائیں گی۔ وہ امداد کے نام پر محض لوٹ مار کرنے کیلئے یہاں تک آتی ہیں۔ مجھے اِن سفید پوش لٹیروں سے اپنی جنت کو بچائے رکھنے کیلئے یہاں رہنا ہوگا۔ کوئی بات نہیں، دو چار دِن بجلی کے بغیر کاٹ لوں گا۔'' پروفیسر نے کہا۔

''او کے سر! میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔'' افتخار بیگ نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔

چند ہی لمحوں کے بعد ڈاکٹر اَشو لال کی کال آ گئی۔ وہ پروفیسر کے بارے میں خاصا متفکر تھا۔ مکمل احوال لے کر کچھ مطمئن ہوا۔ بولا ''سئیں میڈا! تَیں بہوں وَڈی غلطی کیتی ہِے جو سچی جنت کیتے کُجھ نئیں کیتا۔ ایہو سَمے ہئی جیہڑا تیکوں رَب دے گوڈیں بَہا سگدا ہئی۔''

(میرے محترم! تم نے بڑی غلطی کی جو حقیقی جنت کے حصول کیلئے کچھ نہیں کیا۔ یہی تو موقع تھا جو تمہیں خدا کے بہت قریب کر سکتا تھا۔)

وہ ہنسا ''سوہنے مُرشد! یہ کتابی باتیں ہیں۔ تم نے سندھ ساگر کی یاترا ہمیشہ اُن دنوں میں کی ہے جب یہ موئے ناگ کی طرح چپ چاپ لیٹا ہوتا ہے۔ آج تم یہاں ہوتے، مرتے ہوؤں کی بے بسی دیکھتے، اُن کی فریادیں سنتے تب تمہیں پتہ چلتا کہ حقیقی دُنیا اور لفظوں کی دُنیا میں کتنا تضاد موجود ہے۔ میرے سمیت ہر کوئی اپنی بقاء کی جنگ لڑ رہا تھا۔ نفسانفسی کا عالم میں نے دیکھا ہے، تم نے نہیں۔''

''آہ پروفیسر! تمہیں موت بھی زندگی کا درس نہیں دے پائی تو مجھ فقیر کے راکھ زدہ بوسیدہ جملوں کی تمہارے سامنے حیثیت کیا ہوگی۔ کیا تمہیں یہ اندازہ بھی نہیں ہوا کہ تم جس پانی کو ہر روز اپنی پیاس بجھانے کیلئے حلق میں اُتارتے ہو، اشتعال پکڑ کر وہ کتنا طاقتور ہو جاتا ہے؟'' ڈاکٹر اَشو کے لہجے میں گہری یاس پنہاں تھی۔

''ناں بابا! اِس کے علاوہ بھی بہت کچھ محسوس کیا ہے میں نے۔ میں جب جنت کیلئے لکڑی خریدنے کیلئے پہاڑوں پر گیا تھا، وہاں میں نے اِسی دریا کی بے بسی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ عدم توازن والے معاشرے میں یہی کچھ ہوتا ہے۔ اونچی جگہ پر سندھو سئیں بھی گردن جھکا کر گزرتا ہے۔ نیچی جگہ پر آتا ہے تو بھوکے شیر کی طرح چنگھاڑنے لگتا ہے۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ یہی درندہ سمندر میں گرتے وقت جوان بیوہ کے سفید دوپٹے میں جذب ہونے والے آنسوؤں کی طرح بغیر کسی مزاحمت کے اپنا وجود تحلیل کر دیتا ہے۔'' وہ بولا۔

''اچھا پیارے! ہم نے تین چار گروپ طبی امدادی کارروائیوں کیلئے تشکیل دیے ہیں۔ وہ اَب تب میں نکلنے والے ہیں۔ تم ذرا اپنی جنت کی لوکیشن سمجھاؤ، موقع ملا تو تمہاری جنت کو ضرور دیکھنے کیلئے آؤں گا۔''

''نہیں مُرشد!'' پروفیسر نے جلدی سے کہا ''میری جنت کی تاب گہنائی ہوئی ہے۔ جب پھر جوان ہوگی، تمہیں دکھانے کیلئے دعوت دوں گا۔ اَبھی زحمت نہ کرو۔''

''چلو ٹھیک ہے سئیں! جب اجازت دو گے، تب حاضری دوں گا۔ اَب دعا ہی کر سکتا ہوں کہ اللہ تجھے ہدایت کا راستہ سجھا دے۔'' اَشو لال نے پورے خلوص کے ساتھ دعا دے کر فون بند کر دیا۔

جیسی رات آج اُترنے والی تھی، وہ اس جیسی اَن گنت راتیں بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ اندھیرے میں ڈوبی ہوئی جنت کا رابطہ پوری دُنیا سے منقطع ہو گیا تھا۔ وہ نیم دیوانگی میں باری باری ہر چیز کے پاس گیا۔ ہر ایک پر ہاتھ پھیر کر منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑایا۔ ٹی وی کی سکرین پر ہاتھ پھیر کر مغموم لہجے میں بولا ''تم بالکل ٹھیک ہو مگر مجھے کوئی رنگ بھری دلکشی دکھانے سے معذور ہو۔ انسان میں روح، تمہارے بدن میں بجلی، ایک ہی بات ہے۔ ایک دِن میں بھی تمہاری طرح بے جان ہو جاؤں گا۔

دیکھنے میں بالکل ٹھیک ٹھاک دکھائی دوں گا۔‘‘

موم بتی کی مدھم سی روشنی میں اُس نے کھانا تیار کیا۔ کھانا کھایا اور سٹور میں سے ایکسٹرا چار پائی نکال کر چھت پر آ گیا۔ اس نے ہنگامی صورتِ حال میں استعمال کی غرض سے اِس جیسی اور بھی تین فولڈنگ چار پائیاں سٹور میں رکھی ہوئی تھیں۔ لیٹا تو نئی مصیبت درپیش آنے لگی۔ فضا موٹے موٹے مچھروں سے بھری ہوئی تھی۔ مچھروں کے ساتھ ساتھ اور بھی کئی قسم کے پتنگے ٹولیوں کی صورت میں اڑتے دکھائی دے رہے تھے۔ موبائل فون کے ڈسپلے کی روشنی میں سٹور سے مچھر دانی نکال لایا۔ چار پائی پر مخصوص انداز سے فٹ کرنے کے بعد ایک طرف سے پلو اُٹھا کر اندر گھس گیا۔

اصولی طور پر اُسے سونا نہیں چاہیے تھا۔ بخوبی جانتا تھا کہ اتنا بڑا سیلابی ریلا اپنے جلو میں ہزاروں سانپ بچھو لئے چلتا ہے۔ نیند کی غفلت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کوئی سانپ عرشے پر چڑھنے میں کامیاب ہو گیا تو بڑی مشکل پیدا کر دے گا۔ ایسے میں مقولہ صادق آتا ہے کہ نیند تو سُول پر بھی آ جاتی ہے۔ وہ دو دِنوں سے بے آرام تھا۔ لیٹا تو فوراً ہی دُنیا و مافیہا سے غافل ہو گیا۔

جانے رات کا کون سا سَمے تھا جب اُس کی آنکھ چیخ کی تیز اور سماعت میں چبھنے والی آواز پر کھل گئی۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ اندھیری رات میں مچھر دانی کے پار کچھ دکھائی نہیں دیا تو اچھل کر چار پائی سے اُتر آیا۔ چند ساعتوں میں ہی نیند کا خمار جاتا رہا۔ وہ سیڑھیاں اُتر کر فرسٹ فلور پر آیا۔ سٹور میں سے تیز سرچ لائٹ اُٹھائی۔ شکر ہوُا کہ اس کی چارجنگ بدستور سلامت تھی۔ فضا میں بالکل سکوت طاری ہو گیا تھا۔ چیخ کی تیز آواز دوبارہ سنائی نہیں دی تھی۔ اُس نے جنت کی احاطی راہ داری کا چکر کاٹا۔ سرچ لائٹ خاص قسم کی تھی۔ اُس کی روشنی کا ہالہ عام لائٹس سے کہیں بڑا تھا۔ کوئی دکھائی نہیں دیا۔ وہ ستون پر چڑھا۔ دور دور تک بہ غور دیکھا۔ سر جھٹک کر چلانے لگا’’کوئی ہے؟......کوئی ہے؟‘‘

کان لگائے مگر کچھ سنائی نہیں دیا۔ وہ پھر چلایا۔ اِس مرتبہ اُس کی آواز خاصی بلند تھی۔ جواب میں ستون سے چند گز کے فاصلے پر پانی میں ’’چھپ‘‘ کی آواز اُبھری۔ اُس نے لائٹ کا رُخ اُس طرف کیا۔ دیکھا، یوں لگا جیسے بدن میں بہنے والی کوئی رَگ کٹ گئی ہو۔ ایک عریاں بازو پانی سے نکلا ہوُا تھا جبکہ پانی کی سطح پر دو تین مربع فٹ کے دائرے میں سیاہ بال تیر رہے تھے۔ جنت کی

فاؤنڈیشن کے اگلے حصے کے ایک آہنی ہُک میں پھنسا ہوا ہاتھ بھی دکھائی دے رہا تھا۔ وہ حلق کے بل چیخا۔ بالوں کے تلے پانی میں ڈوبے ہوئے بدن میں کوئی حرکت نہیں ہوئی تو وہ ستون سے اُتر کر عین بالوں کے اوپر جا کھڑا ہوا۔ ریلنگ پر جھک کر پھر چیخا مگر ہُک میں پھنسنے والی شاید دم توڑ چکی تھی۔

اُس نے سرچ لائٹ کا ہالہ کم کیا اور ہُک میں پھنسے ہوئے ہاتھ کو بغور دیکھا۔ اُسے اندازہ ہو گیا کہ اگر ہاتھ کی انگلیاں ہُک سے نکالی نہ گئیں تو نعش یہیں اَٹکی رہے گی۔ سورج کے طلوع ہونے کے ساتھ تعفن پکڑ لے گی اور سانس لینا محال کر دے گی۔ وہ ستون پر چڑھ کر بانس کی مدد سے گرفت چھڑانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ بالوں میں مخصوص حرکت دکھائی دی۔ ایک نسوانی چہرہ سطح آب پر اُبھرا۔ آنکھوں میں پڑنے والی روشنی کی بدولت عورت نے اوپر کی جانب دیکھا۔ دوسرے ہاتھ کو ہُک تک پہنچانا چاہا مگر ناکام ہونے پر چلائی ''بچاؤ، مجھے بچائے کوئی......''

کہتے ہیں کہ بعض کہانیاں زندگی میں اتنی اہمیت رکھتی ہیں کہ ایک پَل میں کھلتی ہیں اور سب کچھ لپیٹ کر آگ کے حوالے کر دیتی ہیں۔ وہ بھی شاید ایسی ہی کہانی تھی۔ وہ بھی شاید ایسا ہی قیامت آگیں لمحہ تھا۔

پروفیسر کی رگوں کا خون جیسے دِل میں بھر گیا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں دَبی قیمتی سرچ لائٹ چھوٹ کر پانی میں جا گری۔ کئی لمحے گزر گئے۔ پروفیسر کے کپکپاتے لبوں سے بس اتنا ہی نکلا ''سموں......''

سرچ لائٹ کی روشنی میں دکھائی دینے والی رات کے اندھیرے میں نگاہوں سے اوجھل ہو گئی مگر اُس کی آواز مسلسل کانوں کے پردے پھاڑ رہی تھی۔ اچانک جیسے پروفیسر کو ہوش آ گیا۔ وہ بھاگ کر ستون پر چڑھا۔ ہک میں اَٹکا ہوا بانس نکالا اور اُس کی کڑے والی سمت ڈوبنے والی کے سامنے پانی میں ڈال دی۔ حلق کے بَل چیخا ''دائیں ہاتھ سے اِس کڑے کو تھام لو۔ جلدی کرو۔''

سموں نہ جانے کب سے زندگی کی جنگ لڑتی آ رہی تھی، اُس کے ناتواں بدن میں اتنی بھی سکت باقی نہیں تھی کہ کڑے کو تھام سکتی۔ پروفیسر نے بانس واپس اپنی ہُک میں لٹکا دیا اور پانی میں کود گیا۔ چھلانگ لگاتے ہی اُسے پانی کی تیز رفتاری کا احساس ہو گیا۔ بہ دقّت تمام پلٹا اور سموں کو بالوں سے

پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے لگا۔ وہ جنت کی ہک کو چھوڑنے پر تیار نہیں تھی۔ پروفیسر نے ایک جھٹکے کے ساتھ اُسے کھینچ لیا اور گھسیٹتے ہوئے جنت کی فاؤنڈیشن کے ساتھ ساتھ تیر کر بوٹ کے گیراج تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔ جنت میں سوار ہونے کا اِس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا۔ دس منٹ کی اعصاب شکن جدوجہد کے بعد وہ سموں کے نڈھال اور بغیر مزاحمت والے بدن کو بوٹ گیراج میں پہنچانے میں کامیاب ہوگیا۔ بدقّت تمام اُسے بوٹ پر چڑھایا۔ خود بوٹ روپ کو پکڑ کر اسٹیل کی سیڑھیاں چڑھ کر عرشے پر آ گیا۔ چند لمحوں کے بعد سموں کا بے جان وجود عرشے پر چاروں شانے چت پڑا تھا۔ اُس کا پیٹ پھولا ہوُا تھا۔

اندھیرے کے باعث اُس کے خال وخد دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ پروفیسر نے فوری طور پر پیٹ کو دونوں ہتھیلیوں کی مدد سے دَبایا۔ پہلا دَباؤ نہائت خفیف تھا۔ پیٹ میں پانی کے بجائے بچہ ہونے کا احتمال بھی تھا۔ جب اُسے یقین ہوگیا کہ وہ ماں بننے والی نہیں ہے تو اُس نے سموں کو پہلو کے بل لٹایا اور پیٹ کو پچکا کر پانی نکالنے کی کوشش کی۔ کامیاب رہا اور ''اوبھ'' کی آواز کے ساتھ سموں کے منہ سے ڈھیر سارا پانی چھلک پڑا۔ پروفیسر نے اس کا منہ کھولا۔ حلق میں انگلی مار کر قے کروائی۔ یکے بعد دیگرے اُس نے کئی طریقے اپنائے۔ پیٹ نیچے بیٹھ گیا تو نبض اور دھڑکن چیک کرتے ہوئے مطمئن انداز سر ہلانے لگا۔

اندھیرے میں سموں کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ گیلا اور گلا ہوُا لباس اُس کے بدن پر آکٹوپس کی طرح چپکا ہوُا تھا۔ پروفیسر کا ذہن برق رفتاری سے سموں کی بحالی صحت کیلئے آئندہ کا لائحہ عمل سوچ رہا تھا۔ پندرہ بیس منٹ کی غنودگی نما بے ہوشی کے بعد سموں کو ہوش آ گیا۔ کافی دیر تک اُس کے لبوں سے کوئی لفظ برآمد نہیں ہوا۔ پروفیسر اُس پر نظریں جمائے ریلنگ کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ سگرٹ کے لمبے لمبے کش لگاتا رہا، سوچتا رہا کہ وہ رات کے اِس پہر میں دریائی ریلے میں کہاں سے بہہ کر آئی ہوگی؟ یہی توجیہہ ذہن میں اُبھری کہ اُس کا سسرالی گاؤں دریا کے کنارے اوپر کی جانب کہیں واقع ہوگا۔ اگر ایسا تھا تو پھر اُس کا خاوند، بال بچے اور گھر کے دوسرے افراد کہاں تھے؟

پھر جب وہ نقاہت آمیز انداز میں اُٹھ کر بیٹھ گئی تو پروفیسر نے پوچھا ''کیا تم اَب بالکل ٹھیک ہو؟''

اُس نے چونک کر پروفیسر کی طرف دیکھا۔ اندھیرے کی وجہ سے پہچان نہیں پائی۔ شاید روشنی میں بھی پہچان نہ پاتی۔ پروفیسر کے چہرے پر بیتے ہوئے ماہ وسال کی گرد اتنی پڑ چکی تھی کہ وہ بہ آسانی پہچانا نہیں جا سکتا تھا۔ سرچ لائٹ کی روشنی میں سموں کو پہچان لینے میں نظر کا کمال کم اور دل کا کردار زیادہ تھا۔ اِس حقیقت کو بھی جھٹلانا مشکل تھا کہ ڈھلی ہوئی عمر نے بھی سموں کے نقوش میں کوئی خاص تبدیلی پیدا نہیں کی تھی۔

پروفیسر اُسے سہارا دے کر چھت پر لے آیا۔ مچھردانی اُٹھا کر اُسے چارپائی پر لیٹنے کا اشارہ کیا اور خود زینے اُتر کر کچن کی طرف بڑھ گیا۔ اُسے یہ اندازہ بھی تھا کہ آنے والے ایک گھنٹے میں سموں کو تیز بخار آن دبوچے گا۔ ایسے میں اُسے علاج معالجے کی بھی ضرورت ہوگی۔

...❁...

تھکا ہارا شوہر چارپائی میں چاروں شانے چت لیٹا ہوا تھا۔ شاں اُس کی ناز برداریاں کر رہی تھی۔ ادھر ادھر جاتے ہوئے سمجھاتی جاتی تھی کہ اُسے اتنا زیادہ کام بھی نہیں کرنا چاہیئے کہ صحت ہی بگڑ جائے۔ وہ اپنے شوہر کی نازک بدنی سے پوری طرح آگاہ تھی۔ جانتی تھی کہ وہ بہت نفیس مزاج انسان ہے، خواہ ارادوں میں جتنا بھی سخت جاں ہو۔

''ہنس کے پوڈو کا کیا حال ہے؟''

وہ تفصیل سے بتانے کے بعد بولی ''ہنس کو اتنا بھی بُزدل نہیں ہونا چاہیے۔ ہم نے اُسے کبھی ڈانٹا نہیں، کبھی مارا پیٹا نہیں اور نہ ہی کسی شئے کا ڈراوا دیا ہے۔ پھر وہ ایسا کیوں ہے؟''

''وہ پہلے تو ایسا نہیں تھا۔''

''شاید قسمت پر زیادہ انحصار کرنے لگا ہے۔''

''یہ تو واقعی تشویش ناک بات ہے۔''

تھکن کے باوجود وہ اُٹھا اور کھڑکی میں آن کھڑا ہوا۔ پلاٹ میں دونوں سر جوڑے بیٹھے دکھائی دیے۔سورج کی روپیلی روشنی میں دونوں کے بال چمک رہے تھے۔ چہرے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

اُن کے سامنے بہت سی گڑیائیں اور گڈے مختلف زاویوں میں پڑے تھے۔قسمت کبھی ایک کو اُٹھاتی، ہنس کو دکھا کر کچھ کہتی، پھر دوسرے کو اُٹھا لیتی ۔نہ جانے وہ کیا کر رہے تھے؟

اُس سے رہا نہ گیا تو چار پائی سے اتر کران کے پاس جا پہنچا۔اُن کے عقب میں خاموشی کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ہنس اور قسمت کو اُس کی آمد کا پتہ چل گیا تھا مگر اُنہوں نے کوئی اہمیت نہ دی بلکہ اپنے کھیل میں پورے انہماک کے ساتھ مشغول رہے۔

چند ہی لمحوں میں اُس پر عیاں ہو گیا کہ وہ کیا کر رہے تھے۔گڑیاؤں اور گڈوں کے مابین کوئی حل طلب مسئلہ پیدا ہو گیا تھا جسے ہنس اور قسمت مل کر حل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔قسمت گڑیوں کے جذبات کی ترجمانی کر رہی تھی ،ہنس گڈوں کا وکیل بنا بیٹھا تھا۔

ڈاکٹر کافی دیر تک یک ٹک کھڑا دیکھتا سنتا رہا پھرنا گاہ اُس کی نظر پوڈو پر پڑی۔ وہ حسبِ معمول اپنی چیئر میں بیٹھا ہوُا تھا۔ایک تغیر رونما ہو گیا تھا جس نے ڈاکٹر کو چونکا دیا۔ پوڈو کے قدموں میں ایک نئی گڑیا لیٹی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

اُس نے پیار سے قسمت کے بالوں کو چھوا، پوچھا ''بیٹا! پوڈو کے گھر میں کوئی مہمان آئی ہے کیا؟''

''جی انکل!'' قسمت نے چونک کر معصومیت سے کہا ''یہ للّی ہے،سیلاب میں بہہ کر آئی ہے۔''

سنسناتے ذہن کے ساتھ اُلٹے قدموں پلٹ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ بیوی کے دونوں شانے تھام کر مضمحل لہجے میں گویا ہوُا ''قسمت کے کھیل بہت نرالے ہوتے ہیں شناں! کوئی سمجھتا نہیں،کوئی سمجھ کر مانتا نہیں،کاش! ہر لفظ سماعت میں اُتر کر پوری معنویت کے ساتھ ذہن میں گھل جاتا ہو۔''

شناں اپنے سائیں کی اُلجھی بکھری باتیں سننے کی عادی تھی،موتیوں کو چننے کی رَسیا تھی،اوران باتوں کو سمجھنے کے لئے توانائیاں صرف کرنا لازم خیال نہیں کرتی تھی۔

...❁...

پیا سے مل کر آئے نین تو وہ ہر دکھائی دینے والی شئے میں شہاب کو ہی ڈھونڈ نکالنے پر بضد تھے۔
وہ زیرلب مسکراتی، بل کھاتی اور چشم تصور میں اپنے محبوب کو مخاطب کرتی ''ہائے شہاب! تم کیا ہو؟ سامنے ہوتے ہو تو یوں لگتا ہے جیسے تمہارے سوا دُنیا میں کوئی اور ذی نفس موجود نہیں ہے۔ دور ہوتے ہو تو یوں لگتا ہے جیسے میرا اپنا وجود کہیں کھو گیا ہے۔ شتاب آ! کہ اَب تاب جدائی کی نہیں......''

ہوٹل میں ہونے والی مختصر سی ملاقات میں اُس نے اپنے چاہنے والے پر پاپا کی رضامندی عیاں کر دی تھی۔ یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اَب گیند اُس کی کورٹ میں گر چکی ہے، چاہے تو جاندار شارٹ مارتے ہوئے پوائنٹ کے ساتھ ساتھ کھیلنے والی کو ہمیشہ کیلئے جیت لے، چاہے تو ریکٹ پر اپنی گرفت کی کمزوری کے جرم میں ہمیشہ کیلئے سر کو جھکنے پر آمادہ کر لے۔ شہاب نے والہانہ انداز میں اُس کے دونوں ہاتھوں کو چوم کر آنکھوں سے لگا لیا۔ خوشی سے لرزتی ہوئی آواز میں بولا ''جس ایک ہی شارٹ پر میرے مستقبل کا انحصار ہو، میں اُس شارٹ پر زندگی بھر کی توانائی صرف کر دوں گا۔ تم فکر کرنے کے بجائے میرا انتظار کرو۔''

کھانا کھا کر بلاوجہ ہر ایک سے نظریں چُراتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی۔ وہ تنہا پسند نہیں تھی مگر جب سے اُس کی زندگی میں شہاب وارد ہوُا تھا وہ دِن کا کچھ حصہ تنہائی میں اُس کی یادوں سے کھیلتے ہوئے گزارنا پسند کرنے لگی تھی۔ بیڈ پر دراز ہوئی، آنکھیں موندیں تو شہاب کی دل موہ لینے والی شبیہہ تصور میں دَر آئی۔ اَبھی پوری طرح اپنی پیدا کردہ تخیلاتی فضا میں گم نہیں ہوئی تھی کہ دروازے پر انگلی کی ٹھوکر سے دستک دے کر افتخار بیگ بیڈروم میں داخل ہوا۔ وہ چونک کر بیڈ میں ہی اُٹھ بیٹھی۔ حسبِ عادت دوپٹہ درست کرتے ہوئے بولی ''السلام علیکم بھائی!''

افتخار نے زیرِلب سلام کا جواب دیا۔ ڈریسنگ ٹیبل کی کرسی گھسیٹ کر بیڈ کے ساتھ ٹکا کر بیٹھ گیا۔ بولا ''میں اپنی پیاری سے کزن سے آج بہت سی باتیں کرنے کیلئے آیا ہوں۔ کیا میں ٹھیک موقع پر آیا ہوں؟''

وہ سمجھتی تھی کہ افتخار اسے کیا کہنا چاہتا ہے، بظاہر لاتعلق سی ہو کر بولی ''میں کچھ سمجھی نہیں بھائی!''

افتخار چند منٹوں تک اُسے ایک ٹک دیکھتا رہا، خاموش رہا پھر گلا کھنکار کر بولا ''نہ بدلنے والوں کو بدلتے دیکھ کر دِل ڈرنے لگا ہے۔ پہلے سوچتا تھا کہ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے، اَب سوچتا ہوں کہ وقت ہاتھ سے نکل گیا تو پھر تمام عمر ہاتھ ملتا رہوں گا اور کچھ حاصل نہیں ہوگا۔''

وہ کئی مہینوں سے افتخار سے ہونے والی اِس گفتگو کا انتظار کر رہی تھی۔ چہرے پر حیرت ثبت کرتے ہوئے بولی ''جی! میں سُن رہی ہوں۔''

''میں چاہتا ہوں کہ تم غور سے سنو اور سن کر سمجھنے کی کوشش بھی کرو۔ ہم دونوں خون کے رشتوں میں پروئے ہوئے دو انسان ہیں۔ ہماری سوچیں مختلف ہوسکتی ہیں مگر ان کا کسی ایک نکتے پر منطبق ہونا کوئی ناممکن امر نہیں ہے۔ میں تمہیں بچپن سے چاہتا آیا ہوں، تم جانتے بوجھتے ہوئے کنی کتراتی رہی ہو۔ ایسے میں ایک ہی بات میری سمجھ میں آتی ہے کہ تم میرا احترام کرتی ہو، میری دل آزاری سے بچتی ہو وگرنہ تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے۔ کیا میں سچ کہہ رہا ہوں؟''

افتخار غیر معمولی حد تک سنجیدہ تھا۔ اُس کے چہرے پر ہمیشہ دکھائی دینے والی مسکراہٹ بھی معدوم تھی۔ مصباح نے ایک نگاہِ عجیب سے اسے دیکھا اور کہا ''آپ کا تجزیہ بہت حقیقی واقع ہوا ہے۔''

افتخار کے چہرے پر نامانوس سا رنگ چند لمحوں کیلئے لہرایا، پھر معدوم ہوگیا۔ بولا ''میں نے بہت سوچا، بالآخر اِس نتیجے پر پہنچا کہ تم کسی کو چاہتی ہو، کوئی تمہیں چاہتا ہے۔ اتنا کہ تم نے نہ چاہتے ہوئے بھی اُسے مجھ پر فوقیت دے رکھی ہے۔''

مصباح نے چونک کر اُسے دیکھا۔ وہ معمول سے کہیں زیادہ سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔ اُس کے بولنے سے پہلے ہی بول پڑا ''کسی کی نجی زندگی میں جھانکنا تہذیب کے خلاف ہے مگر دل پر سارے اختیار کھو چکا تھا۔ تمہارے پیچھے پیچھے بھاگنے لگا۔ پھر یوں دوڑتے بھاگتے مجھے شہاب خان نظر آ گیا۔ کاش! میرا دِل تمہارے نام پر دھڑکتا نہیں تو میں جی کھول کر تمہارے انتخاب کی داد دیتا۔''

بہ یک وقت دو کیفیات نے مصباح کا لہو نچوڑ کر چہرے میں اکٹھا کر دیا۔ پہلا احساس تفاخر کا تھا کہ اُس کے محبوب کی تعریف کی جارہی تھی۔ اُس کی شخصیت تھی بھی سراہے جانے کے لائق! دوسرا احساس ندامت کا تھا کہ اُس کی چوری پکڑی جا چکی ہے۔ اپنے کزن سے آنکھیں چراتے ہوئے بولی

''تم نے خود ہی کہا ہے کہ دِل سارے اختیار کھو بیٹھتا ہے، میں بھی شاید ایسی ہی بے اختیاری کا شکار ہو گئی ہوں۔''

''کیا تم شہاب کو جانتی ہو؟''

''ہاں بھائی!''

''کس حد تک؟''

''جس حد تک اُس نے مجھے اپنے بارے میں بتلایا ہے۔''

''مگر فقط اتنا جاننا کافی نہیں ہے۔''

''میرے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں کہ اُس کے بتائے کو پَرکھ سکوں یا نہ بتائے ہوئے کا کھوج نکال سکوں۔ اِس لئے مجھے اکتفا کرنا پڑ رہا ہے۔'' وہ بے بسی سے بولی۔

اُسے یقین تھا کہ افتخار بیگ کسی بھی حالت میں اُس سے جھوٹ نہیں بولے گا۔ وہ بچپن سے سچ بولتا چلا آیا تھا۔ تبھی وہ آہستہ آہستہ اُس پر کھلتی جا رہی تھی۔

وہ بولا ''مصباح! ہر چمکتی ہوئی چیز سونا نہیں ہوتی......''

وہ جھٹ سے بولی ''مگر چمکتی ہوئی چیز سونا ہو بھی سکتی ہے۔''

افتخار نے اثبات میں سر ہلایا، بولا ''ہاں! تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مجھے شہاب کے بارے میں جو کچھ معلوم ہو سکا، تمھارے گوش گزار تا ہوں۔ ممکن ہے کہ تمہیں اُس کو سمجھنے میں آسانی رہے۔ وہ ضلع ناظم سردار ارباب خان کا اکلوتا بیٹا ہے۔ پڑھا لکھا ہے۔ فارن سے تعلیم حاصل کر کے کچھ عرصہ قبل یہاں آیا ہے۔ نرم خو ہے، جذباتی ہے، مجرمانہ ذہنیت نہیں رکھتا۔ یہاں تک تو سب کچھ بالکل ٹھیک ہے مگر جو کچھ میں بتلانے چلا ہوں، وہ کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہیں ہے۔ شہاب کے باپ دادا پاکستان بننے کے عہد سے اقتدار میں چلے آ رہے ہیں۔ ان کا اقتدار لے پالک رسہ گیروں، بدمعاشوں اور کرائے کے قاتلوں کے بَل پر پروان چڑھتا ہے۔''

وہ سانس لینے کو چند لمحے رُکا، پھر بولا ''شہاب ایسی ذہنیت کا مالک نہیں ہے مگر ایسا بنتے دیر کتنی لگتی ہے۔ اُس کا خاندان اور باپ کے یار احباب اُسے سر اُٹھاتے ہی اپنی راہ پر گامزن کر لیں گے۔ تب

تم پر کڑا وقت اُتر آئے گا جو تمہاری زندگی کو چاٹ جائے گا۔''

وہ ٹھٹک گئی۔ تفکر آمیز نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگی جو محبت بھرے دِل میں اندیشے بھرنے لگا تھا۔ جھوٹ نہ بولنے والا شاید اپنی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر رقیب پر کیچڑ اُچھالنے لگا تھا۔ نظر کچی تھی۔ بُرے بھلے میں تمیز نہیں کر سکتی تھی۔

وہ کہہ رہا تھا ''مصباح! تمہاری آنکھیں بولتی ہیں۔ تمہاری زبان جو نہیں کہہ پاتی، تمہاری آنکھیں مجھ پر آشکار کر دیتی ہیں۔ تم مجھ پر اعتماد کرنے سے گریزاں ہو۔ محبت میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ مگر شعور اور کھلا ذہن ہر رُخ سے سوچتا ہے، تم بھی سوچو۔ جو سمجھا رہا ہوں، اُسے سمجھو۔ یقین نہ آئے تو پرکھو۔ آنے والے کل میں تم تنہا رہ جاؤ گی۔ شاید میں بھی تمہارے کسی کام نہیں آ سکوں گا۔ شہاب کے باپ نے اَن گنت اشتہاری ڈاکوؤں جرائم پیشہ لوگوں کو پناہ دے رکھی ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ کچے کے بیلے میں دندناتے پھرتے ڈاکو اُسی کی شہہ پر ہر شہ رگ پر دانت گاڑ سکتے ہیں۔''

وہ چپ رہی۔ کچھ کہنا مشکل دکھائی دے رہا تھا۔ افتخار نے سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا ''تم! مصباح سلطان، میری کزن ہو، میری محبت ہو۔ تمہیں خوش دیکھنا میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے اور میں کبھی بھی نہیں چاہوں گا کہ میں تمہارے روتے بسورتے چہرے کو اپنے کمرے میں لے کر جاؤں۔ شہاب جس کلاس سے تعلق رکھتا ہے، وہاں عورتوں کا احترام نہیں کیا جاتا، اُنہیں پیر کی جوتی بنا کر رکھا جاتا ہے۔ آج وہ تمہارے نخرے اُٹھا رہا ہے، کل وہ یقیناً تم پر ہاتھ اُٹھانے سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔ مجھے علم ہے کہ تم تینوں بہن بھائیوں نے بغاوت کا علم بلند کر کے اپنے باپ کو توڑ دیا ہے۔ ٹوٹی ہوئی چیز کو جس سانچے میں فٹ کر دیا جائے، ہو جاتی ہے۔ انکل نے تمہیں بھی وجدان اور عمران کے ساتھ ساتھ اپنی مرضی کے مطابق ہم سفر چننے کی اجازت دے دی ہے۔ یہ اُن کا بڑا پن ہے، غلط فیصلہ کرو گی تو اپنا چھوٹا پن دکھاؤ گی۔''

مصباح نے سر تھام لیا۔ سائیں سائیں ہوتا دماغ کوئی جواز، کوئی دلیل تلاش کرنے میں ناکام ہو رہا تھا۔ افتخار نے اُس کا سرد ہوتا ہاتھ تھام لیا۔ فرطِ اضطراب سے گرفت لرزنے لگی۔ ہونٹ کانپنے لگے، بولا ''تمہیں ڈرانا میرا مقصد نہیں ہے۔ صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم جو قدم بھی اُٹھاؤ، سوچ سمجھ کر

اُٹھاؤ۔ اِس راستے میں واپسی کی گنجائش نہیں رہتی، آگے کی طرف ہی جانا پڑتا ہے۔''

وہ ہاتھ چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اُسے علم ہو گیا تھا کہ اُس کی نصیحتیں مصباح پر بے اثر جا رہی تھیں۔ اُس کے جھکے ہوئے سر کو اوپر اُٹھایا۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کئی ساعتوں تک کھڑا رہا۔ کچھ کہہ کر کچھ نہیں کہہ پا رہا تھا۔ کچھ نہ کہہ کر بہت کچھ کہہ رہا تھا۔ اچانک مصباح کی آنکھوں میں آنسو چمک اُٹھے۔ آنسوؤں کی غیر معمولی خاموشی نے افتخار بیگ کو کاٹ کر رکھ دیا۔ وہ اتنی لاچار کبھی نہیں ہوئی تھی۔

آنسو لڑھک کر گالوں پر آ گئے۔ افتخار بیگ کو اُس کے گالوں میں پڑنے والے ڈمپل بہت اچھے لگتے تھے، تبھی اُسے ہر وقت ہنستا دیکھنا چاہتا تھا۔ آج پہلی مرتبہ پتہ چلا تھا کہ روتے ہوئے بھی گلابی مائل رخساروں میں گڑھے بن جاتے تھے۔ ہنستے ہوئے یہی ننھے ننھے استعارے جتنے مسحور کن اور مسرت آگیں لگتے تھے، روتے ہوئے یہی گڑھے دیکھنے والے کے اتنے ہی بڑے دُکھ کو سوا کرنے لگتے تھے۔ افتخار نے انگلیوں کی پوروں سے اشک پونچھے۔ انگلیاں بہک کر زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری کرنے لگیں۔ پہلی مرتبہ گالوں میں پڑنے والے گڑھوں کو چھو رہا تھا۔ یوں لگا جیسے چھوٹے چھوٹے انگارے قدرت نے عاشق کی پوریں جلانے کیلئے محبوبہ کے چہرے پر رکھ چھوڑے ہوں۔

وہ کافی دیر تک آنکھیں جھپکائے بغیر اُسے دیکھتی رہی۔ روتی رہی، وہ بھی خاموشی سے آنسو پونچھتا رہا۔ اچانک سسک پڑی۔ اُس کی طرف جھول گئی۔ لپٹ کر زار و قطار رونے لگی۔ وہ گھبرا گیا۔ یوں ٹوٹ کر رونے کی وجہ جاننے کیلئے بے چینی سے تکرار کرنے لگا۔ اُس کے لرزیدہ لبوں سے کچھ نکلا بھی تو محض اتنا کہ ''بھائی! میں بہت بُری ہوں۔ میں نے پاپا کو دکھ دیا، میں نے ماما کو رُلایا، میں نے آپ کو مایوس کیا۔ میں بہت بُری ہوں۔ شاید اتنے چاہنے والوں کو ناراض کر کے میں کبھی خوش نہیں رہوں گی۔''

افتخار نے اُس کا چہرہ اپنے سینے سے لگا کر نرم گرفت سے بھینچ لیا۔ بھرائے ہوئے لہجے میں بولا ''نہیں مصباح! یہ تینوں تمہاری خوشی کیلئے زندگی بھر دُعائیں مانگیں گے، اِن میں سے کوئی بھی تمہارا

گلہ نہیں کرے گا، کوئی بھی بددُعا دینے کی غلطی نہیں کرے گا۔ اِس خوف سے بالاتر ہو کر صحت مند فیصلہ کرنا، میں چلتا ہوں۔''

افتخار بیگ ایک مایوس سی نگاہ اُس پر ڈال کر چلا گیا۔ اُسے سوچوں کی کھینچا تانی میں چھوڑ گیا۔ جتنا بھی تنقیدی انداز سے شہاب کو سوچتی، وہ اتنا ہی دل کو لگنے لگتا۔ جتنا بھی غور سے دیکھتی، کوئی برائی دکھائی نہ دیتی۔

رات کو عمران نے انداوان سے بات کروائی۔ نہ جانے کیوں اُس کا جی چاہتا تھا کہ انداوان اُس سے باتیں کرتی رہے، وہ سنتی رہے، لائن کبھی خاموش نہ ہو مگر ایسا کب ہوتا ہے۔ ہر آنے والے نے جانا ہوتا ہے۔ اُس نے اپنے بھائی کو مبارکباد دے کر کہا ''بھائی! تم بڑے خوش قسمت ہو۔ انداوان بہت اچھی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تصویروں میں بیٹھی خاموش انداوان سے کہیں زیادہ پیاری ہوگی۔ کیا ایسا ہی ہے؟''

عمران نے جھینپ کر کہا ''کہیں اُسے مجھ سے چھین ہی نہ لینا۔''

اُس نے ہنستے ہوئے فون بند کر دیا۔ بیڈ پر اوندھے منہ گر گئی اور دل آویز انداز میں مسکرا کر بڑبڑانے لگی ''ہے انداوان! تم یہاں چلتی پھرتی سب گڑیاؤں سے کہیں زیادہ خوبصورت ہو۔ میرا بھائی بھی دُنیا سے حسین ہے، اُسے تمہارے جیسی شریکِ حیات کی ہی ضرورت ہے...... آئی لو یو انداوان!''

چائے کی طلب جاگی۔ کچن میں آئی۔ چائے بنا کر پہلا گھونٹ بھرنا ہی چاہتی تھی کہ شہاب کی کال آ گئی۔ وہ پوچھ رہا تھا ''مصباح! سن رہی ہو؟''

''جی!'' اس کا لہجہ خاصا دھیما تھا ''خیریت تو ہے ناں؟''

''کبھی اتنی رات گئے گھر سے باہر نہیں رہا، آج اندھیرے میں بیٹھا ہوں تو پتہ چل رہا ہے کہ دُنیا رات کو بڑی پُرسکون ہوتی ہے۔ سو چا تم سے کچھ باتیں کر لی جائیں، دِل بہلا لیا جائے۔'' شہاب کا لہجہ اُس کے اندرونی اضطراب کی چغلی کھا رہا تھا۔

''شہاب! کیا تم پریشان ہو؟''

''ہوں بھی اور نہیں بھی......''

''کھل کر بتاؤ گے تو کچھ جان پاؤں گی!''

''بلاوجہ دِل گھبرا رہا ہے۔''

''دِل بلاوجہ کب گھبراتا ہے، جانتے ہو؟'' مصباح نے پوچھا۔

''نہیں تو......''

''جب دماغ کسی مسئلے پر دِل سے اختلاف کررہا ہو تب دِل میں گھٹن بھر جاتی ہے۔'' وہ بولی ''یا دِل کی خواہش پوری نہ ہو رہی ہو، تب!''

''تم بہت ذہین بھی ہو۔''

''بھی ہو......کیا مطلب؟ میں ذہین ہونے کے علاوہ بھی کچھ ہوں؟''

''ہاں! تم بلاشبہ دُنیا کی سب سے خوبصورت لڑکی ہو۔'' شہاب کے لفظوں میں محبت ہی محبت تھی مگر لہجہ الفاظ کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔

وہ دل میں بولی ''تو انداوان کیا ہوئی؟''

ہنستے ہوئے کہنے لگی ''یہ تو ہر کوئی اپنی محبوبہ سے کہتا ہے۔''

''ایسا کہنے والا ہر مرد سچا ہوتا ہے۔''

''وہ کیوں؟''

''تم میرے سمجھانے سے بھی سمجھ نہیں پاؤ گی۔''

''سمجھانے کی کوشش تو کر کے دیکھو۔'' مصباح نے ترغیب دی۔

''میں اپنے گھر کے سامنے، سول ہسپتال کے گراسی پلاٹ میں بیٹھا ہوُا ہوں۔ دُنیا سو رہی ہے، کوئی دیکھنے والا نہیں ہے، ایسے میں تم دَبے پاؤں چلی آ ؤ۔ سمجھنا چاہو گی تو سمجھا دوں گا، نہ سمجھنا چاہو گی تو تب بھی سمجھ میں بہت کچھ آ جائے گا۔''

اُس نے ہنستے ہوئے فون بند کر دیا۔ چاہنے والے کو تڑپانے کا ہنر جانتی تھی۔ انتظار کرتی رہی مگر شہاب نے ری کال نہیں کیا تو جھنجلا سی گئی۔ اُسے کال کرنا چاہتی تھی مگر اَنا آڑے آئی۔ سوچنے لگی

''شاخ کو جھک کر گود میں نہیں گرنا چاہیے ورنہ بے وقعت ہوجائے گی۔شہاب کو ہی ایڑیوں کے بَل اوپر اُٹھ کر مجھ تک پہنچنا ہوگا۔آج،کل یا کبھی بھی۔''

اُسے یہ علم نہیں تھا کہ اُس کے چاہنے والے کی قسمت کا ستارہ گردش میں آ گیا تھا۔اکلوتا ہونے کی وجہ سے اپنی ہر خواہش ضد کر کے منوا لینے والا اپنی زندگی کی سب سے بڑی آرزو کو تسلیم کرنے میں ناکام ہورہا تھا۔گوشت پوست کے بنے ہوئے سردار اَرباب خان کے سینے میں دھڑکنے والے پتھر سے مسلسل سر پٹخ پٹخ کر بے دم ہورہا تھا،جھنجلا رہا تھا۔

مصباح کو پہلی مرتبہ دیکھنے کے وقت سے لے کر اَب تک اُسے پوری طرح باور رہا تھا کہ اُس کا سخت گیر باپ کبھی بھی اُس کی مرضی پر سر نہیں جھکائے گا۔وہ اپنی بھتیجی کو بہو بنانے کیلئے اُس کی محبت یا خواہش کا احترام نہیں کرے گا بلکہ اپنی مرضی مسلط کرتے ہوئے اُس کی زندگی اجیرن کردے گا مگر یہ پریشانی کی بات نہیں تھی۔

پریشانی یہ تھی کہ جس گھڑی کو وہ بہت دور سمجھ رہا تھا،وہ غیر متوقع طور پر اچانک سر پر آ گئی تھی۔اُس کی حاصل کردہ معلومات نے بھی دھوکہ دیا تھا۔اُسے یقین تھا کہ مصباح کے والدین بھی اِس رشتے پر رضامند نہیں ہوں گے بالخصوص اِس حالت میں کہ اُس نے اپنا آپ مکمل طور پر چھپائے رکھا تھا۔وہ ایک بے روزگار جوان کی صورت میں مصباح کے سامنے آیا تھا۔ایسے رشتوں کی چاپ پر کان نہیں دھرے جاتے۔دونوں طرف ایک جیسی صورتِ حال عشق کے مقابل آتی تو وہ کسی نہ کسی طرح مصباح کو کورٹ میرج پر تیار کر لیتا اور اُسے لے کر کہیں دُور نکل جاتا۔شاید ایسا ہی ہوتا مگر مصباح نے اچانک اُسے پاپا کے مان جانے کی خوش خبری سنا کر پریشان کردیا تھا۔

شہاب اپنے ماں باپ کو رشتہ مانگنے کیلئے اُس کے گھر لے کر نہیں جاسکتا تھا اور وہ ماں باپ کو بدنامی کی پستی میں گرانے پر کبھی تیار نہ ہوتی۔اُس نے اپنے طور پر دانشمندی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے گھر میں ہونے والی سرد جنگ سے مصباح کو آگاہ نہیں کیا تھا۔

پہلے قدم پر ماں کے سامنے جھکنے پر جھڑکیوں کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔دوسرے مرحلے پر باپ نے اُس کی پوری بات سننے کے بعد بڑے تحمل سے کہہ دیا''بیٹا جی!میرے اگر دو چار بیٹے ہوتے تو

شاید تمہیں مَن مانی کرنے کی اجازت مل جاتی۔تم میرے اکلوتے پتر ہو۔میں نے سوچ رکھا ہے کہ سردار وریام خان کی بیٹی کو اپنی بہو بناؤں گا۔تم نے اپنی چچازاد کو ایک نہیں، متعدد بار دیکھا ہے۔اُس میں کوئی کمی نہیں۔یونیورسٹی کی تعلیم یافتہ ہے۔خوبصورت ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اُس کے حصے کا دوسو ایکڑ زرعی رقبہ بھی اُس کے ساتھ تمہارے پاس آئے گا۔ویسے بھی ہمارے خاندان میں باہر شادی کرنے کا رواج نہیں ہے،تم جانتے ہی ہو!''

وہ سر جھکائے کہنے لگا''بابا!زمانہ وہ نہیں رہا......''

باپ نے بات اُچک لی''تو کیا ہوا؟ ہم تو وہی ہیں ناں۔ہمارے باپ دادا نہیں بدلے، ہمارا جاہ وحشم ماند نہیں پڑا۔پورے علاقے کی نظریں آٹھ پہر ہم پر گڑی رہتی ہیں۔مصباح،تمہاری پسند، خوبصورت ہوگی، پڑھی لکھی ہوگی، شریف خاندان کی بیٹی ہوگی مگر کیا وہ اپنے ساتھ شازیہ کے جتنی جائیداد لے کر آئے گی؟ کیا شازیہ کے جوڑ کا کوئی بَر خاندان میں موجود ہے؟نہیں......تمہاری بے جا ضد کی بدولت ہم دونوں بھائی دوہرے نقصان سے دوچار ہوں گے۔دوسو ایکڑ نہری رقبہ خاندان سے باہر چلا جائے گا اور تمہارے ہاتھ کچھ بھی نہیں آئے گا۔''

''مگر بابا! مجھے جائیداد کی پرواہ نہیں ہے۔''

''نہ ہو، مجھے تو ہے۔تمہاری ماں کو تو ہے۔تم اپنی نہیں، ہماری فکر کرو کیونکہ آج تک ہم نے تمہاری فکر کی ہے۔''

باپ نہیں مانا تو وہ مایوس ہو کر اپنے بیڈروم میں آ گیا۔ماں کے دِل کو گھبراہٹ ہو رہی تھی، بیٹے کی دِل جوئی کیلئے چلی آئی۔بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے سمجھانے لگی''بیٹا! میری جان! لڑکیوں کا کیا ہے؟ ایک کے بعد دوسری نظر آئے تو پہلی بے توقیر ہو جاتی ہے۔تم نے کبھی شازیہ کو اِس نظر سے دیکھا نہیں جس نظر سے مصباح کو دیکھ رہے ہو۔وہ کسی بھی لحاظ سے مصباح سے کم نہیں......میری مانو تو اپنے بابا کا دِل دکھانے کے بجائے اُن کی عمر بڑھاؤ اور شازیہ کو دُلھن بنا کر گھر لے آؤ۔اِسی میں ہم سب کی خوشی ہے۔''

وہ کھلی اور سپاٹ نگاہوں سے ماں کو گھورتا رہا، بظاہر سنتا رہا، خاموشی سے سوچتا رہا''کاش! میرے

ماں باپ کو اپنے خاندانی رسم و رواج اور جائیداد کی فکر نہ ہوتی، میری فکر ہوتی......''

آنے والے ایک دو دِنوں میں اُس نے اتمامِ حجت کے طور پر ماں اور باپ سے جھگڑا کیا، غیر اعلانیہ بھوک ہڑتال کی، گھر چھوڑنے کی دھمکیاں دیں حتیٰ کہ سامان تک باندھ لیا مگر بابا کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ وہ شازیہ کے علاوہ کسی کو بہو بنانے پر تیار نہیں تھا۔ بیٹے کی حرکتوں سے تنگ آ کر اُس نے فیصلہ کن انداز میں کہہ دیا ''شہاب! تم بیٹے ہو، میں تمہارا باپ ہوں۔ بیٹا کبھی بھی باپ کے سامنے زیادہ دیر ٹھہر نہیں سکا۔ تم یہ فضول ضد چھوڑ و اور جیسے میں کہہ رہا ہوں، ویسے کرو۔ اگر کوئی الٹی سیدھی حرکت کرو گے تو تمہاری مصباح اور اُس کا پورا خاندان میری نظر میں ہے۔''

''آپ کیا کریں اُن کے ساتھ؟'' وہ چونکا۔

سردار اَرباب خان نے منہ سے کچھ نہیں کہا مگر دائیں ہاتھ کو پھیلا کر مخصوص انداز میں یوں حرکت دی کہ شہاب کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ ہکلا کر بولا ''بب......با......بابا! یہ بہت غغ......غلط ہوگا۔''

''تم جو کر رہے ہو، کیا وہ غلط نہیں ہے؟'' بابا نے دانت پیستے ہوئے کہا ''تم ایک تھرڈ کلاس لڑکی کی خاطر پورے گھر بلکہ پورے خاندان کے سکون کو برباد کرنے پر تُلے ہوئے ہو۔ اَب جاؤ یہاں سے۔ جو کہہ دیا ہے، وہی ہوگا۔ اور ہاں! یہ ذہن میں رکھنا کہ میں تمہیں چوبیس گھنٹے اپنی نظروں میں رکھتا ہوں۔''

وہ اپنی محبوبہ کے دفاع میں ایک حرف بھی بول نہ پایا۔ یوں ماں باپ سے پوری طرح مایوس ہو گیا۔ مصباح کو کھو کر زندگی سے مایوس نہیں ہونا چاہتا تھا۔ گزشتہ دو تین گھنٹوں سے ہسپتال کے گراسی پلاٹ کے سنگی بنچ پر سر نیہوڑائے بیٹھا سوچوں کے تانے بانے بننے میں مشغول تھا۔ اُلجھے ہوئے ریشم کا ایک سرا اُس کے ہاتھ میں تھا، دوسرا بہ صد کوشش نظر نہیں آ رہا تھا۔ جانے تقدیر کے ہاتھ میں تھا، جانے اُس کے باپ کے ہاتھ میں تھا یا جانے سرے سے موجود ہی نہیں تھا......

...◈...

للّی خاصی بیمار تھی۔ہنس نے اُس کا علاج کیا۔انجیکشن لگائے۔گولیاں کھلائیں اور قسمت نے کھانا کھلایا۔مطمئن ہو کر بولی ''دیکھو ہنس! تمہارے ٹیکے نے اِسے اُٹھا کر بیٹھا دیا ہے۔''

''تم نے بھی تو کھانا کھلایا ہے ناں!''

''وہ بھوکی نہیں تھی، بیمار تھی۔''

''ایک ہی بات ہے۔''

''تم نے مجھے بتایا نہیں قسمت کہ یہ للّی کون ہے؟ اِسے پوڈو نے کیوں اپنی کشتی میں سوار ہونے دیا ہے۔'' ہنس کا معصوم سا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا۔

قسمت عادتاً ہونٹ کاٹنے لگی۔سوچنے لگی پھر آدھی آنکھیں میچ کر بولی ''تم نے وہ ڈراما دیکھا تھا ہنس...... وہ جس میں تمہارے جتنا بچہ وِکی میرے جتنی لڑکی کے ساتھ سکول سے بھاگ کر ریل گاڑی میں بیٹھ گئے تھے۔ دیکھا تھا ناں؟''

ہنس نے اثبات میں سر ہلایا۔ بچوں کا یہ دلچسپ ڈراما اُسے قسمت نے ہی اپنے وڈیو سی ڈی پلیئر پر دکھایا تھا۔اُسے غصہ بھی آیا تھا کہ قسمت نے اُسے بچہ اور خود کو لڑکی کہہ کر اُس کا مذاق اُڑایا تھا۔

''پھر لڑکی کا پاپا وہاں پہنچ گیا تھا اور دونوں کو مار پیٹ کر گھر لے آیا تھا۔''

''ہاں تو؟''

''وِکی بڑا ہو کر پوڈو ہی تو بنا ہے۔تمہاری سمجھ میں کچھ آتا ہی نہیں۔''

ہنس نے اُسے عجیب سے نظروں سے دیکھا۔نتھنے میں انگلی گھسوڑ کر خاص انداز سے گھمانے لگا۔

کھڑکی میں کھڑا ڈاکٹر بہ غور دیکھ اور سُن رہا تھا۔شناں کے متوجہ کرنے پر باتھ روم میں چلا گیا۔کھڑے کھڑے وضو کیا اور جائے نماز بچھا کر نماز پڑھنے لگا۔دورانِ نماز بھی اُس کے ذہن میں ہنس اور قسمت کی باتیں گونجتی رہیں۔دُعا کیلئے ہاتھ بلند کئے تو بے اختیار لبوں سے نکلا ''اے پروردگار! دماغ جھٹلاتا ہے۔دل تصدیق پر بضد ہے۔یہ کیا ماجرا ہے؟ ہنس اور قسمت کا کھیل گراسی پلاٹ سے نکل کر پھیلتے ہوئے اَن گنت زندگیوں پر محیط ہو جاتا ہے۔تیرے کیا اسرار ہیں، تیرا کیا بھید ہے؟ کھولوں تو ہر کوئی جھوٹا کہہ کر تھو تھو کرنے لگتا ہے۔چھپاؤں تو دل ڈرنے لگتا ہے کہ کہیں کوئی بہت بڑا

نقصان نہ ہو جائے جو زندگی بھر کیلئے مجھے بے چین کر دے......میری راہ نمائی فرما! اگر قسمت کے منہ سے نکلا ہی قسمت بن جاتا ہے تو تجھے تیرے حبیب کا واسطہ! اِس کے منہ سے کلمۂ خیر ہی نکالنا، تو قادرِ مطلق ہے، تو وہ سب کچھ ہے جس کے بارے میں پوری انسانیت لاعلم ہے......''

شاں ہاتھوں میں چائے کی ٹرے تھامے ایک ٹک اپنے شوہر کے پُرنور چہرے کی تلاوت کر رہی تھی۔ اپنے شوہر کی بھیگی آنکھیں دیکھ کر اُس کے ہاتھوں میں واضح طور پر ارتعاش پیدا ہو گیا تھا۔ بَرسوں سے دیکھتی آئی تھی کہ ان آنکھوں سے نکلنے والے آنسو بے محل نہیں ہوتے۔

...❁...

سورج نے طلوع ہوتے ہی چھت کی ریلنگ سے ٹیک لگائے، سوتی کھیس میں لپٹ کر سوتے ہوئے پروفیسر کو پسینے سے نہلا دیا۔ وہ جاگ کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ نظر مچھر دانی کے اندر پہلو کے بل لیٹی سموں پر پڑی۔ جلدی سے اُٹھ بیٹھا۔ رات کا بیشتر حصہ سموں کی تیارداری میں گزرنے کے باعث اُس پر کسلمندی سوار تھی۔

سموں اَبھی تک سو رہی تھی۔ اُس نے جگانا مناسب نہیں سمجھا اور کچن میں آ کر ناشتہ تیار کرنے لگا۔ ناشتے کے لوازمات میلا مائن کی ٹرے میں رکھے، چائے تھرماس میں ڈالی اور چھت پر آ گیا۔ اُسے آوازیں دیں۔ وہ نہیں جاگی تو مچھر دانی کا پلو اُٹھا کر اُسے جھنجوڑنے لگا۔ وہ جاگ کر پھٹی پھٹی نگاہوں سے اُسے اور اُس کے اطراف میں دیکھنے لگی۔ سمجھنے کی کوشش کرنے لگی کہ وہ اِس وقت کہاں اور کس حال میں ہے۔ کچھ سجھائی دینے پر چارپائی میں اُٹھ بیٹھی۔ سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے سرائیکی میں بولی''آپ کون ہیں؟''

''میں وہ ہوں جس کے پاس تمہیں مصیبت مہمان بنا کر لے آئی ہے۔'' پروفیسر کو ہلکا سا دُکھ ہوا۔ سموں نے اُسے نہیں پہچانا تھا۔ اُس کے چہرے پر شناسائی کا رَتی بھر تاثر بھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ سر جھٹک کر ناشتہ چارپائی پر چُن دیا۔ بولا''ذہن پر زیادہ بوجھ ڈالنے کی ضرورت نہیں، ناشتہ کرو۔ سوچنے کیلئے اَبھی بہت وقت پڑا ہے۔''

''مم......میرا کندن کہاں ہے؟'' وہ سہمی ہوئی نظروں سے اِردگرد دیکھتے ہوئے بولی۔

''میں تمہارے کندن کو نہیں جانتا۔ کہاں ہے، یہ بھی مجھے معلوم نہیں ہے۔'' پروفیسر کے لہجے میں درشتی یا سختی نہیں تھی۔

''وہ شکنتلا بھی دکھائی نہیں دے رہی، کہاں مر گئی ہے؟'' سموں نے عجیب سے کھوئے کھوئے انداز میں کہا تو پروفیسر کو شبہ ہوُا کہ وہ ذہنی توازن کھو چکی ہے، ترحم آمیز نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے بولا ''میں نے کہا ناں! کچھ کھا پی لو، پھر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔''

سموں کا رویہ نہائت غیر فطری محسوس ہوُا جب وہ پروفیسر کی بات سُن کر اچانک شانت ہو گئی۔ تلی ہوئی بریڈ کے نوالے توڑ توڑ کر کھانے لگی۔ پروفیسر نے دیکھا کہ سموں نے آج بھی فرائی ایگ کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ سچ کہتے ہیں عادتیں زندگی بھر ساتھ نہیں چھوڑتیں۔ وہ بچپن میں بھی انڈہ نہیں کھاتی تھی۔ اَب بھی انڈے کے بجائے مکھن اور شکر کی طرف رغبت کر رہی تھی۔

اُس نے پروفیسر کی طرف دوبارہ نہیں دیکھا اور نہ ہی کوئی بات کی بلکہ ناشتے کی ٹرے پر جھکی رہی۔ پروفیسر نے کھانے میں اُس کی غیر معمولی رغبت کو دیکھ کر اندازہ لگایا کہ وہ کافی دیر سے بھوکے پیٹ موت سے نبرد آزما رہی تھی۔

وہ اُس کے خال و خد پر نظریں جمائے بیٹھا بڑے انہاک سے دیکھ رہا تھا۔ لمبی اور اُلجھی ہوئی سیاہ زلفیں چہرے پر ننھے ننھے دائرے بنائے چمٹی ہوئی تھیں۔ سموں کی رنگت پہلے سانولی تھی، اَب گوری چٹی تھی جو زیادہ دیر پانی میں رہنے سے پیلگوں دکھائی دے رہی تھی۔ ملیح جلد اور شریر نقوش والے چہرے پر اَدھیڑ عمری سلوٹیں بن کر اپنا آپ دکھا رہی تھی۔ لبوں کے دائیں گوشے سے جھانکتے سفید دانتوں میں سے ایک دانت غائب تھا اور اُس کی جگہ پر بننے والا خلا بھی اچھا لگ رہا تھا۔

اُس کے تن سے چپکا ہوُا لباس سیلاب بُرد ہونے سے پہلے سفید رہا ہوگا۔ دریا کے پانی نے اُسے خاکی کر دیا تھا۔ گلابی رنگ کے پھول بھی اپنا رَنگ بدل چکے تھے۔ بیس سال پہلے، جب اُس کی شادی ہوئی تھی، وہ پندرہ کے سن میں تھی۔ توت کی گیلی لکڑی کی طرح پتلی اور لچکدار ہوُا کرتی تھی، اَب بھرے بدن کی بدولت باوقار لگنے لگی تھی۔ پروفیسر کو ماننا پڑا کہ وہ پینتیس کی ہو کر بھی بہ مشکل

پچیس کی دکھائی پڑتی ہے۔

وہ زیادہ نہیں، بس تھوڑا بہت ہی بدلی تھی۔ اتنی تبدیلی تو عمر کے ساتھ ساتھ آ ہی جاتی ہے۔ وہ کھانے سے فارغ ہوئی، نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے خالی خالی نظروں سے پروفیسر کو دیکھنے لگی۔ اُس کے یوں دیکھنے سے چند ہی لمحوں میں اُسے وحشت سی ہونے لگی۔ وہ بولا ''کیا بات ہے؟ ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟''

''تم کون ہو؟''

''یہ سوال تو مجھے تم سے کرنا چاہیے۔''

وہ کندھے اُچکا کر خاموش ہوگئی۔ اُس کے چہرے پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ سورج لمحہ بہ لمحہ دن کو گرماتا جاتا تھا۔ پروفیسر نے اسے ساتھ لیا۔ نیچے آیا اور بیڈ روم کا دروازہ کھول کر اُسے مخاطب ہوا ''تم آرام کرو، ضرورت پڑنے پر یہ باتھ روم استعمال کر سکتی ہو۔''

وہ کسی معمول کی طرح اُس کی ہدایات پر عمل کر رہی تھی۔ پروفیسر الجھتا جاتا تھا۔ کہاں بچپن میں کھڑی وہ سموں جو ہر کام پر تنقید، ہر بات کی تردید اور ہر رَنگ پر رائے زنی خود پر فرض قرار دیتی تھی اور کہاں یہ اُجڑی ہوئی سموں جو کسی مزاحمت کے بغیر بلا چوں و چراں مانے چلے جا رہی تھی۔ وہ دوائیوں والی الماری کی طرف جاتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا ''واقعی وقت انسان کو بدل کر رکھ دیتا ہے۔''

اِبروپروفن سیرپ کی بوتل اُٹھاتے ہوئے سوچ میں پڑ گیا۔ ڈاکٹر اَشو کی ہدایات یاد آئیں۔ فوراً رابطہ کیا۔ کہا ''مُرشد! تمہاری مسیحائی کی ضرورت پڑ گئی ہے۔''

''کیا بیمار پڑ گئے ہو سئیں؟'' اَشولال کی آواز بہت صاف سنائی دی۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں، میری ایک مہمان کی حالت خاصی خراب ہے۔'' وہ اَٹک اَٹک کر بولا ''وہ دریا میں نہ جانے کہاں سے بہتی ہوئی میری جنت تک آئی ہے۔ میں نے پیٹ کا پانی نکال دیا تھا۔ چونکہ وہ ذہنی طور پر نارمل نہیں تھی، اِس لئے میں نے بہ یک وقت ملیریا اور ٹائیفائیڈ کی دوائیاں اُسے کھلا دی ہیں۔ اَب مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

''کیا اَب بھی اُس کا باڈی ٹمپریچر زیادہ ہے؟''

''نہیں......سو سے کم ہے۔''

''اگر منہ کا ذائقہ کڑوا ہے تو اُسے کلوروکوئین کا سیرپ پلاؤ، فینسی ڈار کی تین چار گولیاں ایک دم کھلا دو۔ اگر بخار وقفے وقفے سے ہوتا ہے تو صرف کوئی اچھا سا انٹی بائیوٹک سیرپ پلاؤ۔ نقاہت اور مسلسل پانی میں رہنے کی وجہ سے عمومی طور پر بخار چڑھ جاتا ہے۔ فکر نہ کرو، مسلسل رابطے میں رہو، میں تمہیں ٹریٹ منٹ بتلاتا رہوں گا۔'' اُشولال نے تفصیل سے سمجھایا۔

''وہ شاید بہت زیادہ خوفزدہ ہے، شاید موت سے!''

''تمہاری مہمان مریضہ کی عمر کیا ہے؟''

''پینتیس سال!''

''اُس نے بتائی ہے؟''

''نہیں۔''

''پھر تمہیں کیسے پتہ چلا؟''

''محض اندازہ لگایا ہے۔''

''جھوٹ مت بولو۔ اندازہ ہوتا تو کہتے کہ تیس پینتیس سال ہوگی، پورے وثوق کے ساتھ نہ کہتے کہ پینتیس سال عمر ہے۔''

''بال کی کھال اُتارنا تمہارا شوق ہے مُرشد!'' پروفیسر نے مصنوعی قہقہہ لگایا۔

''ایک جھوٹ کو چھپانے کیلئے دوسرا جھوٹ بھی بول دو۔''

''میں کوئی جھوٹ نہیں بول رہا مُرشد!'' وہ کراہا۔

''کہیں ایسا تو نہیں کہ تم نے اپنی جنت کیلئے کوئی حور خرید رکھی ہو؟''

پروفیسر کا فون ایک کان سے لگا تھا، دوسرا کان اُلٹے ہاتھ سے کھینچ کر بولا ''الزام مت لگاؤ، میں نے جو کہا ہے، سچ کہا ہے۔ ویسے بھی مجھے عورت ذات سے نفرت ہے۔ یہ بے وفا جنس ہے، اِس سے دور رہوں گا تو زندہ رہوں گا، قریب جاؤں گا تو اپنے احساس تلے دَب کر مر جاؤں گا۔''

''سئیں! مرد اور عورت، دونوں کو اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے کی اَٹل ضرورت بنا کر دُنیا میں بھیجا

ہے۔ مرد عورت کی طرف کھنچتا ہے، عورت مرد کے بغیر نہیں رہ سکتی، یہ انسان کی فطرت ہے جس سے فرار ممکن ہی نہیں۔ اگر تم نے اپنی جنت کی تنہائی کو کسی رنگ بھرے وجود سے پُر کرنے کی کوشش کر ہی لی ہے تو اِس میں کوئی حرج نہیں، کوئی جرم نہیں۔ یہ غیر فطری عمل نہیں ہے مگر ہاں! اپنے اِس عمل کو شرعی حیثیت دے دو تو ضمیر پر کبھی بوجھ نہیں پڑے گا۔''

''تم سمجھتے کیوں نہیں ہو؟'' وہ حلق کے بَل چیخا ''وہ میری کچھ نہیں لگتی، بڑے ریلے میں بہہ کر آئی اور میں نے بڑی مشکل سے اُس کی جان بچائی ہے۔''

''کیا سیلابی ریلے میں اکیلی وہی بہتی ہوئی دکھائی دی تھی؟''

وہ جھنجلا کر کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ سٹور کے دروازے کے عین وسط میں سموں کھڑی دکھائی دی۔ وہ تعجب بھری نگاہوں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ پروفیسر کے منہ سے بے اختیار نکلا ''کیا بات ہے سموں؟''

سموں کا چہرہ ایک پَل میں متغیر ہو گیا۔ ایسے میں فون میں اَشولال کی طنزیہ آواز گونجی ''چوری پکڑی گئی ناں پروفیسر! بھلا سموں بھی کوئی نام ہوتا ہے؟ ثمینہ، صائمہ، سمیرا...... یا اِن سے ملتا جلتا کوئی نام ہوگا جسے بوڑھا پروفیسر پیار سے بگاڑ کر سموں بنائے بیٹھا ہے۔ کیوں ایسا ہی ہے ناں؟''

وہ فون میں دانت پیس کر بولا ''مُرشد! میں گستاخی سے ڈرتا ہوں۔ تم مجھے اُکسا رہے ہو کہ میں منہ پھاڑ کر جواب دوں۔ اُس کا نام سموں ہے، وہ مسلمان نہیں، ہندو عورت ہے۔ شادی شدہ ہے اور بال بچوں والی ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ میرا اُس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔''

پروفیسر کے کانوں میں اَشولال کا قہقہہ گونجا۔ وہ بدقّت تمام خود پر قابو پا کر بولا ''تمہیں یقین نہیں آیا۔ ہاں! تم شکی مزاج آدمی ہو۔ بہتر ہوگا کہ فوراً میرے پاس چلے آؤ۔ اپنی آنکھوں سے اُسے دیکھ لو تا کہ زندگی بھر مجھے اپنے طنزیہ جملوں سے چھلنی نہ کرتے رہو۔''

''اپنی جنت کی لوکیشن سمجھاؤ، مجھے واقعی تمہارے بیانات پر یقین نہیں آ رہا۔ ایک جوان عورت اگر کسی مرد کی جنت جیسی تنہائی میں زیرِ علاج ہو تو خیر نہیں ہوتی۔'' اَشو نے کہا۔

پروفیسر نے جوش کے عالم میں اُسے جنت کا محلِ وقوع سمجھایا۔

''اچھا سئیں! اَب سمجھا۔تم نے بزداروں والی ڈھنڈھ پرڈیرہ لگا رکھا ہے۔''

''ہاں! یہاں کچا پتن بنا ہوًا ہے مگر اَب وہ پانی میں ڈوبا ہوًا ہے۔ ہر طرف پانی ہی پانی دکھائی دے رہا ہے۔سوائے کشتی کے میرے پاس پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔''

''آج تو ممکن نہیں، میں کل کسی بھی وقت تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔تب تک اللہ حافظ!'' اَشو لال نے پرجوش آواز میں کہا اور فون بند کر دیا۔

سموں اَبھی تک دروازے میں کھڑی تھی۔فون کانوں سے ہٹا تو وہ قریب آ گئی۔ بولی''آپ کون ہیں اور یہ سب کیا ہے؟''

اُس کا اشارہ جنت کی طرف تھا۔

''میں دنیا سے بیزار انسان ہوں۔ یہ میری جنت ہے اور میرے سمیت ہمیشہ یہیں رہتی ہے۔''

پروفیسر نے اُسے ایک ٹک دیکھتے ہوئے کہا''تم کیوں یہاں چلی آئیں؟''

''آپ جس سے فون پر بات کر رہے تھے وہ آپ پر شک کیوں کر رہا تھا؟''

''تم نادان نہیں ہو۔''

وہ جھینپ سی گئی۔ بولی''نہ جانے آپ کو دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے میں نے پہلے بھی کہیں آپ کو دیکھ رکھا ہو۔''

پروفیسر کا دل دھڑکنے لگا۔ شناسائی کا جذبہ سدھ مندی کے عود کرتے ہی اُترنے لگا تھا۔ بظاہر لاپرواہی سے بولا''اِس بارے میں میں کیا کہہ سکتا ہوں؟''

''آپ نے اپنے دوست سے کہا ہے کہ آپ عورت ذات سے نفرت کرتے ہیں، کیا واقعی ایسا ہی ہے؟''

''ہاں!'' اُس نے اَٹل لہجے میں کہا۔

''کیوں؟''

''اِس کا جواب میں اپنے دوست کو دے چکا ہوں۔تم بھی سننا چاہتی تو سن لو کہ یہ جنس نہائت عامیانہ جذبات کی مالک ہوتی ہے، بے حد نامعتبر اور موقع پرست ہوتی ہے۔'' پروفیسر کے لہجے میں

نہ چاہتے ہوئے بھی غیر معمولی تلخی گھل گئی۔

''پھر زندگی بچانے کا احسان مجھ پر کیوں کیا آپ نے؟''

''مجھے تم سے نفرت نہیں ہے۔''

''کیا میں عورت نہیں ہوں؟''

''شاید نہیں ہو۔'' اُس نے جان چھڑانا چاہی ''کیا تم خود کو مکمل طور پر فِٹ محسوس کر رہی ہو؟''

اُس نے اثبات میں سر ہلایا، منہ سے کچھ نہیں بولی۔

''ادھر چل کر بیٹھو، میں چائے بنا کر لاتا ہوں۔''

''میرا خیال ہے کہ میں اچھی چائے بنا سکتی ہوں۔'' وہ بولی اور پلٹ کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔ چونکہ دروازہ اَدھ کھلا تھا، اِس لئے کچن کے اندر ریک میں پڑے برتنوں کو دیکھ کر بخوبی اندازہ ہوسکتا تھا کہ یہ کچن ہے۔ وہ اُس کے پیچھے پیچھے کچن میں آیا۔ اُسے کچن میں پڑی ہوئی مختلف اشیاء کے بارے میں سمجھا کر کرسی میں آن بیٹھا۔

آج دریائی پانی کے اضطراب میں خاصی کمی واقع ہوچکی تھی مگر فضا میں حبس کچھ زیادہ ہوگیا تھا۔ عجیب سی بساند ماحول میں رچی بسی تھی۔ چڑھے ہوئے پانی میں بہہ کر آنے والا سامان بھی خال خال دکھائی دے رہا تھا۔ چند ہی منٹوں کے بعد سموں چائے ٹرے میں رکھ کر وہیں آ گئی۔ چائے پیش کرتے ہوئے بولی ''آپ کو میرے نام کا کیسے پتہ چلا؟''

پروفیسر کو اِس سوال کی توقع تھی۔ بات پہلے ہی بنائے بیٹھا تھا، اِس لئے بے نیازی سے بھوئیں اُچکا کر بولا ''تم نے بے ہوشی میں اپنے نام اور مذہب سے آگاہ کیا تھا۔''

''میں نے اور کیا کچھ بتلایا تھا؟''

''بے ہوشی میں بتلائے ہوئے کو چھوڑو، ہوش میں رہ کر بتاؤ۔'' پروفیسر نے اپنی نظریں اُس کے چہرے پر گاڑ دیں۔ اسے حیرانی ہوئی کہ سموں کے چہرے پر حزن واضطرار کے بجائے پُرعافیت سکون جھلک رہا تھا۔

وہ چائے کا گھونٹ بھر کر بولی ''میرا نام واقعی سموں ہے۔''

اچانک چونک پڑی۔ آنکھوں سے عجیب سا تاثر جھانکنے لگا۔ پروفیسر نے استعجاب آمیز لہجے میں پوچھا ''کیا ہوا؟''

''آپ کا نام کیا ہے؟''

''میرا نام وسیم ہے۔'' اُس نے روانی میں کہہ دیا۔ تیر ہاتھوں سے نکل گیا تو غلطی کا احساس ہوا۔ سموں کے چہرے کے تاثرات یک لخت بدل گئے۔ وہ کپ تھامے کھڑی ہوگئی۔ عجیب سی بے یقین نظروں سے دیکھتے ہوئے آہستگی سے بڑبڑانے کے سے انداز میں گویا ہوئی ''سیمو......تم؟ میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ تم سیمو ہو۔ ہے ناں؟''

خود کو چھپانا بے سود تھا۔ وہ ویسے بھی خود کو چھپانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اثبات میں سر ہلا کر بولا ''ہاں سموں! میں وہی سیمو ہوں جسے تمہارے باپ نے پالا پوسا، پڑھایا اور ایک جرم کی پاداش میں مجھے گھر سے نکال دیا، تمہیں میری زندگی سے نکال دیا۔ میں وہی ہوں۔''

چائے کا کپ سموں کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ ایک زوردار آواز کے ساتھ چوبی فرش پر گرا اور لڑھک کر پروفیسر کے قدموں میں آ گیا۔ وہ چند لمحوں تک کھڑی اُسے ایک ٹک دیکھتی رہی پھر اتنی تیزی سے پروفیسر پر آن گری کہ اُسے سنبھلنے کا موقع نہ ملا۔ یہ تو شکر تھا کہ کرسی چوبی فرش میں مضبوطی سے نصب تھی ورنہ وہ پیچھے کی طرف الٹ جاتی۔ وہ دیوانہ وار اُسے چومتی جاتی تھی، روتی جاتی تھی اور بار بار کہتی جاتی تھی ''میرے نصیبے کی طرح میری آنکھیں پھوٹ کیوں نہیں گئیں جنہوں نے اپنے سیمو کو بھی نہیں پہچانا!''

پروفیسر کو لڑکپن میں خود سے چپکنے والے لمس کی یاد آ ئی۔ تنفس معتدل نہ رہا۔ پہلی مرتبہ اپنی ذات میں کچھ ٹوٹتا بکھرتا محسوس ہوا۔ اُس نے بہ دقّت تمام خود کو سموں کی جذبات خیز گرفت سے آزاد کیا اور اُلٹے قدموں چلتے ہوئے ریلنگ تک آیا۔ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ مشتعل سانسوں پر قابو پاتے ہوئے لرزیدہ آواز میں بولا ''سموں! وہ بیس سال پرانی بات ہے۔ وہ بچپن تھا، یہ بڑھاپا ہے۔ بڑھاپے میں محبت، نظر اور دِل......سب کچھ بوڑھا ہو جاتا ہے۔ ہم بوڑھے ہو گئے ہیں۔ ایسے میں نہ پہچاننے پر ہمیں شرمسار نہیں ہونا چاہیے۔''

وہ وہیں ٹھہری رہی۔ بولی ''سچ بتاؤ! کیا میں نے بے ہوشی میں کچھ بتلایا تھا؟''
''نہیں!''
''یہ کیسا بڑھاپا ہے جو صرف مجھ پر اُترا ہے، تم پر نہیں۔'' وہ تأسف بھرے لہجے میں بولی ''تم نے شاید مجھے پہچان کر مرنے سے بچایا تھا مگر افسوس! میں اپنے سیمو کو پہچاننے میں ناکام رہی۔''
پروفیسر نے تسلی دی ''بہرحال! یہ اِتنی بڑی بات بھی نہیں ہے کہ اِسے یوں دِل پر لیا جائے۔''
وہ پروفیسر وسیم سے شاید کبھی کھل کر بات نہ کرپاتی، سیمو سے کھلی تو چپ کرنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ اپنے بارے میں، اپنے مرحوم شوہر کے بارے میں، اپنے بیٹے کندن چند اور بیٹی شکنتلا کے بارے میں ڈھیر ساری باتیں کرکے بھی تشنہ گام رہی۔
اُس نے بتلایا کہ اُس کے باپ دیپک چند اور ماں کا چند سال پیشتر دیہانت ہو گیا تھا۔ شوہر کا ساتھ چھوٹے پانچواں سال گزر رہا تھا۔ وہ کھانستے کھانستے خون الٹنے لگا تھا۔ علاج کارگر ثابت نہ ہوا اور وہ راکھ بن کر ساگر میں بہہ گیا۔ کندن چند میٹرک کے بعد سائنس پڑھنے کیلئے ملتان کے کالج میں زیر تعلیم تھا۔ شکنتلا نرسنگ کے پہلے سال میں تھی۔ وہ ساگر کنارے بنے ہوئے ناپختہ گھر میں مہینوں اپنے بچوں کے آنے کا انتظار کرتی تھی۔ وہ آتے تو اُس کی زندگی میں بہار آجاتی۔ چلے جاتے تو انتظار کا کرب روز بہ روز بڑھتا جاتا۔
دونوں بچوں نے فون پر بتلایا تھا کہ وہ چند چھٹیاں لے کر ماں کے پاس رہنے کیلئے آرہے ہیں۔ وہ نہیں آئے، ساگر کا بپھرا ہوا پانی آ گیا۔ پوری کی پوری بستی ملیا میٹ ہوگئی۔ دریا برد ہوگئی۔ اُسے یاد تھا کہ وہ چند عورتوں کے ساتھ گاؤں سے پختہ سڑک پر جانے والے راستے پر دوڑی جارہی تھی کہ اچانک پانی کی اونچی لہر نے اُن سب کو دبوچ لیا۔ پھر اُسے پانی میں مسلسل ہاتھ پاؤں مارنا ہی یاد رہا تھا، باقی سب کچھ محو ہو گیا۔
پروفیسر نے اُس کی کتھا سُن کر عافیت کا سانس حلق میں اُتارا اور جی ہی جی میں بولا ''تو یہ بات تھی، میں بھی کہوں کہ اِسے اپنے خاندان کی فکر کیوں نہیں؟ اِس کے مرنے والے پہلے ہی مر چکے ہیں، بچے محفوظ جگہ پر محفوظ حالت میں ہیں، ایسے میں اِسے پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟''

دونوں آمنے سامنے کھڑے خاموش موازنہ کررہے تھے۔بیس برسوں کے گزرنے پر دونوں ایک جیسے تھے۔فرق صرف یہ تھا کہ پروفیسر کے پاس جنت تھی۔سموں کے پاس جیتے جاگتے دو بدن تھے جن کو دیکھ دیکھ کر وہ زندہ رہتی تھی۔

...●...

وہ ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے صوفے میں بیٹھا تھا۔جھولی کاغذات سے بھری ہوئی تھی جبکہ ہنس صوفے کے آرم ریسٹ پر چڑھا بیٹھا تھا۔غور سے اُسے کام کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ازراہِ استعجاب پوچھا''بابا! کیا آپ بھی سبق پڑھتے ہیں؟''

''جی بیٹا! انسان تمام عمر سبق پڑھتا، یاد کرتا یا سیکھتا رہتا ہے۔''

اُس کا منہ بن گیا۔

ایسے میں ٹک ٹک کرتی قسمت بھی وہیں آن دھمکی۔ڈاکٹر نے سر اُٹھایا۔قسمت دکھائی دی۔پیاری لگی۔پاس بلا کر گال پر چپت لگاتے ہوئے پوچھا''کیسی ہے یہ پیاری سی گڑیا؟''

ہنس نے فوراً کہا''بہت پیاری پاپا!''

چائے ٹرے میں رکھ کر لاتی ہوئی شناں ٹھٹک گئی۔معنی خیز انداز میں مسکرانے لگی۔

قسمت نے سلام کیلئے ننھا سا ہاتھ بڑھایا جسے اُس نے تھام لیا۔بولی''واقعی! قسمت بہت پیاری ہے۔اتنی کہ باپ بیٹے کی آنکھوں کو پتھرائے کھڑی ہے۔''

وہ جھینپ کر بولی''آنٹی!''

ہنس جلدی سے صوفے سے اُتر آیا۔قسمت کی بغل میں دَبے مدھو کو پکڑ کر بہ احتیاط دیکھنے لگا

''اِسے کیا ہوا قسمت؟''

قسمت نے اُسے دکھایا کہ مدھو کا سر پھٹا ہوا تھا۔تھوڑی سی جگہ پر سے بال اکھڑ گئے تھے۔ہنس نے پریشانی سے پوچھا''کیا ہوا اِسے؟''

''یہ گر گیا۔اِسے سر میں چوٹ لگ گئی ہے۔پاپا گھر میں نہیں ہیں اِس لئے انکل کے پاس لے کر

آ ئی ہوں۔ پلیز انکل! بدھو کی مرہم پٹی کر دیں ناں!''

ڈاکٹر نے بالشت بھر کے مدھو کا جائزہ لیا۔ مسکرا کر بولا ''ہڈی بچ گئی ہے۔ جلد پھٹی ہے، دو چار دِنوں میں خود بخود ٹھیک ہو جائے گی۔''

قسمت کو یقین نہیں آیا۔ منہ بنا کر بولی ''پٹی نہیں ہوگی تو ٹھیک نہیں ہوگا۔ آپ اِسے ٹیکہ بھی لگا دیں۔ ماما کہتی ہیں کہ زخم پر مٹی یا پانی پڑ جائے تو وہ خراب ہو جاتا ہے۔''

شناں نے ٹرے میز پر رکھی اور ہنس کر کہا ''اِدھر لاؤ بیٹی! میں اِس کا علاج کر دیتی ہوں۔''

ہنس اور قسمت خوشی خوشی شناں کے آگے پیچھے چلتے ہوئے کچن میں آئے۔ شناں نے برتن سمیٹے اور اُنہیں لے کر بیڈ روم میں آ گئی جس کی ایک الماری میں کسی ناگہانی صورتِ حال سے نبٹنے کیلئے فرسٹ ایڈ بکس دھرا ہوا تھا۔ شناں نہ دکھائی دینے والے زخم کی صفائی کر کے پٹی باندھنے لگی تھی جب قسمت نے اچانک پوچھ لیا ''آنٹی! کیا ہمارا بدھو پاگل تو نہیں ہو جائے گا؟''

''نہیں بیٹا!'' وہ اُس کی تشویش پر زیرِ لب مسکرائی۔

''پاپا کہتے ہیں کہ سر کی چوٹ بہت بری ہوتی ہے۔'' وہ اَبھی بھی متفکر تھی۔

''ہاں ماما! قسمت ٹھیک کہتی ہے۔'' ہنس نے تائید کی۔

''میں علاج کرتی ہوں، تم دونوں اللہ میاں سے دُعا کرو کہ بدھو کا دماغ ٹھیک ٹھیک کام کرتا رہے۔'' شناں نے اُنہیں مصروف کرنے کیلئے نئی راہ سجھا دیا۔

قسمت نے مایوسی سے ہنس کو دیکھا، بولی ''ہنس! بدھو نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو میں اِسے پیٹوں گی۔ ہاں!''

ہنس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اُس کے کانوں تک تینوں کی باتیں پہنچ رہی تھیں۔ نظریں کاغذات پر تھرک رہی تھیں، ذہن کسی اور جہت میں سرگرداں ہو گیا۔ گزشتہ چند دِنوں سے عجیب کیفیت میں مبتلا تھا۔ سوچتی آنکھوں میں اَن گنت سوالیہ نشان بن گئے تھے جو لاینحل ہونے لگے تھے۔

وہ کوئی عام آدمی نہیں تھا، خاصوں میں بھی خاص مقام رکھتا تھا۔ قسمت کا نام اُسے الجھاتا تھا۔

قسمت اور ہنس کا کردار اُسے مسلسل بے چین کئے رکھتا تھا۔ وہ جونہی اُن کے بنائے ہوئے دریا، کشتی اور پوڈو کو دیکھتا، اُس کا ذہن غیر ارادی طور پر پروفیسر وسیم بزار کی طرف چلا جاتا۔ اپنی بیوی کے کہے کو صادق جانتے ہوئے پہلے پہل تو اِس یکسانیت کو محض اتفاق قرار دے کر جھٹک دینے میں کامیاب ہو جاتا تھا مگر جب سے سیلاب اور سیلاب میں بہہ کر آنے والی سموں کے بارے میں پتہ چلا تھا، تب سے وہ دل میں حبس محسوس کرنے لگا تھا۔

پَے در پَے رونما ہونے والے اتفاقات نے اُسے دہلا کر رکھ دیا تھا۔ سوچ میں پڑ گیا۔ قسمت نے غیر فطری انداز میں کشتی کو پانی میں روک رکھا ہے۔ پوڈو کسی کو کشتی میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں دیتا۔ قسمت نے پوڈو کے پاس چند کرداروں کو بیٹھا کر عجیب پیغام دیا۔ چیونٹوں کا حملہ، سیلابی ریلے میں کشتی کے الٹنے کا ڈر، للّی کا پانی میں بہتے ہوئے کشتی میں پہنچنا...... یہ سب کیا تھا؟ اگر یہ محض کھیل تھا تو عین اِسی انداز میں پروفیسر وسیم بزدار کی بنائی ہوئی جنت کیوں کروٹیں بدل رہی تھی؟

وہ چند دِنوں سے قسمت کے دوسرے کھلونوں کو بہ غور دیکھ رہا تھا۔ ہنس اور قسمت کی باتیں سننے کیلئے اُسے خاصی محنت کرنا پڑتی تھی۔ وہ اِس نتیجے پر پہنچا تھا کہ فینی، مدھو، فینی کا بھائی، فینی کا کزن، ٹونی اور دوسرے اَن گنت گڈے گڈیاں خبر رساں ہیں۔ خبر ساز کون ہے؟ خبر کیا ہے؟ سچ کہاں مخفی ہے؟...... لاینحل سوالات نے اُس کے ذہن پر بے طرح سے یورش کر رکھی تھی۔ وہ ہر مصروفیت کو بالائے طاق رکھ کر اِس سبجیکٹ پر کام کرنا چاہتا تھا مگر پیشہ وارانہ مصروفیت اُسے مہلت نہیں دے رہی تھی۔ وہ مسیحائی کے پیغمبری پیشے سے منسلک تھا جہاں اپنی زندگی کو بھی دوسروں کے احتیاج پر قربان کرنا پڑتا ہے۔

اُسے یقین ہو گیا کہ محض پروفیسر اور اُس کی جنت قسمت کے کھیل سے اتفاقیہ مسابقت نہیں رکھتی بلکہ کئی اور لوگ بھی اِس کھیل سے منسلک ہو چکے ہیں۔ کون؟ اُس کی فراخ پیشانی پر اَن گنت بَل پڑ گئے۔ زیرِ لب گنگنانے لگا۔ اِس گنگناہٹ میں عجیب سوز پنہاں تھا۔

متاں کِردے ہوون ڈکھ اپنے
چُونے کھول کے اساں وی نچ ڈیکھوں

(ممکن ہے ہم پر اپنا تسلط جمانے والے دکھ جھڑ جائیں، ہم بھی بال کھول کر ناچتے ہیں۔)
ٹرے میں رَکھی ہوئی چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔

...❦...

اُس نے دو تین مرتبہ شہاب سے کہا تھا کہ وہ اپنے والدین کو اُن کے ہاں بھیجے۔ وہ مسکرا کر تسلی دینے کے سے انداز میں کہتا ''جان! ایسی بھی کیا جلدی؟ جب قریب آ جائیں گے تو پھر فراق میں تڑپنے کا لطف ہمیشہ کیلئے رخصت ہو جائے گا۔''

وہ اُس کی باتوں میں آ کر بھول جاتی کہ کیا کہنے کیلئے آئی تھی۔ وہ چلا جاتا تو یاد آتا، پھر سر پیٹ کر خود کو کوسنے لگتی۔ وہ چاہتی تھی کہ شادی جب بھی انجام پذیر ہو، منگنی بغیر کسی تاخیر کے فوری طور پر ہو جانی چاہیے۔ وہ شہاب کو بتلا نہیں سکتی تھی کہ اُس نے اپنے پاپا کو کس طرح اِس شادی پر رضامند کیا تھا۔

پھر جب اُس کے دیکھتے ہی دیکھتے عمران اور وجدان کے دِلوں کی سنی گئی تو وہ بے جا گھبراہٹ کا شکار ہو گئی۔ ماما نے بڑے چاؤ سے عمران کی منگیتر انداوان کیلئے سامان تیار کر کے اچھی خاصی رقم خرچ کرتے ہوئے وین ژو بھیجا تھا۔ ہزاروں میل دور دونوں نے منگنی کی رسم ادا کی جسے تمام گھر والوں نے وڈیو فلم پر دیکھا اور اَدھوری خوشی کو مکمل سمجھ کر دل کو راضی کر لیا۔ پاپا نے عمران کو اِس شرط پر وین ژو میں منگنی کی تقریب منعقد کرنے کی اجازت دی تھی کہ دونوں کی شادی پاکستان میں انجام پائے گی۔ عمران نے بہ خوشی پاپا کا حکم مان لیا۔ ماما اور پاپا نے وجدان کی منگنی پر جی کھول کر خوشیاں منائیں۔ ایک واہمہ جو مصباح کے دل میں چور بن کر بیٹھا ہوا تھا کہ پاپا اور ماما خوش نہیں ہوں گے، آپوں آپ ہی مر گیا۔

اپنے گھر میں رقصاں خوشیوں میں عکس عکس نہاتی ہوئی مصباح کو روز بہ روز شہاب کے چہرے پر چھانے والی مایوسی کی پرچھائیاں دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ وہ صبح سے شام تک ایک ہی جہت میں سرگرداں تھا۔ ایک ہی ترکیب سوچتا رہتا تھا۔ کس طرح مصباح کو دُنیا سے چھپانے کیلئے اپنی آنکھ کا

سرمہ بنائے؟ اُسے اپنے بابا کی سفاک رَوی سے بھی ڈرلگتا تھا۔ کہیں یہ نہ ہو کہ بیٹے کو ہاتھ سے نکلتا دیکھ کر وہ مصباح کے خاندان پر قیامت پرٹوٹ پڑے۔ اُسے اتنا تو اندازہ تھا کہ سلطان علی اور اُس کا خاندان، خواہ غریب نہیں تھا، مگر بابا کا ہم پلہ نہیں تھا اور نہ ہی اتنی لمبی بانہیں رکھتا تھا۔

وہی گراسی پلاٹ، وہی سنگی بنچ...... بدلتی راتوں کی تنہائی اور ہسپتال سے سنائی دینے والی کراہیں اور سسکیاں...... ایک رات عشق نے اُس کی بے بسی کو بھانپ لیا۔ ہاتھ بڑھا کر اپنے ساتھ چلاتے ہوئے سمجھانے لگا کہ اُسے کیا کرنا چاہیے۔ وہ سمجھتا جاتا تھا، ارادوں کو پتھر اور فولاد کی طرح مضبوط کرتا جاتا تھا۔

بیٹھے بیٹھائے سجھائی دینے والی ترکیب اچھی تھی مگر اِس میں خودغرضی کا پہلو نمایاں تھا۔ اُس نے سر جھٹک کر خودکلامی کی ''مجھے ہرحال میں اپنی مصباح چاہیے۔ خواہ دُنیا میں کچھ رہے یا نہ رہے، مجھے اِس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔''

اُس نے پکے منصوبہ سازوں کی طرح پلاننگ کی۔ کہیں کوئی سقم نہ رہ جائے کہ بنا بنایا کھیل چوپٹ ہو جائے۔ اُسے دو دوستوں کی معاونت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اپنے نوکروں پر یا زمین پر کام کرنے والوں پر اعتبار کرنا نقصان دہ نظر آیا۔ ایسے میں فرخ اور بابر اقبال کی طرف دھیان چلا گیا۔ وہ دونوں نہ صرف پڑھے لکھے اور مضبوط اعصاب کے مالک تھے بلکہ اُس پر جان نثار کرنے کا حوصلہ بھی رکھتے تھے۔

تینوں نے ایک ہوٹل کے شہاب کیلئے ریزرو رہنے والے کمرے میں بیٹھ کر منصوبے کی جزئیات پر سیر حاصل گفتگو کی۔ فرخ نے تشویش زدہ لہجے میں پوچھا ''یار شہاب! یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ اِس تمام خطرناک پلان کا نتیجہ ہماری توقع کے برعکس نکلے۔''

''کچھ وضاحت کرو۔'' بابر نے کہا۔

''ہم دونوں آئی بی کے اہلکار بن کر مخصوص مقام سے شہاب اور مصباح کو اغوا کر لیتے ہیں اور ایگری فارم تک لے جانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ تفتیش کے نام پر دونوں کو ہراساں کرتے ہیں۔ اِنہیں ڈراتے دھمکاتے ہیں کہ بغیر نکاح کے گھومنے پھرنے والے جوڑے پر کون کون سی

دفعات لگ سکتی ہیں اور اِنہیں دانستہ ایک موقع دیتے ہیں کہ یہ نکاح پڑھوالیں۔فرض کرو کہ یہاں تک معاملہ بہ خوبی نبٹ جاتا ہے مگر مصباح شرعی نکاح یا کورٹ میرج پر رضامند نہیں ہوتی، وہ اَڑ جاتی ہے، پھر ہم کیا کریں گے؟ یہ ڈراما اگر طویل دورانئے پر محیط ہوجاتا ہے تو ہم دوطرف سے گھر جائیں گے۔''

''تم شاید ڈر گئے ہو۔''شہاب نے مایوسی سے کہا۔

''نہیں دوست!''فرخ نے کندھا تھپتھپایا''ڈر صرف تمہارے ناظم باپ کے اندھے اختیارات کا ہے، کہیں یہ نہ ہو کہ وہ پورے ضلع کی پولیس کو ہمارے پیچھے لگادے۔آئی بی کی گاڑی اور یونیفارم کا معاملہ بھی عام سا نہیں ہے۔''

''کیا میں تمہارے ساتھ نہیں ہوں گا؟''شہاب نے تلخی سے کہا''ویسے بھی مصباح کو خاک پتہ ہوگا کہ آئی بی کیا ہوتی ہے؟ میں ڈر جاؤں گا، وہ مجھے دیکھ کر ڈر جائے گی اور جو کہتا جاؤں گا، وہ کرتی جائے گی۔''

''یہ بات تمہارے اور ہمارے مابین ہوگی، تمہارے باپ کو یا مصباح کے گھر والوں کو علم نہیں ہوگا۔''

''شہاب! اِس ڈرامے میں بہت سے جھول ہیں۔اِسے نئے سرے سے ترتیب دینا ہوگا۔''بابر اقبال بھی فرخ کا حامی ہوگیا۔

''میں جو سوچ سکتا تھا، سوچ چکا، اَب سوچنے کی ذمہ داری بھی تم دونوں پر عائد ہوتی ہے۔ مجھے تو بس اتنا علم ہے کہ میں نے ہر حال میں اپنی مصباح کو حاصل کرنا ہے۔''شہاب نے بے بسی سے کہا۔

فرخ نے کن اکھیوں سے بابر کو دیکھا۔آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ کہا سنا پھر بولا''شہاب! ہمیں کچھ وقت دو۔میں نہیں چاہتا کہ تم بجائے مصباح کو حاصل کرنے کے، ہمیشہ کیلئے اُسے گنوا بیٹھو۔یہ بہت حساس معاملہ ہے۔''

شہاب نے کندھے اُچکائے۔اِس کے علاوہ اُس کے پاس کوئی چارہ کار نہیں تھا۔

''کیا تم براہِ راست اپنے ہونے والے سسر سے مل کر اپنی مجبوری بیان نہیں کر سکتے؟''فرخ نے

شہاب سے پوچھا۔

''اگر ایسا ممکن ہوتا تو میں اتنا لمبا چکر کیوں کاٹتا؟'' وہ منہ بنا کر بولا ''وہ اتنے گرے پڑے لوگ نہیں ہیں کہ میں اکیلا رشتہ مانگنے اُن کے گھر چلا جاؤں اور وہ اپنی بیٹی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھما کر بابل کے گیت گاتے ہوئے الوداع کر دیں۔''

اُس کا کہنے کا انداز اتنا مضحکہ خیز تھا کہ دونوں بے اختیار ہنس پڑے۔ بابر نے کہا ''تم فکر نہ کرو شہاب! ہمارے ہوتے ہوئے تمہیں عشق میں ناکامی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔''

''مجھے کوئی آس دلاؤ، کوئی مضبوط دلاسہ دو تو مجھے چین آئے۔''

''ہوں!'' فرخ کچھ دیر تک سر جھکائے بیٹھا سوچتا رہا، پھر پُریقین لہجے میں بولا ''میں نے سوچ لیا ہے، تم گھر جاؤ، اپنی دل نشیں کو ہاتھ میں کرو۔ تمہیں فون پر ایگری فارم پر مدعو کروں تو اُسے گاڑی میں بیٹھا کر روانہ ہو جانا۔ اُسے کس طرح لے کر آنا ہے، کس طرح اعتماد میں لانا ہے، یہ تمہارا کام ہے۔ آگے کا سارا کام ہمارا ہے۔''

وہ تشکیک آمیز انداز میں بولا ''کچھ پتہ بھی تو چلے کہ تم کیا کرنا چاہتے ہو؟''

''یہ بتانا سرِ دست ضروری نہیں ہے۔''

بابر نے سوالیہ نگاہوں سے گھورا ''کچھ تو بتاؤ!''

''بتانے کا موقع آئے گا تو ضرور بتاؤں گا۔''

پھر دونوں کو فرخ کے بن بتائے پلان پر اتفاق کرنا پڑا۔

شہاب گھر پہنچا اور فون پر مصباح سے گپ شپ کرنے لگا۔ اُس کے دریافت کرنے پر گول مول انداز میں سمجھانے لگا ''عن قریب تمہیں خوش خبری سنانے کا ارادہ رکھتا ہوں، سرپرائز دینا چاہتا ہوں۔ خاموشی سے انتظار کرو۔''

''تمہارے والدین کب آ رہے ہیں ہمارے ہاں؟''

''بہت بے صبری ہو رہی ہو!'' وہ ہنسا ''کہہ تو دیا ہے کہ بہت جلد تمہیں سرپرائز دے رہا ہوں۔''

''یہ کیسا سرپرائز ہو گا جس کے بارے میں مجھے پہلے سے ہی پتہ ہو گا؟'' مصباح نے مسکرا کر کہا۔

''تم کچھ بھی نہیں جانتی ہو میری جان!''

''پھر بتا ہی دو، کیوں پریشان کر رہے ہو؟''

''پریشان نہیں، حیران کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ میں دیکھ لوں گی کہ تم کون سا تیر چلاتے ہو۔'' وہ منہ بنا کر بولی۔ جی ہی جی میں خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔

شہاب فون بند کرنے کے بعد چین کی نیند سو نہ پایا۔ اُسے رہ رہ کر اپنی بے بسی اور سوچے جانے والے شارٹ کٹ پر شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ اتنا پڑھ لکھ کر، اتنا خوبصورت اور بے داغ عشق کرنے کے بعد بھی اُسے مجرمانہ طریقے سے مصباح کو حاصل کرنا پڑ رہا تھا، یہ اُس کیلئے ڈوب مرنے کا مقام تھا مگر وہ آگ کے دریا کو عبور کرنے کیلئے ڈوب جلنے سے خود کو روک نہیں پا رہا تھا۔ رات گزری، بے چینی میں دِن بھی گزر گیا مگر فرخ نے رابطہ نہیں کیا۔ اُس نے فون کیا تو پتہ چلا کہ وہ اپنا موبائل گھر بھول گیا تھا۔

شام کو حسبِ وعدہ مصباح ہوٹل میں اُس کے سامنے اپنی تمام تر حشر سامانیوں سمیت جلوہ افروز تھی۔ مسکرا کر پوچھ رہی تھی ''تم نے خواہ مخواہ کہانی میں تجسس انگیز ٹوئسٹ دینے کی کوشش کی ہے وگرنہ شاید کچھ بھی ایسا نہیں ہے جو مجھے حیران کر دے۔''

وہ زیرلب مسکرایا، بولا ''دیکھتی جاؤ۔''

وہ اُس پر غصہ بھری نگاہ ڈال کر کھڑی ہو گئی۔ کرسیوں کے بیچ سے نکل کر جانے لگی تو اُس نے گھبرا کر پوچھا ''اے! کہاں جا رہی ہو؟''

وہ گردن موڑ کر بولی ''تم نے خود ہی تو کہا ہے کہ دیکھتی جاؤ، میں دیکھ رہی ہوں اور یہاں سے جا بھی رہی ہوں۔ خدا حافظ!''

وہ دوڑ کر اُس کے مقابل آ گیا۔ دونوں شانوں سے پکڑ کر روکتے ہوئے بولا ''احمق لڑکی! میرا کہنے کا یہ مطلب تو نہیں تھا۔''

''تو کیا تھا؟'' وہ منہ بنا کر بولی۔

وہ اُسے تقریباً کھینچ کر ٹیبل پر لایا۔ بیٹھا کر ہنستے ہوئے بولا ''میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ تم دیکھتی جاؤ کہ میں کیا کرتا ہوں۔''

''وہ تو میں دیکھ ہی رہی ہوں۔'' وہ بدستور بگڑی ہوئی تھی۔

''کیا؟''

''کہ تم ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہو۔''

''فارغ بیٹھ کر مکھیاں تو نہیں مارتا ناں!''

وہ بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اُسے دھیان ہی نہیں رہا تھا کہ شہاب کی نگاہیں اُس پر جمی ہوئی تھیں۔ اُسے یوں ہنستے دیکھ کر شہاب کا چہرہ ساکت ہو گیا، آنکھوں کی پتلیاں ٹھہر سی گئیں۔ ایک ٹک دیوانوں کی طرح اُسے دیکھے گیا۔ اُس کی نظروں کی آشفتگی کی تاب نہ لا کر وہ ہنستے ہنستے رُک گئی۔ سن رہ گئی۔ خفت زدہ ہو کر سر جھکا کر سوچنے لگی ''ہائے شہاب! میں جب بھی ہنستی ہوں، تم مجھے یوں پاگلوں کی طرح پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھنے لگتے ہو کہ مجھے شرم آ جاتی ہے، لاج آ جاتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ تمہیں دکھانے کیلئے ہنستی رہوں، جب ہنستی ہوں تو تمہاری آنکھیں مجھے ٹوکنے لگتی ہیں...... بول! میں کیا کروں؟''

ایک جذبات آگیں گہرا سانس لے کر شہاب نے تھکے تھکے سے لہجے میں کہا ''مصباح! تم دُنیا کی سب سے زیادہ خوبصورت لڑکی ہو۔ بلا مقابلہ مس یونیورس ہو...... ہنستی ہو تو یوں لگتا ہے جیسے تمہاری جلترنگ کی تال پر پورا زمانہ جھوم کر رقص کرنے لگا ہو، چپ ہوتی ہو تو لگتا ہے جیسے قیامت آنے والی ہے اور ہر کوئی ساکت ہو کر اُس کا انتظار کر رہا ہو۔''

مصباح کا جی چاہا کہ وہ کھڑی ہو جائے اور ہوٹل میں موجود لوگوں کی پرواہ کئے بغیر جی کھول کر ہنسے، ہنس ہنس کر بے حال ہو جائے اور جھوم جھوم کر اپنی سُدھ کھو دے...... کوئی یوں ٹوٹ کر چاہے تو پوری دُنیا حیثیت کے ثانوی خانے میں جا گرتی ہے۔

ڈرنک اور سینڈوچ سرو ہو گئے۔ پلیٹوں کی کھنکار کے بیچ ہی شہاب کے موبائل فون کا بزر بجنے لگا۔ اُس نے فون نکال کر آن کیا اور کان سے لگا کر ''ہیلو'' کہا۔ فرخ نئے نمبر سے بول رہا تھا ''شہاب!

کہاں ہو؟''

''میں گھر میں نہیں ہوں۔''

''جہاں ہو، کیا صرف مجھے ہی سن رہے ہو؟''

''ہاں! تم بات کرو، میں سن رہا ہوں۔''

''ہمارا پروگرام حتمی شکل اختیار کر گیا ہے۔ آؤٹ ڈور شوٹنگ میں صرف ہیرو اور ہیروئن کا انتظار ہے۔ کب ڈیٹ مل سکتی ہے، یہ تو تم ہی بتا سکتے ہو۔'' فرخ کے لہجے میں شرارت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

''ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ فون کر کے بتا دوں گا۔ کیا تم اِسی نمبر پر موجود رہو گے؟'' شہاب نے دانستہ طور پر مصباح کو دیکھنے سے گریز کیا۔

''ٹھیک ہے۔ جب بھی شہر سے میرے ایگری فارم کی طرف چل نکلو، فون کر کے اطّلاع کر دینا۔ ہم شہزادہ عالم پناہ اور ملکہ عالیہ کیلئے با ملاحظہ ہوشیار کی صدائیں سجائے منتظر ہوں گے۔''

''او کے!'' شہاب نے کہا تو فرخ نے فون بند کر دیا مگر شہاب نے فون کان سے نہیں ہٹایا بلکہ تسلسل کے ساتھ محوِ گفتگو رہا ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ کیا تمہاری فیملی بھی وہیں موجود ہوگی؟''

چند لمحے خاموش رہا۔ اُس کا انہماک ظاہر کر رہا تھا کہ وہ فون پر مخاطب کی بات سن رہا ہے۔ پھر بولا ''ارے واہ! پھر تو گرینڈ فنکشن ہوگا۔ مجھے ماما کی محبت کا علم تو ہے مگر یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ میری محبت میں اِس حد تک آگے جا سکتی ہیں۔'' اُس کا چہرہ خوشی سے کھلا جا رہا تھا۔

مصباح بہ غور اُس کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ کو دیکھ رہی تھی، سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی مگر سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ شہاب کہہ رہا تھا ''کیا واقعی؟ ارے یار تم مجھے قسطوں میں مارنے کا ارادہ رکھتے ہو شاید! ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ میں پہنچ جاؤں گا۔ خدا حافظ!''

شہاب نے فون بند کر دیا۔ وہ جلدی سے بولی ''بہت خوش دکھائی دے رہے ہو، کیا بات ہے؟''

شہاب کے لبوں پر جاندار مسکراہٹ تیر گئی۔ آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ شرارت بھرے لہجے میں بتلانے لگا ''میں ہر اُس خبر پر خوش ہوتا ہوں جو تمہارے اور میرے وصال کے متعلق ہوتی ہے، بھلے

وہ افواہ ہی کیوں نہ ہو۔''

''جو پوچھا ہے، وہ بتاؤ۔ شاعری مت جھاڑو۔'' وہ جھینپ سی گئی۔

''سرپرائز!''

''کیسا سرپرائز؟''

''تم صبح میرے ساتھ آؤٹنگ پر چل رہی ہو۔ از اِٹ اوکے؟'' شہاب نے اُس کی خوبصورت آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

وہ حیرت سے بولی ''کہاں؟''

''جہاں میں جاؤں گا۔''

''تم کہاں جانے کا ارادہ رکھتے ہو؟''

''جہاں مجھے میرا دِل لے جائے گا۔''

وہ زِچ ہو گئی۔ منہ پھلا کر بیٹھ گئی۔ شہاب وارفتگی بھری نگاہوں سے اُسے دیکھتے ہوئے بولا ''مصباح! کیا میرے ساتھ چلو گی؟''

''نہیں...... بالکل بھی نہیں۔''

''کیا مجھ پر اعتماد نہیں کرتی ہو؟''

''اپنے دِل سے پوچھو۔ سچ مل جائے گا۔''

''میرا دِل تو کہتا ہے کہ تم میرے جھوٹ پر بھی آنکھیں بند کر کے بھروسہ کرتی ہو۔'' وہ پورے مان سے بولا۔

''نہیں...... بالکل بھی نہیں۔'' وہ خفگی سے بولی ''میں تمہاری طرح بے وقوف نہیں ہوں۔ تم جب تک مجھے بتاؤ گے نہیں کہ مجھے کہاں لے جانے کا ارادہ رکھتے ہو، میں تمہارے ساتھ ہرگز نہیں جاؤں گی۔''

''بتا دوں تو سارا مزہ ہی کرکرا ہو جائے گا۔''

''ٹھیک ہے، تم اپنا مزہ بچاؤ، میں اپنا آپ بچاتی ہوں۔''

''کیا مطلب؟'' پہلی مرتبہ شہاب کے لہجے سے ناگواری چھلکی تھی ''کیا میری شخصیت اَبھی تک ناقابلِ اعتبار ہے؟''

''چھپانے والا بھروسے کے قابل نہیں ہوتا۔''

اُس کے چہرے پر خفگی کے تاثرات نمایاں تھے۔خود پر قابو پاتے ہوئے روٹھے ہوئے لہجے میں بولا ''ٹھیک ہے مس مصباح! شاید یک طرفہ محبت میں ایسا ہی ہوتا ہے۔تمہیں بتا دیتا ہوں۔سرپرائز کے چکر میں پڑ کر تمہیں بدگمان نہیں کرتا، سننے کے بعد جی میں آئے تو مجھ پر اعتماد کر لینا اور جی نہ مانے تو میں ضد نہیں کروں گا۔''

وہ بدستور منہ پھلائے بیٹھی رہی۔

''دریائے سندھ کے کنارے پر واقع ایک گاؤں میں ہماری حویلی اور زمین باپ دادا سے چلی آ رہی ہے۔میں اُسی حویلی میں پیدا ہوا تھا۔میری ماما ہر سال اُسی حویلی میں،اُسی کمرے میں میری برتھ ڈے بڑے دھوم دھام سے مناتی ہے۔بابا نے کبھی بھی شرکت نہیں کی مگر ماما کو اُن کی عدم دلچسپی کی کبھی پرواہ بھی نہیں رہی۔کل میرے روکنے کے باوجود اُنہیں نے وہیں پر میری سالگرہ منانے کا اہتمام کر رکھا ہے۔'' وہ بجھے بجھے لہجے میں اُسے بتلا رہا تھا۔صاف عیاں تھا کہ وہ بادلِ نخواستہ بول رہا تھا ''میرا کزن فون کر کے مجھے بتلا رہا تھا کہ میری ماما نے بطور خاص تمہیں بھی وہاں مدعو کیا ہے۔وہ اپنی ہونے والی بہو کو دیکھنا چاہتی ہے۔مجھ پر ماما نے بھی خاصا دباؤ ڈال رکھا ہے، میں چاہتا تھا کہ تمہیں کچھ بتائے بغیر آؤٹنگ کا بہانہ کر کے وہاں لے جاؤں۔تمہیں سرپرائز دوں مگر مجھے کیا علم تھا کہ تمہیں میری چند قدموں کی ہمراہی پر بھی یقین نہیں ہے۔''

مصباح کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔اُس نے شہاب کو منہ کھولنے پر مجبور کر لیا تھا۔بہ مشکل ہنسی دباتے ہوئے بولی ''تمہاری آبائی حویلی یہاں سے کتنی دور ہے؟''

''بیس پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔بہ مشکل نصف گھنٹے کا سفر ہے۔'' وہ لاپرواہی سے بولا اور ٹیبل پر جھک گیا۔

''مجھے کتنی دیر تمہارے ساتھ رہنا پڑے گا؟'' مصباح اُس کے مایوسی بھرے چہرے کو دیکھ کر

لطف لے رہی تھی۔

''ایک گھنٹہ آنے جانے میں لگتا ہے۔ وہاں جب تک رہنا چاہو گی، رہ لینا۔ جب بھی کہو گی، واپس پہنچا دوں گا۔'' شہاب کے چہرے پر آس کا رنگ پھیلنے لگا۔

''اگر میں تمہاری مما کو پسند نہ آئی تو......'' وہ تشویش سے بولی۔

''کیا کبھی کسی نے چاند کو بدصورت کہا ہے؟''

''میں چاند نہیں ہوں۔''

''چاند سے زیادہ خوبصورت تو ہو ناں!''

''تم کہتے ہو، تمہاری ماں کو تمہارے کہے پر اعتبار نہ آیا تو کیا ہوگا؟''

''ہونا کیا ہے؟ بس تمہاری چھٹی ہو جائے گی اور وہ نئی لڑکی کی تلاش میں نکل کھڑی ہوں گی۔'' شہاب نے اتنی لا پرواہی سے کہا کہ مصباح کو غصہ آ گیا۔ بھڑک کر بولی ''تو پھر اپنی ماما سے کہہ دو کہ وہ کوئی اور لڑکی دیکھ لیں۔''

''ناں بابا ناں!'' شہاب نے ہنس کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ ہاتھ میں دَبے ہوئے سینڈوچ پر منہ مارتے ہوئے کہا ''تم ہو تو شہاب ہے، شہاب کی دُنیا ہے، سب کچھ ہے وگرنہ کچھ بھی نہیں۔ ماما بہت اچھی ہیں۔ تمہاری ایک نہیں، اَن گنت تصویریں دیکھ چکی ہیں اور تمہیں دل وجان سے قبول کر چکی ہیں۔''

''میری تصویریں؟'' وہ چونکی ''میری تصویریں تمہارے پاس یا تمہاری ماما کے پاس کیسے پہنچیں؟''

شہاب نے اُسے تھوڑی دیر تنگ کیا۔ پھر اپنے موبائل فون کی میموری میں فیڈ امیج دکھاتے ہوئے کہا ''میں نے اِس فون میں تمہاری نہ جانے کتنی ادائیں محفوظ کر رکھی ہیں، جب بھی بے قرار ہوتا ہوں، تمہارے فوٹو دیکھ کر خود کو تسلی دے لیتا ہوں۔ سمجھیں؟''

جھینپ گئی۔ سر جھکا کر سوچنے لگی ''اے موبائل فون کو ایجاد کرنے والے! تمہارا دِل وجان سے شکریہ......تم نے چاہنے والوں پر اتنا بڑا احسان کیا ہے کہ رہتی دُنیا تجھے سلام پیش کرتی رہے گی......''

...۞...

وہ اپنی ماما کے ساتھ بازار گئی تھی۔ واپسی پر چھوٹے چھوٹے اَن گنت کھلونا برتن خرید لائی۔ اَب جلد از جلد اُنہیں استعمال کرنے کی بے چینی اُسے ٹکنے نہیں دیتی تھی۔ ہنس کا پتہ کیا۔ وہ سو رہا تھا۔ جگانا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ وہ ناوقت جگائے جانے پر خاصا برہم ہوجاتا تھا اور سارا موڈ ہی غارت کر دیتا تھا۔

جب وہ جاگا اور عادتاً کوارٹر کی سیڑھیوں کی طرف نکلا تو غیر متوقع طور پر اپنا ٹوائے بیگ کندھے سے لٹکائے قسمت کو سیڑھیوں پر بیٹھے دیکھ کر حیران ہوگیا۔ پوچھنے پر اُس نے بتایا ''پوڈو نے اپنے دوستوں کی دعوت کی ہے۔ ہمیں مہمانوں کے آنے سے پہلے کھانا تیار کرنا ہوگا۔ تم آج زیادہ دیر تک سوئے رہے ہو ہنس!''

وہ آنکھیں ملتا ہوا اُس کے ساتھ پلاٹ میں آ گیا اور ٹوائے بیگ سے کھلونے نکال کر سیٹ کرنے میں اُس کا ہاتھ بٹانے لگا۔ قسمت نے ننھا سا چولھا رکھا، گھاس پھوس کو آگ لگائی اور چولھے پر کیتلی چڑھا دی۔ ہنس کو چمچ تھما کر ہلاتے رہنے کا حکم دیتے ہوئے پوڈو سے باتیں کرنے لگی ''اے پوڈو! آج کیا کھاؤ گے؟''

''اچھا! چکن روسٹ...... مگر وہ تو مجھے بنانا ہی نہیں آتا۔''

''ہیں؟ پیزا...... آسان سے کھانے کا نام لو پوڈو! ورنہ ایک ہاتھ دوں گی، عقل ٹھکانے آ جائے گی۔''

''ہوں۔ اَب سمجھی۔ تمہارے مہمان آ رہے ہیں۔ بھلا بتاؤ تو کون لوگ ہیں؟''

پوڈو سے باتیں کرتے ہوئے چونک پڑی۔ ہنس کو کہنی مار کر متوجہ کرتے ہوئے بولی ''پوڈو دُکھی ہو رہا ہے۔ کہہ رہا ہے کہ مہمان للّی کو لینے کیلئے......''

بات کرتے کرتے رُک گئی۔ سایہ دیکھ کر پلٹی۔ ہنس کے اَبو کو دیکھ کر کھڑی ہوگئی۔ ہاتھ تھام کر بولی ''انکل! آپ ناراض ہیں ہم سے؟''

’’نہیں بیٹا! اتنے پیارے پیارے بچوں سے کون ناراض ہوسکتا ہے۔‘‘

’’تو پھر چپ چپ کیوں ہیں؟‘‘

شاید نہ چاہتے ہوئے کہیں جانے کیلئے پوری طرح تیار ہوکر گھر سے نکلنے والے ڈاکٹر کے لبوں سے نکلا’’مہمان للّی کو لینے کیلئے جو آرہے ہیں،تبھی دُکھی ہورہا ہوں۔‘‘

ہنس نے خالی کیتلی میں چمچ ہلاتے ہوئے کہا’’مگر پاپا دُکھی تو للّی کو ہونا چاہیے،آپ کیوں فکر کرنے لگے ہیں؟‘‘

’’کیا پوڈو دُکھی ہورہا ہے؟‘‘ڈاکٹر نے اپنے گلے میں جھولنے والے مفلر کو درست کرتے ہوئے دریافت کیا۔

’’جی انکل! بے چارہ کچھ کھا پی نہیں رہا کافی دیر سے۔‘‘

’’مگر کیوں قسمت بیٹا؟‘‘

’’کیا میں چلی جاؤں تو ہنس کو دُکھ نہیں ہوگا انکل؟‘‘

’’یہ تو ہنس ہی بتلاسکتا ہے۔کیوں ہنس؟‘‘

وہ خلافِ توقع کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔قسمت کا موڈ ایک دم خراب ہوگیا۔گھور کر بولی’’ایسے بے وقوفوں کی طرح کیوں ہنس رہے ہو؟‘‘

’’میں تمہیں جانے ہی کیوں دوں گا؟‘‘اُس نے شرارت سے سر ہلاتے ہوئے کہا’’پوڈو بے وقوف ہے۔للّی کے جانے پر دُکھ لگتا ہے تو جانے ہی نہ دے،کوئی زبردستی تھوڑی ہے۔‘‘

ہنس کا باپ عجیب سی نظروں سے دونوں کو دیکھتا ہوُا اخار دار تار کا خلا جھک کر عبور کر گیا۔اُسے کہیں جانا تھا۔ہسپتال کی باؤنڈری وال کے ساتھ ساتھ چلتا ہوُا بیرونی گیٹ کی طرف جارہا تھا جب شناں نے عقب سے آواز دی’’کہاں جارہے ہیں آپ؟‘‘

’’میں للّی کو لینے کیلئے جارہا ہوں۔‘‘

قسمت کی آواز کانوں میں پڑی’’مگر انکل! للّی تو یہاں ہے۔‘‘

شناں ہونقوں کی طرح کبھی پلاٹ میں بیٹھی جوڑی کو دیکھ رہی تھی کبھی مخصوص لاپرواہانہ انداز میں

بیرونی گیٹ کی طرف جاتے ہوئے شوہر کی پشت کو گھور رہی تھی۔

...⊛...

بجلی کا نہ ہونا بجلی بن کر پروفیسر کے اعصاب پر مسلسل گر رہا تھا۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اُسے جنت میں محصور کر دیا گیا ہے۔ تاحدِ نگاہ ٹھاٹھیں مارتے ہوئے پانی نے ہر راہ مسدود کر دی تھی۔ سموں نے اچھی طرح گھوم پھر کر جنت کو دیکھا۔ حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بجلی کے حادثاتی تعطل پر تشویش ظاہر کی۔

چونکہ پروفیسر کو گزشتہ کئی دِنوں سے دریائی پانی پینا پڑ رہا تھا اِس لئے طبیعت بھی مکدر رہنے لگی تھی۔ پہلے دن حفظِ ماتقدم کے طور پر وہ فلٹر پیپرز کے ذریعے پانی فلٹر کر کے پیتا رہا مگر کب تک؟ آخر فلٹر پیپرز بھی ختم ہو گئے۔ اُس کا معدہ گڑبڑ کرنے لگا تھا۔

جس وقت سموں بیڈ شیٹ اپنے بدن پر اچھی طرح اوڑھائے سیڑھیوں پر بیٹھ کر اپنے میل زدہ کپڑے دھو رہی تھی، اُس وقت پروفیسر باتھ روم میں پہلوؤں پر ہاتھ رکھے قے کر رہا تھا۔

اُس کے قائم کردہ میڈیکل ڈیپارٹمنٹ میں فلے جل کی گولیاں موجود تھیں جنہیں تواتر سے استعمال کر رہا تھا۔ ہاضمے کی پھکی کا بھرا ہوُا امرتبان بھی اُس نے رکھ چھوڑا تھا۔ ہر کھانے کے بعد ایک پھانکا لگا لیتا تھا مگر آفاقہ نہیں ہو رہا تھا۔ بار بار فون پر افتخار بیگ سے رابطہ کر کے اُسے بجلی بحال کرنے کی استدعا کر رہا تھا۔ وہ بھی مجبور تھا۔ ایسے میں اُسے ایک خیال سوجھا۔ اُس نے افتخار بیگ سے کہا کہ وہ ڈاکٹر اَشولال سے رابطہ کرے اور یہاں پہنچنے کی سبیل کرے۔ افتخار نے ایک مرتبہ پھر جل جانے والی وائرنگ کی تفصیل معلوم کی، ممکنہ سامان کی فہرست بنائی اور جلد پہنچنے کا وعدہ کیا۔ پروفیسر کو عین موقع پر یاد آ گیا کہ اُس کے کھانے پینے کا بیشتر سامان فریج بند رہنے کی وجہ سے خراب ہو چکا تھا۔ اُس نے جلدی جلدی خوراک کی فہرست بھی افتخار کو نوٹ کروا دی۔

پروفیسر باہر کی دُنیا کے ساتھ صرف موبائل فون کے ذریعے جُڑا ہوُا تھا۔ فون کی سکرین پر دکھائی دینے والی بیٹری چارجنگ کو ظاہر کرتی لکیریں بھی ایک ایک کر کے معدوم ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ یہ وہ

بیٹری تھی جو اُس نے ہنگامی حالت کیلئے ایکسٹرا خرید کر رکھی ہوئی تھی۔

پانی کی سطح یک لخت بلند ہوئی تھی مگر غیر معمولی سست روی سے گر رہی تھی۔ سموں کو یہاں آئے دو دِن گزر چکے تھے۔ چونکہ اس کے بچوں کے فون نمبر اُس موبائل فون میں فیڈ تھے جو سیلاب کی نذر ہو چکا تھا، اِس لئے وہ اپنے بچوں سے رابطہ نہیں کر سکتی تھی۔ بار بار اِس پریشانی کا اظہار کر رہی تھی کہ اُس کے بچے اُسے مردہ سمجھ کر رو پیٹ رہے ہوں گے، پریشان ہو رہے ہوں گے یا یہ بھی ممکن تھا کہ وہ تلاش میں جانے کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھا رہے ہوں۔ پروفیسر نے اُسے دلاسا دیا تھا کہ اُس کا مُرشد یہاں آنے والا ہے، واپس جائے گا تو اُسے لے کر شہر چلا جائے گا جہاں سے وہ اپنے بچوں سے ملنے کیلئے چلی جائے گی۔ وہ قدرے مطمئن ہو گئی۔

سموں کے ساتھ اتنا وقت گزارنے پر پروفیسر نے خود پر اپنے نظریات کی حقیقت ثابت کر دی تھی۔ لڑکپن کی بے دھڑک نسبت کے باوصف اُس نے اپنے آپ کو سموں کے قریب نہیں آنے دیا تھا۔ سموں کی حد سے بڑھی ہوئی بے تکلفی نے بھی اُس پر کوئی خاص اثر نہیں ڈالا تھا۔ جوانی بیوگی کی زد میں برسوں سے تشنہ تھی۔ وہ بدن جس پر وہ اپنا اَدھیکار سمجھتی تھی، اُس سے گریزاں رہا تو بھڑک اُٹھی۔ حیلے بہانوں سے جتلانے لگی کہ ایسی تنہائی میں وہ غنیمت بھرا موقع لے کر جنت میں اُتری ہوئی حور ہے، ہاتھ بڑھا کر اپنے حصار میں لیتے ہوئے وہ اُن لمحوں کو قید کر لے جو اُس کی دسترس میں آنے سے پہلے ہی چھین لئے گئے تھے۔ وہ اُسے اُن اَدھورے لمحوں کا طعنہ دے کر اکسانے کی بھرپور کوشش کرتی رہی، منہ کی کھا کر پلٹتی رہی پھر نئی طاقت سے جھپٹتی رہی مگر کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔ ایسے میں بے اختیار بول پڑی ''سیمو! تم ایسے برف کی طرح پہلے تو نہیں تھے؟''

''تو بھی پہلے بھڑکتی ہوئی آگ کی طرح نہیں تھی سموں!'' پروفیسر نے آنکھیں چُرا لیں۔

دھلے ہوئے کپڑے ریلنگ پر ڈالتے ہوئے کن اکھیوں سے پروفیسر کی جانب دیکھ رہی تھی۔ سوچ رہی تھی ''وہ بھی کیا دِن تھے جب گھر کے چھوٹے سے آنگن میں بندھے ہوئے تار پر کپڑے ڈالنے لگی تھی کہ سیمو نے دَبے پاؤں عقب میں آ کر اُسے بانہوں میں بھر لیا تھا۔ گیلے کپڑوں سمیت اُٹھا کر کمرے میں لے آیا تھا اور......''

پروفیسر اُسے دیکھ رہا تھا۔ بول پڑا ''ہوا چل رہی ہے، ریلنگ سے کپڑے اُڑ کر دریا میں جا گرے تو مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔ اِنہیں گانٹھ دے دو۔''

وہ گانٹھ دینے کو جھکی۔ ایسے میں دل میں انگڑائیوں کے بل پر لہرانے والے جذبات نے اندھا دھند یلغار کر دی۔ بدن کو رُک رُک کر توڑنے والا، پلٹ پلٹ کر جوڑنے والا راکھ بن کر پانی میں بہہ چکا تھا۔ ہر آن بولنے والا بدن برسوں سے خاموشی کا عذاب جھیل رہا تھا۔ ہم کلام دکھائی دیا تو عضو عضو بول اُٹھنے پر بضد دکھائی دینے لگا تھا۔ دل اپنی آنکھیں موند کر اُس کی آنکھوں میں کرچیاں بھرنے لگا تھا۔

سموں نے گانٹھ دیتے ہوئے پورے بدن کو لپیٹنے والی چادر کی گانٹھ کو غیر محسوس انداز میں کھول دیا۔ بیڈ شیٹ کندھوں سے سرک کر گرنے لگی تو وہ ایک جھٹکے کے ساتھ سیدھی ہوئی، چادر کو سنبھالنے کی کوشش میں عریاں ہونے لگی۔ چادر پیروں میں گر گئی۔ وہ اوندھے منہ چادر پر گر گئی۔ دھڑام کی آواز نے پروفیسر کو بھاگ کر قریب آنے پر مجبور کر دیا۔ وہ قریب آیا۔ سفید چمکدار بدن کے نیچے پڑی چادر کا کونہ کھینچا۔ نکال کا اوڑھانا چاہتا تھا کہ آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ سیدھے رخ ہو گئی تھی اور دعوت بھری نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگی۔ پروفیسر جہاں کا تہاں رہ گیا۔

پیچھے ہٹنا چاہا تو ہٹ نہ پایا۔ نظر چُرانا چاہی تو ناکام رہا۔ دماغ آگ پکڑ رہا تھا۔ سمجھا رہا تھا ''یہی وہ امتحان ہے جسے پاس کرنے کے ساتھ ساتھ تم دُنیا پر یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گے کہ تمہیں عورت سمیت دُنیا کی کوئی ضرورت نہیں، فیل ہو جاؤ گے تو کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہو گے۔''

دل پیچھے رہنے والا نہیں تھا، کچوکے پر کچوکا دینے لگا۔ ترغیب دینے لگا ''آگے بڑھو! قلعے کی دیواریں شق ہو گئی ہیں، دروازے کھل گئے ہیں اور پوری سلطنت تمہاری فتحیابی کیلئے سراپا دُعا بنی ہوئی ہے۔ کوئی دیکھنے والا نہیں، کوئی طعنہ دینے والا نہیں...... ایسے میں پیچھے ہٹو گے تو پوری دُنیا کے مردوں کیلئے کھلی گالی بن جاؤ گے۔''

سموں کی نگاہوں نے پروفیسر کی بے بسی تاڑ لی تھی۔ اگلے مرحلے کو سرانجام دینا از حد ضروری تھا۔ فوراً شرما کر چھوئی موئی ہو گئی۔ چادر کو کھینچ کر چھپتی گئی۔ چند ہی لمحوں میں نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

اُس نے اپنا منہ سر بھی چادر میں لپیٹ لیا تھا اور انتظار کر رہی تھی کہ اُس کے بدن کی حرارت پر آنکھیں تاپتا ہوا سیمو چادر کا ایک ایک بل کھولے اور آن کی آن میں اُسے تلاش کر لے۔ اُس نے منزل سُجھا دی تھی، راستہ چاہنے والے اپنے ہاتھوں سے بنا لیتے ہیں۔

مگر اُس کی توقع کے برعکس چاہنے والا اُس کے تعاقب میں نہیں آیا تھا۔ خاموشی میں قدموں کی چاپ اُبھری، جنت نے چند ہلکورے لئے پھر طویل خاموشی چھا گئی۔ انتظار کی کوفت اُٹھانے کے بعد اُس نے نہائت آہستگی سے چہرے پر سے کپڑا سرکایا، دیکھا، چاہنے والا کہیں دکھائی نہیں دیا تو اُٹھ بیٹھی۔ وہ اُس سے چند قدم دور اُس کی جانب پیٹھ کئے کرسی میں بیٹھا تھا۔ اُس کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ زیر وزبر ہوتی دل کی دُنیا کا پتہ نہیں چلتا تھا۔ وہ زیر لب بڑبڑائی ''ہونہہ! بزدل کہیں کا!''

چادر کو اپنے تن پر اچھی طرح اوڑھا یا، ریلنگ پر لٹکتے ہوئے کپڑوں کو گرہیں دیں اور پروفیسر کے پاس آ گئی۔ خفت بھرے لہجے میں بولی ''وہ دراصل اچانک گانٹھ کھل گئی تھی۔''

پروفیسر پر اُس کی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ آنکھیں موندے بدستور ساکت بیٹھا رہا۔ وہ اُس پر استہزائیہ نظر ڈال کر مقابل کی کرسی میں بیٹھ گئی۔ کچھ دیر کے بعد پروفیسر نے خود پر قابو پا لیا اور آنکھیں کھول دیں۔ سموں کی عریاں پنڈلیاں دکھائی دیں، پنڈلیوں کے نیچے مچھلی کی طرح چمکدار پاؤں نظر آئے تو اُس نے گھبرا کر پھر آنکھیں بند کر لیں۔

سموں بغور اُس کی حرکات کا جائزہ لے رہی تھی۔ تھکے تھکے لہجے میں بولی ''سیمو! آنکھیں کھولو، میں کوئی اور نہیں، تمہاری سموں ہوں۔''

''تم سموں ہو، میری سموں نہیں ہو۔'' پروفیسر کے لہجے میں واضح ارتعاش موجود تھا۔

''مجھ پر اپنی نیم پلیٹ لگانے والا دُنیا میں نہیں رہا۔''

''نیم پلیٹ تو موجود ہے ناں!''

''تم جسے نیم پلیٹ قرار دے رہے ہو، تمہارا مذہب اُسے کتبہ قرار دیتا ہے۔''

پروفیسر نے آنکھیں کھول دیں۔ عجیب نظروں سے جی بھر کر سموں کے سرخ گلنار چہرے کو دیکھا پھر اُٹھ کر راہ داری کی طرف چل دیا۔ بیڈروم کا چکر کاٹ کر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ پندرہ برسوں

پر محیط بھر پور ازدواجی زندگی گزارنے والی سموں کو بہ خوبی اندازہ تھا کہ وہ عقبی سیڑھیوں پر بیٹھ کر اپنے بدن کو ٹھنڈے پانی میں ڈبو رہا ہوگا۔

بعض گرہیں ایسی ہوتی ہیں جو بندھ کر انسان کو کھول دیتی ہیں۔ کئی ایسی بھی ہوتی ہیں جو کھل کر انسان کو چاروں طرف سے باندھ دیتی ہیں۔ بیڈ شیٹ کی گرہ بھی اُن میں سے ایک تھی جس نے کھل کر دونوں کے لب سی کر رکھ دیے تھے۔ باتوں کے نہ ختم ہونے والے سلسلوں کو آنِ واحد میں ختم کر دیا تھا۔ ڈاکٹر اَشولال کے پہنچنے تک دونوں ایک دوسرے سے نظریں چُراتے رہے، کن اکھیوں سے دیکھتے رہے اور بیگانوں کی طرح باتیں کرتے رہے۔

سہ پہر کے قریب پانی کے رُخ پر متوازی چلتی ہوئی دو کشتیاں دکھائی دیں۔ پروفیسر بھاگ کر عرشے پر آیا۔ ہاتھ کا چھجا بنا کر آنکھوں پر رکھا اور غور سے دیکھنے لگا۔ ایک کشتی پر سفید رنگ کا بڑا سا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ لہراتے ہوئے کپڑے پر نیلے رنگ کا بڑا سا مونوگرام بھی دکھائی دے رہا تھا۔ کسی این جی او نے کشتی کرایہ پر حاصل کی تھی۔ سیلاب کی تباہ کاریوں میں پہلی مرتبہ پروفیسر نے کسی این جی او کو امدادی کارروائیوں کے سلسلے میں سرگرم عمل دیکھا تھا۔ چند ہی منٹوں میں دونوں کشتیاں جنت کے قریب آ گئیں۔ سفید جھنڈے والی کشتی کا ملاح زور سے چیخا ''کیا تمہارے پاس لانہہ ہے؟''

اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ بھاگ کر سٹور میں گیا۔ بڑا سا رسہ اُٹھایا اور ریلنگ کے قریب کھڑے ہو کر اُس کا ایک سرا ملاح کی طرف اُچھال دیا۔ ملاح نے جلدی سے اُسے کشتی کے کڑے میں ڈال کر باندھ دیا۔ پروفیسر نے دوسرا سرا ستون کی ہک کے ساتھ باندھ دیا۔ دوسری کشتی کو بھی اِسی طرح جنت سے باندھ دیا گیا۔ پروفیسر نے دیکھا کہ جھنڈے والی کشتی میں تین مرد اور دو عورتیں موجود تھیں جن کے سینوں پر نیلے مونوگرام والے شناختی بیج آویزاں تھے۔ کشتی میں چھوٹے چھوٹے پیکٹوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ یہ خوراک کا امدادی پیکیج تھا۔

دوسری نسبتاً چھوٹی کشتی میں ملاح کے ساتھ چار آدمی سوار تھے۔ ڈاکٹر اَشولال کو وہ ہزاروں میں پہچان سکتا تھا۔ افتخار بیگ اور مظہر عباس بھی اجنبی نہیں تھے لیکن چوتھے کو وہ نہیں پہچان پایا۔ شاید اُسے پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا۔ پروفیسر کا سہارا لے کر ملاحوں کے علاوہ سبھی جنت میں سوار ہو گئے۔ سب سے

آخر میں پروفیسر نے ڈاکٹر اَشو سے معانقہ کیا۔ کافی دیر تک اُس کے سینے سے لگا خاموش کھڑا رہا۔ سبھی نے بہ طور خاص پروفیسر کی غیر معمولی عقیدت کو نوٹ کیا۔ پھر اُسے بڑے ہی احترام سے لے کر عرشے پر آ گیا۔ کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا ''مُرشد! تشریف رکھو۔ میں افتخار کے ساتھ جا کر سامان اُٹھا لاؤں۔''

سموں اِس دوران بیڈروم میں ہی رہی۔ وہ پروفیسر کی اجازت کے بغیر باہر نہیں آنا چاہتی تھی۔

افتخار اور پروفیسر نے ملاحوں کی مدد سے بجلی کا سامان اور جملہ برقی آلات اُتارے اور جنت پر لے آئے۔ اُسے پروفیسر کا یوں این جی او والوں کو ساتھ لے کر آنا کچھ ناگوار گزرا تھا مگر وہ شکوہ کرنے کی حالت میں نہیں تھا۔ کرسیاں کم تھیں، اِس لئے وہ سٹور سے دو فولڈنگ چار پائیاں اُٹھا لایا۔ سبھی بیٹھ چکے تو افتخار نے ہنس کر کہا ''سر! آج آپ کی جنت کی رونق دو چند ہوگئی ہے۔''

پروفیسر نے ڈاکٹر اَشو لال کی طرف دیکھا اور مسکرا کر کہا ''آج مجھے یقین ہو گیا کہ میں نے بہتے ہوئے پانی میں مکان نہیں، جنت بنائی ہے۔''

پروفیسر بیڈ روم میں آیا۔ سموں کو ساتھ لے کر ڈاکٹر اشو لال کے پاس آیا، اسٹیل پائپ کے پائیوں والے اسٹول پر بیٹھا کر ڈاکٹر سے مخاطب ہوا ''مرشد! یہ میرا مہمان ہے، اِس سے پوچھ تاچھ کر کے اپنے شبہات رفع کر لو۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہارے دل میں کوئی بدگمانی جا گزیں رہے۔ میں اِس اثناء میں اپنے پیارے مہمانوں کیلئے چائے بنا کر لاتا ہوں۔''

ڈاکٹر نے مسکرا کر این جی او کی ایک اہلکار سے کہا ''فائزہ بیٹا! انکل کے ساتھ کچن میں جاؤ اور اُن کا ہاتھ بٹاؤ۔ جب تک کھانے میں کسی عورت کے ہاتھ کی لذت شامل نہ ہو، وہ اچھی نہیں لگتا۔''

لانبے قد والی سانولی سی لڑکی، جسے ڈاکٹر نے فائزہ کہہ کر مخاطب کیا تھا، اُٹھی اور سفید دوپٹہ درست کرتی ہوئی پروفیسر کے پیچھے چل پڑی۔ کچن میں پہنچی تو تعجب بھری نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ کر بولی ''واو...... میں زندگی میں اتنی حیران پہلے کبھی نہیں ہوئی جتنی اِس کشتی کو دیکھ کر ہو رہی ہوں۔''

''اوں ہوں......'' پروفیسر نے پُرزور مزاحمت کی ''یہ کشتی نہیں، جنت ہے۔''

''ایک ہی بات ہے انکل!'' وہ ہونٹ سکیڑ کر بولی ''آپ نے واقعی کمال کر دکھایا ہے۔''

دونوں نے مل کر چائے بنائی۔ٹرے میں رکھی۔ چند پلیٹوں میں لوازمات سجائے اور آگے پیچھے چلتے ہوئے عرشے پر سجی محفل میں آ گئے۔ پروفیسر نے دیکھا کہ انتہائی مختصر وقت میں ڈاکٹر اشو اور سموں آپس میں بے حد گھل مل گئے تھے۔ڈاکٹر نے چہک کر کہا'' دیکھا پروفیسر! میں نے کہا تھا ناں کہ خیر نہیں ہے۔سموں جان بچانے کیلئے جنت میں نہیں پہنچی بلکہ اپنے سیمو کو ڈھونڈتی ہوئی اِدھر آ نکلی ہے مگر بے چاری کو یہ علم نہیں تھا کہ اُس کا سیمو پڑھ لکھ کر دُنیا سے عشق کا سبق بھول گیا تھا، بغاوت کے نصاب میں بھٹکنے لگا تھا۔ پتہ ہوتا تو کسی کیکر کے کانٹوں میں الجھ کر جان دے دیتی، یہاں نہ آتی۔''

سبھی نے کھل کر قہقہہ زنی کی۔ دریا کا مخصوص شور دَب گیا۔ پروفیسر کو یوں لگا جیسے اُس کے تمام تر نظریات اپنی وقعت کھو چکے ہیں۔ جنت، پہلے بھی ایسی ہی تھی، اَب بھی ویسی ہی ہے مگر من چاہے مہمانوں کے آنے پر اِس کی رونق میں اضافہ ہو گیا ہے۔ دِل پر کافی دِنوں سے پڑنے والا بوجھ شاید ہوا میں تحلیل ہو گیا تھا۔ چائے کے دوران اُس کی استفہامیہ نظروں کا مفہوم بھانپ کر ڈاکٹر اشولال نے اپنے ساتھی کا تعارف کرایا'' پروفیسر! جیسے میں نے اپنی زندگی سندھو سائیں کی بقاء، اِس سے متعلقہ مور، کیہل اور مُہانوں کی فلاح اور سندھ وادی کی قدیم ثقافت و روایات کے فطری ارتقاء میں حائل رکاوٹیں دور کرنے پر صرف کر ڈالی ہے اور چاہا ہے کہ اِس کے مہمان پرندوں کو وہی اعتبار ملنا چاہیے، وہی تحفظ ملنا چاہیے جس کی کشش اُنہیں ہزاروں میل دور سے یہاں آنے پر مجبور کر دیتی تھی، ایسے ہی میرا یہ سنگتی...... یہ ناتواں وجود، یہ سادہ لوح مگر اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان......مزار خان، اپنے ریگستان اور اُس کی عہدِ قدیم سے وابستہ روایات اور جڑی بوٹیوں کو بچانے کیلئے ہمہ جہت سرگرداں ہے۔ میں سرکار کی نوکری کرتا ہوں، یہ نوکری چھوڑ کر ریگزار کی نوکری کرنے لگا ہے۔ بہت عظیم انسان ہے۔''

مزار خان نے جھینپ کر کہا'' مرشد! اتنا بھی شرمسار نہ کرو کہ میں یہاں بیٹھ ہی نہ سکوں۔''

''اور ہاں! یہ این جی او جس کے لڑکے لڑکیاں یہاں امدادی سامان بانٹتے پھرتے ہیں، یہ اِسی کی قائم کردہ ہے۔سیلابی علاقے اِس کے دائرہ عمل میں نہیں آتے لیکن یہ کہتا ہے کہ انسان جہاں بھی تکلیف میں ہو، وہاں پہنچنا چاہیے اور مقدور بھر مدد کرنی چاہیے۔ یہ اِس تکلف میں نہیں پڑتا کہ فنڈ

تھوڑے ہیں، سامان کم ہے، شرمساری ہوگی......نہیں بلکہ اللہ کی آس پر چل پڑتا ہے۔''

اَشو، مزار خان اور پروفیسر گفتگو میں محو ہو گئے۔ مظہر عباس اور افتخار بیگ اپنے آلات سنبھال کر کنکریٹ کے ستون پر چڑھ گئے۔ این جی او کے کارکن سموں کے ساتھ جنت کا گھوم پھر کر جائزہ لینے لگے۔ سموں جتنا جانتی تھی، بتلاتی جاتی تھی۔ باتوں کے دوران ہی اَشو لال کو ملاحوں کا خیال آیا۔ اُنہیں ہاتھ کے اشارے سے جنت میں بلا لیا۔ کسی کو بالخصوص مخاطب کئے بغیر بولا ''ہم اِسی رویے کے مخالف ہیں جو ہم کافی دیر سے اِن مُہانوں (ملاحوں) سے روا رکھے بیٹھے ہیں۔ وہ اِس قابل ہیں کہ اُنہیں ہم اپنے پاس بیٹھائیں، باتیں کریں اور جنت کا نظام دکھائیں۔''

مزار خان نے بھرپور تائید کی۔ پروفیسر کو نازک اور نفیس وجود والا مزار خان بہت اچھا لگا۔ بات کرتے ہوئے، چپ رہتے ہوئے، ہر کیفیت میں وہ پُرکشش انسان تھا۔ اُنہوں نے سیر حاصل باتیں کیں۔

موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے مزار خان کے ایک ساتھی نے ڈاکٹر اَشو سے پوچھ ہی لیا ''سر جی! آپ دریائے سندھ پر اتنا کیوں لکھتے ہیں؟ کیا آپ کو دُنیا میں اور کوئی اِشو نہیں ملتا؟''

اَشو کے چہرے پر عجیب سے تاثرات اُبھر آئے۔ چند لمحے خاموش بیٹھا کچھ سوچتا رہا، پھر اپنے مخصوص دل آویز انداز میں گویا ہوا ''دُنیا مسائل سے بھری پڑی ہے۔ میں جانتا ہوں مگر جب میں دیکھتا ہوں کہ کوئی فرد، کوئی یونین یا کوئی این جی او سندھ ساگر سے رکھے جانے والے ناروا رویے پر آواز نہیں اُٹھاتی تو مجھے بے اختیار بولنا پڑتا ہے۔ جب اپنے خمیر پر توجہ مبذول ہوتی ہے تو گھبرا جاتا ہوں۔ صدیوں پہلے موجود سندھ ساگر کے رہنے والے اتنے بے دست و پا اور محروم نہیں تھے جتنے آج دکھائی دیتے ہیں۔ کوئی یہ نہیں سوچتا کہ دریا سوکھ گئے تو کیا ہوگا؟ پانی نہ رہا، پانی کی جوانی نہ رہی تو آلودگی کتنی بڑھ جائے گی۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ سردیوں میں گیس ہیٹر کے پیدا کردہ حبس کو پانی کا ایک جگ اپنے اندر جذب کر لیتا ہے اور کمرہ نشینوں کیلئے آکسیجن فراہم کر دیتا ہے۔ ایسے ہی سندھ کا پیلا پانی اَن گنت الائشوں کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔''

سبھی بڑے انہماک سے نفیس وجود کے مالک ڈاکٹر اَشو لال کی باتیں سن رہے تھے۔ وہ جتنا

جاذبِ نظر تھا، اُتنا ہی خوش گلو بھی تھا۔ سانس لے کر بولا ''من پسند ٹھیکیداروں کو نوازنے کیلئے مچھلیاں پکڑنے کے لامحدود پرمٹ جاری کر دیے جاتے ہیں۔ نتیجہ کیا نکلا؟ دُنیا کی مشہور ٹراوٗٹ مچھلی جو سندھ کی پروردہ تھی، مفقود ہو گئی ہے۔ باقی مچھلیاں بھی ایک دِن ختم ہو جائیں گی اور سانپ بچھو ہی بچ جائیں گے۔ ساگر کی نیلی مَرتی لکیر سے چمٹے پچکے پیٹوں والے مُہانے کیوں اپنی جاتی بدل لیتے ہیں؟ کیا اِن کا اپنا کوئی تشخص نہیں ہے؟...... یقیناً ہے مگر اُس تشخص پر پڑنے والی ہر نگاہ نفرت آلود ہوتی ہے جو انہیں احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیتی ہے۔ کیا اِس جدید عہد میں جب تانگے والوں کو آٹو رکشا قسطوں پر دیے گئے، اِنہیں موٹر لانچیں نہیں دی جا سکتی تھیں؟ پانچ مرلہ سکیموں پر اِن کا کوئی حق نہیں، شناختی کارڈ بنانے والی ٹیمیں یہاں نہیں آتیں، اِنہیں سکول، ہسپتال یا قرض......کوئی بھی سہولت میسر نہیں۔ کوئی اِن سے ووٹ مانگنے کیلئے نہیں آتا کیونکہ اِن کے نام ووٹر لسٹوں پر درج نہیں ہیں۔ اِن کے بچوں کے سنہری بال اور سیاہ صحت کسی این جی او کو نظر نہیں آتی۔ کیوں؟''

ڈاکٹر اَشو کا لہجہ جذبات سے مشتعل ہونے لگا تھا ''صرف اِس لئے کہ اِنہیں اَبھی تک شودر اور نچلی جاتی کے ناکارہ افراد قرار دیا جاتا ہے۔ اِن کی ذہنی صلاحیتوں اور عقلی استعداد پر بھروسہ نہیں کیا جاتا بلکہ عملی طور پر اِن پر باور کرا دیا جاتا ہے کہ ترقی یافتہ معاشرے کو اِن کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ ڈونگھے (گہرے) پانی کا یہ دریا اُن کا سائیں ہے۔ وہ اس کے پونگے (مچھلی کے بچے) ہیں۔ سبز پانی کے ساتھ اُن کا جنم جنم کا رشتہ ہے۔ دریا کے ان خانہ خراب باشندوں کا سرکاری جمع بندی میں خانۂ ملکیت غائب ہے۔ تیتر، مور، سارنگ، ہنس...... سبھی پکھوؤں کی طرح کیہل، کٹانے، مور اور مُہانے بھی مہر، ملک، سردار اور سرکار کے ہاتھوں بے موت مر چکے ہیں۔ کسی حکمران نے اِن کے بارے میں عمل تو کجا، کچھ کہنا بھی گوارا نہیں کیا۔ یہاں برسوں پہلے بڑے خوش نما اور فقید المثال پرندے خاص موسموں آیا کرتے تھے جنہیں دیکھنے کیلئے پوری دُنیا سے ٹورسٹ یہاں اکٹھے ہو جایا کرتے تھے۔ چند شوقین مزاجوں کی دلداری کرتے ہوئے یہاں شکار کا سلسلہ چھیڑ دیا گیا جس نے دس پندرہ برسوں میں سندھ ساگر کا آسمان اُجاڑ دیا۔ اِس کے کناروں کے کٹاؤ کو روکنے کیلئے قدرت نے صدیوں سے خودرو درختوں کا جنگل لگائے رکھا۔ اُسے بے دردی سے کاٹ دیا گیا، اَب پانی بے

مہار ہو کر بستیوں کا رُخ کرتا ہے اور سب کچھ تہس نہس کرتے ہوئے گزر جاتا ہے۔''

ڈاکٹر کا لہجہ بتدریج غم بار ہوتا جا رہا تھا۔ عینک اُتار کر قمیص کے پلو سے شیشے صاف کرتے ہوئے بولا'' مجھے یہی دُکھ ہے۔ سندھ ایک دریا کا نام نہیں، یہ ایک انمٹ تاریخ، دُنیا کی مضبوط ثقافت اور نسلِ انسانی کے ارتقائی سفر کا امین ہے۔ 'پیلھوں' ایک پھل کا نام نہیں، ایک جذباتی انتظار کا نام ہے جس کے ذائقے سے پوری قوم محروم ہوگئی ہے۔ اَب پیلھوں پکتی تو ہیں مگر اُنہیں کوئی چن کر کھاتا ہی نہیں۔ اِس پھل کے ذائقے سے ناآشنا قوم اُس لوک ورثے کو کیا سمجھے گی جس میں بار بار پیلھوں کے پکنے کا تذکرہ کیا گیا ہے؟ میں آسمان کی جانب برق رفتاری سے لپکنے والے انسان کو پرواز سے نہیں روکتا، میں تو محض اتنا چاہتا ہوں کہ انسان کا رابطہ اپنی اصل اور حقیت سے تھوڑا بہت تو جُڑا رہے۔ پناہ دار سے ربط تو قائم رہے۔ میری زندگی کی جدوجہد اِسے اُجاڑنے والوں سے مدافعتی جنگ کا نام ہے۔''

پروفیسر نے کہا'' مرشد! تم عالمی شہرت یافتہ مفکر ہو، کیا تمہیں انگریزی اور اُردو میں اپنے افکار کی تشہیر نہیں کرنی چاہیے؟ سرائیکی زبان کا حلقہ تو محض چند کروڑ انسانوں پر مشتمل ہے۔''

'' مادری زبان، پنجابی، سندھی، سرائیکی یا کوئی بھی ہو، سمجھنے اور سمجھانے کیلئے دُنیا میں سب سے معتبر مانی جاتی ہے۔ کیا میرے نظریات اور افکار پڑھنے اور ترجمہ کرنے والوں نے کوئی مشکل محسوس کی ہے؟ نہیں......لفظوں پر مشتمل وہ زبان جو میری ماں نے مجھے سکھائی، میرے نزدیک دُنیا کی سب سے زیادہ معنی خیز، سُدھ آور اور معتبر ہے۔ آج نہیں، کسی نہ کسی دِن تو میرے لکھے کی اہمیت دُنیا پر آشکار ہوگی، تب اِسے اپنی زبانوں میں ڈھال کر پڑھ لیا جائے گا'' اَشو نے مدلل انداز میں کہا۔

مزار خان نے اپنی این جی او کے اشاعتی ڈیسک کی طرف سے جاری کردہ رنگین بروشر ہوا میں لہراتے ہوئے کہا'' میرا تھل، ریت کا تپتا جہنم، مقتدروں کی بندر بانٹ کا شکار ہو رہا ہے۔ ادھر پانی، اُدھر ریت......موت کا اندوہ ناک سفر جاری ہے۔ کسی نے بھی ریٹائرڈ افسروں کو ریگزار کا رقبہ الاٹ کرتے ہوئے یہ نہیں سوچا کہ چراگاہیں ختم ہوگئیں تو بھیڑ بکریاں بے موت مر جائیں گی۔ 'لئی' اور 'لانے' نہ رہے تو چرواہے کہاں جائیں گے؟ جیسے مُہانوں کو اپنے ساتھ شریکِ سفر کرنے کیلئے کوئی

منصوبہ بندی نہیں کی گئی اسی طرح ریگستانیوں کو بھی موت کے منہ میں دھکیلا جارہا ہے۔''

گفتگو کی بساط سمٹنے کے بجائے پھیلتی جارہی تھی۔ ایسے میں اچانک چاند کی تعارفی کرنوں کے ساتھ ہی ستون پر لگا ہوا بڑا مرکری بلب آن ہوگیا اور ماحول روشنی میں نہا گیا۔ چند ہی منٹوں کے بعد واٹر پمپ گھر گھر کی مخصوص آواز کے ساتھ چلنے لگا۔ ڈاکٹر اَشولال کو بھوک کا احساس ہوا تو اُس نے مزار خان کے کان میں کھسر پھسر کی۔ اُس نے فائزہ کو قریب بلایا، اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ''بیٹا! کیا فائدہ کہ دو بیٹیوں کی موجودگی میں ہم بوڑھوں کو ایک لمبے اور گرم دِن کی مشقت کے بعد بھوک کا عذاب بھی کاٹنا پڑ جائے؟ کشتی میں پکڑی ہوئی مچھلیاں چھیلو بناؤ اور تل کر خود بھی کھاؤ، ہمیں بھی کھلاؤ۔ میں نے سنا ہے کہ پروفیسر صاحب نے یہاں تمام بندوبست کر رکھا ہے۔ تمہیں کچن میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔''

وہ ہنستی ہوئی ملاحوں کی طرف متوجہ ہوئیں جو مزار خان کی بات سنتے ہی مچھلیاں اُٹھالانے کیلئے کرسیاں چھوڑ چکے تھے۔ جونہی ملاحوں کی مدد سے وہ مچھلیوں کا گوشت بنا چکیں، جنت اچانک بقعہ نور بن گئی۔ یوں لگا جیسے جنت کے ایک ایک تختے سے روشنی چھلکنے لگی ہو۔ تمام بلب جیسے روشن ہوئے تھے، ایسے ہی یک لخت بجھ گئے۔ چند منٹوں کے بعد پھر روشن ہوئے تو پھر روشن ہی رہے۔ افتخار بیگ اور مظہر عباس کھانا تیار ہونے تک کنٹرول روم میں ہی مصروف کار رہے۔

پُر لذت کھانے سے فراغت پاتے ہی ڈاکٹر اَشولال نے جانے کی رَٹ پکڑ لی۔ پروفیسر وسیم اَشولال کو اپنے ہاں رات ٹھہرانا چاہتا تھا مگر مزار خان کے ساتھ آنے والی لڑکیوں کی وجہ سے مجبوراً جانے کی اجازت دینا پڑی۔ پروفیسر کی جنت کا تفصیلی دورہ کرنے اور دل کھول کر تعریف کرنے کے بعد کشتیاں آباد ہونے لگیں۔ آخر میں اَشوعر شے پر رہ گیا۔ پروفیسر نے اُس کے دونوں ہاتھ پکڑے، چومے اور آنکھوں سے لگاتے ہوئے بولا ''مرشد! سموں کا بیٹا بوسن روڈ کالج ملتان میں پڑھتا ہے۔ بیٹی ضلعی شہر میں نرسنگ کر رہی ہے۔ تم اِسے اِس کی بیٹی یا بیٹے کے پاس پہنچا دو۔''

وہ بھی پاس ہی کھڑی تھی۔ جھٹ سے بولی ''بہتر ہوگا کہ آپ اُنہیں میرے یہاں ہونے کی اطّلاع کر دیں تاکہ وہ فکرمند نہ ہوں، جب پانی اُترے گا، میں خود اُن کے پاس چلی جاؤں گی۔''

ڈاکٹر نے چونک کر پروفیسر کی طرف دیکھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ سمجھانے کی کوشش کی، وہ نہیں سمجھا تو دھیمے لہجے میں بولا ''محبت قسمت کی طرح ہوتی ہے۔ ایک بار دستک ضرور دیتی ہے، مایوس ہو جائے تو کبھی لوٹ کر نہیں آتی۔''

''نہیں مرشد! مجھے کسی سے محبت نہیں ہے اور نہ ہی میں اِس قبیح کام میں پڑنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ یہ...... یہ جنت اول و آخر میری ہے۔ اس میں کسی وجود کی شراکت میرے لئے ناقابلِ برداشت ہے۔'' پروفیسر نے حتمی لہجے میں کہا۔

ڈاکٹر نے ایک نظر سموں کے مایوس چہرے پر ڈالی۔ سر پر ہاتھ رکھا۔ گہرا سانس حلق میں اُتار کر بولا ''چلو! تمہیں تمہارے پیاروں تک پہنچا دوں۔ وقت کی طرح تمہارا سیمو بدل چکا ہے۔ اِس کا دِل ہر احساس سے عاری ہو چکا ہے اور ایسے دِلوں میں محبت کبھی ڈیرہ نہیں جماتی......

نئیں سُدھ پوندی سوہناں سندھ

سائیں

تھئے ہنس جدا کیویں پانیاں توں''

(اے سندھ ساگر! یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ہنس پانیوں سے کس طرح جدا کر دیے گئے؟)

''سموں! لیٹ اَس مُووا!'' ڈاکٹر اَشولال نے پروفیسر کو گلے لگایا، الوداعی سلام پیش کیا اور کشتی میں اُتر گیا۔

سموں پروفیسر کے سپاٹ چہرے پر نظریں جمائے آس و یاس میں ڈوبی ہوئی تھی۔ بولی ''کیا میں بھی جاؤں؟''

پروفیسر کے چہرے پر ہیجان کے آثار نمودار ہوئے۔ ایسے جانے والوں کو دُنیا جانے نہیں دیتی مگر وہ دُنیا سے قطع تعلق کر چکا تھا۔ دُنیا والوں کے چلن پر بھی چار حرف بھیج چکا تھا۔ پیٹھ موڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا ''ہاں سموں! تمہارا کندن، تمہاری شکنتلا تمہاری راہ دیکھ رہے ہوں گے۔ تمہیں موت کے ٹل جانے پر اُن کے پاس ہونا چاہیے۔ یہاں کیا رکھا ہے؟ کچھ بھی تو نہیں۔ مرشد نے ٹھیک کہا ہے کہ میں سیمو نہیں، پروفیسر وسیم بزدار ہوں، جس کا دُنیا میں کوئی بھی نہیں رہا......

میرا خدا، تمہارا بھگوان تمہاری رکھشا کرے......''

وہ پہلو سے نکل کر مقابل آ گئی۔ چہرے پر مرکری بلب کی روشنی براہِ راست پڑ رہی تھی اور اُس کی آنکھوں سے رِسنے والے آنسو چمک رہے تھے۔ اپنے آنسو پونچھے بغیر پروفیسر کے بے جان بدن سے لپٹ گئی۔ ہچکیوں کے درمیان بولنے لگی ''مم......میں......خود کو تم پر مسلط نہیں کرنا چاہتی تھی، میں خود کو اپنے بچوں کی نظر میں گرانا بھی نہیں چاہتی تھی مگر صرف اُس ادھورے پیار کو مکمل کرنا چاہتی تھی جس کی پاداش میں ہم دونوں کو گھر سے نکال دیا گیا تھا۔ اَب سمجھ میں آ رہا ہے کہ جب سیمو ہی نہیں رہا تو نگوڑی سموں کی تشنگی عمر بھر میں بجھنے والی نہیں رہی...... مجھے جانا ہوگا۔ کبھی لوٹ کر نہ آنے کیلئے جانا ہوگا۔ میرے سیمو! تجھے تیری سورگ مبارک ہو، مجھے پاپی سوچوں کا دوزخ قبول ہے......''

بہ دقّت تمام جدا ہوئی۔ ملاح کا سہارا لے کر کشتی میں اُتری۔ ایک کشتی کی لانہہ کھل گئی تھی۔ دوسری کی گرہ کھلنے لگی۔ پانی سب کچھ بہا کر لے جاتا ہے۔ دونوں کشتیاں آگے پیچھے بہنے لگیں۔ ایک مایوس، نقاہت بھرا ہاتھ کافی دیر تک پچھلی کشتی میں لہراتا رہا، جنت کے اکلوتے رکھوالے کی نظروں کے دھندلے شیشے پر بغیر ربر والے وائپر کی طرح خراشیں ڈالتا رہا، دھندلاتا رہا پھر اندھیرے میں گم ہوگیا۔ پروفیسر وسیم نے سختی سے ریلنگ کے گول پائپ کو تھام رکھا تھا۔ ہتھیلیاں پسینے سے تر ہوگئیں تو گرفت دَم توڑنے لگی۔ وہ وہیں بیٹھ گیا۔ اُسے دھیان بھی نہیں تھا کہ اُس کا پورا بدن پسینے سے تر ہو چکا تھا۔

شاید جنت پر روشن ہونے والے تمام برقی قمقموں نے بہت زیادہ حدت پیدا کر دی تھی۔

...❁...

عین پچھلے کوارٹر میں ہنس کے بابا نے اپنی سکون گاہ بنا رکھی تھی۔ وہ چند ایسے لمحے الگ سے سنبھال کر رکھتا تھا جن میں اُسے شناں اور ہنس کی مداخلت بھی ناگوار گزرتی تھی۔ یہ چھوٹا سا کوارٹر تھا۔ عموماً اِس طرز کے کوارٹر درجہ چہارم کے ملازمین کو الاٹ کئے جاتے ہیں۔

وہ حسبِ سابق تنہا تھا۔ تنہائی بھی ایسی کہ جس میں ایک زمانہ اُس کا ہم رقص ہو کر متواتر تھرکتا رہتا

تھا۔ ہارمونیم کو چھیڑا۔ بے رَبط سروں نے کیف نہیں دیا۔ سیگرٹ پر سیگرٹ پھونکتے ہوئے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر نیم دراز پڑا رہا۔ طبیعت کی ناآمادگی کے اسباب میں بند کمرے کی حبس آلود فضا کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ دائیں ہاتھ پر ایش ٹرے کے نیچے پڑی کتاب اُٹھائی، جلد پر پڑی راکھ جھاڑی اور کھول کر پڑھنے لگا۔ اپنے عنوان ''چھیڑو ہَتھ ناں مُرلی'' کی طرح اِس میں درج ہر سطر عجیب تأثر خیز تھی۔ اپنے لکھے کو بہت دیر تک بیٹھا پڑھتا رہا، سمجھنے کی کوشش کرتا رہا اور اِس کوشش میں مزید الجھتا رہا۔ کاش! کوئی اپنے لکھے پر مطمئن ہوجائے۔

گراسی پلاٹ سے ہنس اور قسمت کی ملی جلی آوازیں اُبھریں۔ اُسے مصروفیت مل گئی۔ اُٹھا اور نیا سیگرٹ نکال کر گیس لائٹر سے سلگاتا ہوُا کوارٹر سے نکل کر سنتھّے کی گھنی باڑ کی اوٹ میں بیٹھ گیا۔ چند شاخوں کو ہاتھ سے ہٹا کر دیکھنے کی جگہ بناتے ہوئے اُس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ثبت تھے۔

ہنس چیخا ''قسمت! یہ کیا کر رہی ہو؟''

''دیکھ نہیں رہے، فینی اور مَدھو سیر کرنے کیلئے کار میں جا رہے ہیں۔'' وہ کار کو آہستہ آہستہ ایک ہاتھ سے دھکیلتے ہوئے بولی ''پاپا مجھے اور ماما کو اِسی طرح سیر کرانے کیلئے جاتے ہیں۔ کیا تمہارے بابا تمہیں لے کر نہیں جاتے؟''

ہنس منہ بنا کر خاموش ہوگیا۔ اُسے اندیشہ تھا کہ اُس کی کار ٹوٹ نہ جائے۔ قسمت کو کار چلانی ہرگز نہیں آتی تھی۔

کبھی ایسا نہیں ہوُا تھا۔ آج ہوگیا۔ مانو نے غراتے ہوئے جھپٹا مارا اور دونوں کو اُٹھا کر پلاٹ کے شمال مشرقی کونے کی طرف بھاگ گئی۔ دونوں چیخ و پکار کرتے اُس کے پیچھے لپکے۔ وہ ہاتھ نہیں آئی بلکہ شرارت سے پلٹ کر دیکھتے ہوئے آگے دوڑتی رہی۔ ایسے میں گڑھے میں ٹانگیں لٹکا کر دُم ہلاتا ڈوگی ایک جھٹکے سے اُٹھا اور برق رفتاری سے مانو پر جھپٹا۔ چند ہی لمحوں میں وہ مانو کو وہاں سے بھگانے میں کامیاب ہوگیا۔ فینی اور مَدھو نم زمین پر اوندھے منہ گرے پڑے تھے۔ ہنس اور قسمت بھاگ کر قریب آئے۔ ہنس نے اُنہیں اُٹھانے کیلئے ہاتھ اُٹھایا مگر صرف مَدھو اُس کے ہاتھ لگا جبکہ فینی کو ڈوگی

نے اپنے چھوٹے سے جبڑے میں دبوچا اور اٹھلاتا ہؤا پرے بھاگ گیا۔

قسمت اُس کے پیچھے لپکی۔شرارتی ڈوگی جھکائی دے کر ڈیم کی طرف نکل گیا۔اپنے پنجوں اور جبڑے کی مدد سے اُس نے فینی کو بُری طرح بھنبھوڑ کر رکھ دیا۔قسمت نے فینی کا حال دیکھا تو پلاٹ کے وسط میں بیٹھ کر اونچی آواز میں رونے لگ گئی۔ساتھ ساتھ ڈوگی کو گالیاں بھی دیتی جاتی تھی۔ڈوگی شاید گھبرا گیا تھا۔فینی کو پھینک کر چھلانگیں لگاتا ہؤا پلاٹ سے نکل گیا۔فینی ڈیم سے نکلتے ہوئے پانی میں گری اور کشتی کی طرف سست رَوی سے بہنے لگی۔

ہنس نے قسمت کو آواز دی۔بتایا کہ فینی کشتی کی طرف بڑھ رہی ہے۔وہ رونا بھول کر جلدی سے کشتی کے قریب آ گئی۔تاسف اور دُکھ سے بولی''ہنس!فینی بے چاری ڈوب تو نہیں جائے گی؟''

ہنس نے کندھے اُچکائے، پوڈو کی طرف دیکھا اور سر جھکا کر گھاس کے تنکے کھینچنے لگا۔اُس کا رَدِعمل نہائت غیر فطری تھا۔

ڈاکٹر کا سانس سینے میں ہی کہیں اَٹکنے لگا تھا۔گھبرا کر اپنے کمرے میں آ گیا۔پنکھے کی رفتار تیز کر کے چاروں شانے چت ہو کر لیٹ گیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔غیر ارادی طور پر اپنا فون اُٹھایا، پروفیسر وسیم بزدار کا نمبر ملایا۔رابطہ ہونے سے پہلے کال منقطع کر دی۔سوچ میں پڑ گیا کہ پروفیسر کو فون پر کیا بتائے گا؟ کیا نہیں بتائے گا؟

للّی کے بعد فینی......وہ پروفیسر کی بچپن کی محبت تھی۔اُس کو پالنے والے کی بیٹی تھی۔اپنے سیمو کی بے ارادہ تلاش میں قسمت کی ہتھیلی پر سفر کرتی اُس تک پہنچی تھی۔بے نیل و مرام پلٹنے پر مجبور ہو گئی۔یہ فینی کون ہے؟

وہ بُری طرح ہانپنے لگا۔شناں کو آوازیں دینے لگا۔وہ بھاگ کر آئی اور گھبرا کر پوچھنے لگی''کیا ہوا؟ خیریت تو ہے ناں؟''

ڈاکٹر نے اپنا سر تھام لیا۔بڑبڑانے کے سے انداز میں بولا''شناں!فینی کو بچا لو.......فینی کو ڈوگی بھنبھوڑ رہا ہے......جاؤ اور اُسے بچاؤ۔''

شناں بیڈ پر بیٹھ گئی۔سیاہ و سفید ملے جلے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے شانت کرنے لگی۔

سمجھتی تھی کہ پھر کوئی واردات ہوگئی ہے، پھر کوئی لفظوں کی بساط سجنے والی ہے اور اُس کا بہت پیار کرنے والا شوہر انسانی انس میں بے قراری محسوس کرنے لگا ہے۔

وہ دھیرے دھیرے شانت ہورہا تھا۔

...⁂...

وہ اپنے باپ کے برعکس صحت مند ذہنیت رکھتا تھا۔ پہلی مرتبہ جرم کا مرتکب ہونے چلا تھا اِس لئے ضمیر مسلسل دل میں حبس پیدا کررہا تھا۔ سمجھ رہا تھا کہ وہ جس طریقے سے مصباح پر اپنی ملکیت قائم کرنا چاہتا ہے وہ فیئر نہیں ہے۔ محبت جیسے پاکیزہ رَبط میں کہیں بھی جرم، گناہ یا غیر اخلاقی صورتِ حال پیدا ہوجائے، سب کچھ تل چھٹ ہوجاتا ہے۔ وہ عجیب سی ذہنی کش مکش میں کروٹیں بدل بدل کر رات گزار رہا تھا۔

ایسے میں فرخ نے فون پر رابطہ کرلیا۔ اپنے پورے پروگرام کے بارے میں خاصی تفصیل کے ساتھ آگاہ کیا۔ شہاب نے بھی مصباح سے ہونے والی گفتگو کے متعلقہ حصے اس کے گوش گزارے۔ دیر گئے تک فون پر اپنے پروگرام کو حتمی شکل دیتے رہنے کے دوران بارہا مرتبہ شہاب نے اُسے تاکید کی کہ مصباح پر کوئی آنچ نہ آئے حالانکہ صرف سچ کو آنچ نہیں ہوتی، جھوٹ تو بذاتِ خود آنچ کا بنیادی سبب ہوتا ہے۔

ایک ہی وقت میں تین انسانی کھوپڑیاں سلگ رہی تھیں۔ شہاب اور فرخ اپنی بساط بچھائے بیٹھے تھے۔ شہاب کو یہ خبر نہیں تھی کہ فرسٹ فلور پر واقع باباجان کے کمرے میں بھی ایک بساط بچھائی جارہی ہے۔ شہاب اپنی محبت کے حصول کیلئے جائز وناجائز کے تکلف میں نہیں پڑ رہا تھا تو اُس کا باپ اُس سے بھی چار ہاتھ آگے نکل کر اپنی جائیدار کے اکلوتے وارث کو مٹھی میں جکڑنے کا سامان کررہا تھا۔

صبح دم جاگا تو اُس پر کسل مندی سوار تھی۔ رت جگے کے اثرات کم کرنے کیلئے کافی دیر تک باتھ روم میں گھسا رہا۔ بہ خوبی تیار ہوکر اپنی گاڑی تک آیا۔ رِسٹ واچ پر نگاہ ڈالی۔ نہائت آسانی سے وہ وقت مقررہ میں کالج کے گیٹ پر پہنچ سکتا تھا جہاں ٹھہر کر اُسے مصباح کا انتظار کرنا تھا۔ گاڑی میں

بیٹھنا ہی چاہتا تھا کہ باپ پر نظر پڑ گئی۔ سلام کیا۔ باپ نے معنی خیز انداز میں مسکرا کر پوچھا ''کسی سے ملنے کیلئے جا رہے ہو؟''

اُس نے عام سے انداز میں جواب دیا ''ہاں بابا! دوستوں کے ساتھ کہیں جانے کا پروگرام ہے۔''

''وِش یو گڈ لک ڈیئر!'' باپ نے حسبِ عادت کلف شدہ مونچھوں کو ہونٹوں میں دَباتے ہوئے کہا اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا جہاں باوردی ڈرائیور ہمیشہ کی طرح اُس کا منتظر کھڑا تھا۔

شہاب گاڑی نکال کر سڑک پر آیا۔ فون کا بزر بجنے لگا۔ اُس نے فون کی ڈسپلے سکرین میں جھانکا۔ لبوں پر مسکراہٹ تیر گئی۔ مصباح فون کر رہی تھی۔ اُس نے کال ریسیو کی، فون کان سے لگایا اور بولا ''ہائے! میری جان مجھے بے تابی سے پکار رہی ہے، کسی کو اگر میری خوش بختی پر شک ہو تو آئے اور اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔''

وہ بولی ''زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ میں گھر سے نکل پڑی ہوں، تم بھی جلدی سے کالج کے گیٹ پر پہنچ جاؤ۔''

وہ کچھ کہنے کا ارادہ رکھتا تھا مگر مصباح نے کال منقطع کر دی۔ شہاب نے گاڑی کی رفتار قدرے کم کر دی کیونکہ اُسے علم تھا کہ مصباح جتنی بھی جلدی کرے، نصف گھنٹے سے پہلے نہیں پہنچ سکتی جبکہ شہاب گاڑی میں بیٹھ کر پانچ منٹ میں وہاں پہنچ سکتا تھا۔

اپنے لمحہ بہ لمحہ تجاوز کرتے اضطراب پر قابو پانے کیلئے راستے میں ایک کولڈ ڈرنک کارنر پر رُک گیا۔ سگریٹ خریدا، سلگایا اور کار کی ڈکی کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ دس پندرہ منٹوں تک چلتی رُکتی دُنیا کو دیکھنے کے بعد کالج کی طرف چل پڑا۔

پھر وہ دکھائی دے گئی۔ قدم قدم اَدا سے چلتی ہوئی گاڑی تک آئی۔ جھک کر گاڑی کے اندر جھانکتے ہوئے بولی ''کیا ہم اَبھی جا رہے ہیں؟''

اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ نقاب سے جھانکتی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ دل کو تھوڑا سا دُکھ ہوا۔ اعتبار کرنے والی کو دھوکہ دیتے ہوئے دِل ملامت کرنے لگا۔ دل کی مانتا تو فوراً تھم جاتا، دماغ کی مان کر آنکھیں جھکا کر سوچ رہا تھا ''اِن آنکھوں کی مستی کے مَے خانے کو ہمیشہ کیلئے اَپنانے کیلئے

جرم کر رہا ہوں، زیادتی کر رہا ہوں مگر تب یہ جرم بے تعزیر ہو جائے گا جب مدعی بانہوں میں آنکھیں موندے جرم کا تذکرہ کرنے کے بجائے دُنیا جہان کی باتیں کر رہی ہوگی۔''

وہ اگلا دروازہ کھول کر اُس کے برابر بیٹھتے ہوئے بولی ''تم پریشان دکھائی دیتے ہو، کیا بات ہے؟''

وہ مسکرا کر بولا'' پریشانی اور حیرت میں امتیاز نہیں کرسکتی ہو کیا؟''

''حیرت؟ کس بات پر حیران ہو رہے ہو؟''

''تمہیں دیکھ کر......''

''کیا میرے سر پر سینگ دکھائی دینے لگے ہیں؟''

شہاب نے ہنس کر گاڑی بڑھا دی۔ موبائل فون کی میموری میں پہلے سے فیڈ شدہ پیغام نکالا اور خرم کو بھیج دیا۔ پیغام کے ذریعے اُس نے خرم اور بابر کو مطلع کر دیا تھا کہ وہ روانہ ہو گئے ہیں۔ شہر سے نکل کر تحصیل ہیڈ کوارٹر کی طرف جانے والی سڑک پر گاڑی ڈالتے ہوئے شہاب نے کہا'' کیا پہلے اِس طرف کبھی آئی ہو؟''

اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ بولی'' ایسا سفر زندگی میں ایک بار کیا جاتا ہے، اَب تمہارے ساتھ کر رہی ہوں۔''

''میں سمجھا نہیں؟''

''میں نے نہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں کی۔'' وہ بولی'' اگر ہو سکے تو ڈرائیونگ کرنے کے ساتھ ساتھ میرے ساتھ باتیں کرتے رہو۔ میں نروس ہو رہی ہوں۔''

وہ خود بھی اپنی توجہ بٹانا چاہتا تھا کیونکہ ہر گزرتے لمحے میں وہ کمزور پڑتا جا رہا تھا۔ بولا'' ہماری حویلی سے دریائے سندھ محض دو تین کلومیٹر کے فاصلے پر بہتا ہے۔ چند دِن پہلے بہت اونچے درجے کا سیلاب آیا تھا۔ بستیاں برباد ہو کر رہ گئی تھیں، موقع ملا تو تمہیں دریا پر لے جاؤں گا، کیا دلچسپی رکھتی ہو؟''

اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ پروفیسر وسیم بزدار کی جنت کا خیال پَل بھر کیلئے ذہن میں آیا، پھر

معدوم ہو گیا۔ اُسے اپنی جنت کی فکر تھی، پروفیسر کی جنت سے اُس نے کیا لینا دینا تھا؟ وہ بڑی دلچسپی کے ساتھ شیشے کے پار کھیتوں کو دیکھ رہی تھی۔ دھڑکتے دِل سے پوچھنے لگی ''کتنا سفر رہ گیا ہے؟''

''نصف طے ہو گیا، نصف رہ گیا ہے۔'' شہاب نے دلاسہ دیا۔

شہاب نے گاڑی کی رفتار آہستہ کی۔ بائیں طرف نکلتی لنک روڈ پر اُترتے ہی نیلی بَتی والی لینڈ کروزر کھڑی دکھائی دی۔ گاڑی کے قریب ہی سڑک کے بیچوں بیچ عجیب سی یونیفارم والے تین اونچے لانبے جوان کھڑے تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں خوفناک گنیں پکڑی ہوئی تھیں جن کا رُخ شہاب کی کار کی طرف ہی تھا۔ مصباح کے منہ سے دَبی دَبی چیخ نکل گئی۔ شہاب نے گھبرا کر جلدی سے بریک لگائے۔ گاڑی رُکتے ہی دو آدمی اُن کے سروں پر پہنچ گئے۔ شہاب کے پاس آنے والے نے گن کے اشارے سے شیشہ اُتارنے کا حکم دیا۔ شہاب نے شیشہ اُتارا۔ پوچھا ''کیا بات ہے سر؟''

''باہر نکل آؤ، ہَری اَپ!'' اُس نے ڈپٹ کر کہا۔

اُس کے بالوں کی مخصوص کٹنگ دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ کسی حساس ادارے سے تعلق رکھتا تھا۔ شہاب ایک نظر مصباح پر ڈال کر نیچے اُترا۔ گن بردار نے اُس کے سینے پر گن رکھ کر ہینڈز اَپ کرا دیا۔ اُس کے ساتھی نے مصباح کا دروازہ کھولا۔ ڈپٹ کر بولا ''کون ہو تم لوگ؟''

''وہ......مم...... مجھے نہیں پتہ!'' مصباح بری طرح گھبرا گئی تھی۔

گن بردار نے گاڑی کے قریب کھڑے وردی پوش کی طرف منہ کر کے کہا ''سر! یہ واقعی مشکوک لوگ ہیں، اِنہیں ہیڈ کوارٹر لے کر جانا ہو گا۔ مجھے دال میں کالا نظر آتا ہے۔''

شہاب نے ہونٹ بھینچ کر سخت لہجے میں کہا ''کیا تم لوگ اپنا تعارف کرانا پسند کرو گے؟''

''ہاں میرے لعل! تمہارا یہ شوق بھی پورا کر دیتے ہیں۔'' نیلی بتی والی گاڑی کے ہُڈ سے ٹیک لگائے کھڑے آفیسر نے طنزیہ لہجے میں کہا ''تمہیں اگر ہماری یونیفارم اور گاڑی کو دیکھ کر بھی کچھ پتہ نہیں چل رہا تو تمہاری اطّلاع کیلئے دَست بستہ عرض کرتا ہوں کہ ہمارا تعلق آئی بی سے ہے اور ہم یہاں تمہارے جیسے عیاش امیر زادوں کے انتظار میں اپنے فرائض منصبی سرانجام دے رہے ہیں۔ اَب تم بھی پھوٹ پڑو، کون ہو، یہ لڑکی کون ہے اور اِدھر ویران علاقے میں کیا کرنے کیلئے اتنے

اہتمام سے قدم رنجہ فرمایا ہے آپ نے؟''

اُس کے لہجے میں پنہاں کاٹ اور طنز نے مصباح کو زمین میں گاڑ دیا۔شہاب نے کہا''ہم اپنے گھر جارہے ہیں۔ یہاں سے آٹھ دس کلومیٹر کے فاصلے پر ہماری زمینیں اور حویلی موجود ہے۔''

''کہاں؟''

شہاب نے گاؤں کا نام بتایا۔اُس نے کن اکھیوں سے مصباح کو دیکھ کر پوچھا''یہ عورت کون ہے؟''

شہاب نے جلدی سے کہا''یہ میری بیوی ہے؟''

''اوہ!''آفیسر نے یوں کہا جیسے اُسے یہ سن کر بے حد مایوسی ہوئی ہو''جوانو! اِسے جانے دو۔ یہ تو میاں بیوی نکلے۔''

شہاب نے عافیت کا سانس لیا، ہاتھ نیچے کئے اور گاڑی میں بیٹھنے لگا۔اُس کے سر پر کھڑے گن بردار نے اُسے زوردار گالی دیتے ہوئے کہا''تمہیں کس نے کار میں بیٹھنے کی اجازت دی ہے؟ چل باہر نکل اور اپنا نکاح نامہ دکھا۔'' پھر اپنے آفیسر کی جانب متوجہ ہوکر بولا''سر جی! جان چھڑانے کیلئے لوگ یہی جھوٹ بولتے ہیں۔اَبھی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوجاتا ہے۔''

شہاب کا رَنگ متغیر ہوگیا۔اُس کا جھوٹ نبھ نہیں سکا تھا۔معذرت خواہانہ انداز میں بولا''نکاح نامہ ایسی چیز تو نہیں جسے ہر وقت اپنے پاس رکھنا ضروری ہو، وہ گھر میں پڑا ہے۔''

اُسی اہلکار نے مصباح کے قریب آ کر پوچھا''کیوں جی! کیا آپ اِس کی بیوی ہیں؟''

مصباح کا حلق سوکھ کر کانٹا ہورہا تھا۔آج تک ایسی صورتِ حال سے دوچار نہیں ہوئی تھی۔زور زور سے اثبات میں سر ہلانے لگی۔شہاب نے اِسی دوران جرأت پکڑی اور غصے سے کہا''شاید تم لوگ مجھے جانتے نہیں ہو، میں ضلع ناظم سردار ارباب خان کا بیٹا ہوں، کھڑے پیر تمہاری وردیاں اُتروا سکتا ہوں۔سمجھے؟''

آفیسر نے استہزائیہ لہجے میں اُس کی نقل اُتاری''کھڑے پیر تمہاری وردیاں اُتروا سکتا ہوں...... ارے واہ! کیا اختیارات ہیں جناب کے! کیا تم واقعی ضلع ناظم کے بیٹے ہو؟''

''ہاں......''

''تو پھر یہ عورت ضلع ناظم کی بہورانی ہوگی؟''

مصباح کو آفیسر کا لہجہ اور انداز بہت ناگوار گزر رہا تھا مگر بے بسی سے سوائے آنسو بہانے کے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

''ہاں۔ آخر تم لوگ ہمارے ساتھ ایسا نازیبا رویہ کیوں رکھے ہوئے ہو؟ کیا ہم نے کوئی واردات کر ڈالی ہے؟'' شہاب نے تنگ آ کر کہا۔

''وقت آنے پر یہ بھی بتلا دوں گا۔ تمہاری بیوی کا نام کیا ہے؟''

شہاب کا چہرہ فرطِ غیض سے سرخ ہوگیا۔ بولا ''ہم شرفاء ہیں، اپنی بہو بیٹیوں کے نام کسی کو بتلایا نہیں کرتے۔''

یہ کہنا قیامت ثابت ہوا۔ شہاب خان کے سامنے کھڑے چوڑے چکلے سینے والے گن بردار نے پوری قوت سے گن کی نال اُس کی پسلیوں میں چبھودی۔ وہ دھکا کھا کر پیچھے ہٹا۔ سڑک سطح زمین سے دو تین فٹ اونچی تھی، اِس لئے وہ لڑکھڑا کر عقب میں کماد کے کھیت میں جا گرا۔ بہ دقّت تمام اُٹھا اور دھمکیاں دیتا ہوں گاڑی کے قریب آیا۔ گن بردار نے دانت پیس کر کہا ''سرجی نے جو پوچھا ہے، شرافت سے بتاؤ ورنہ گولی ماردوں گا۔ گولی کسی ضلع ناظم کے بیٹے کو پہچان کر معاف نہیں کرتی۔ سمجھے ہو یا پھر سمجھاؤں؟''

وہ ہونٹ کاٹتا رہا مگر منہ سے کچھ نہیں بولا۔ مصباح نے جلدی سے اپنے قریب کھڑے اہلکار سے کہا ''میرا نام مصباح ہے۔ پلیز! ہمیں جانے دو۔ تم لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے، ہم کوئی مجرم نہیں ہیں۔''

اہلکار نے اپنے آفیسر کو مصباح کے نام سے آگاہ کیا۔ اُس نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا اور سیٹی بجانے کے سے انداز میں ہونٹ سکیڑ کر زیر لب ''مصباح'' کہا۔ پھر گاڑی سے ایک پاکٹ نوٹ بک اور پنسل نکالی۔ کچھ لکھ کر مصباح کے قریب آیا اور اُس کے ہاتھ میں نوٹ بک اور پنسل تھماتے ہوئے سخت لہجے میں بولا ''اِس میں چند سوالات لکھے ہیں، اُن کے جواب لکھو، دیکھو! غلطی کرنے اور عدم

تعاون کی صورت میں بہت بڑے نقصان سے دو چار ہو جاؤ گی۔تعاون کرو گی تو ممکن ہے جان چھوٹ جائے وگرنہ آئی بی کے ہاتھ لگنے والے مجرموں کی آنے والی سات نسلیں بھی آئی بی کے نام سے خوفزدہ رہتی ہیں۔''

مصباح نے کانپتے ہاتھوں سے نوٹ بک تھامی۔ کن اکھیوں سے شہاب کی طرف دیکھا جس کی حالت خاصی غیر ہو چکی تھی۔مصباح کے سامنے تین سوال درج تھے۔

''شادی کس تاریخ کو سرانجام پائی؟''

''تمہاری ساس کا نام کیا ہے؟''

''حق مہر کتنا طے پایا تھا؟''

مصباح کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔اُسے دماغ نے سمجھا دیا تھا کہ اِنہی سوالوں کے جوابات شہاب سے بھی طلب کئے جائیں گے۔غلط ہونے کی صورت میں اُنہیں مجرم قرار دے دیا جائے گا۔ جگ ہنسائی......ذلت......تماشا! کئی سوالیہ نشان اُس کی نگاہوں میں ایستادہ ہو گئے۔اُس نے مدد طلب نگاہوں سے شہاب کی طرف دیکھا۔وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے ہونقوں کی طرح کبھی اُسے اور کبھی آفیسر کی طرف دیکھنے لگا۔

آفیسر نے جھڑک کر کہا''میں نے ایٹم بم بنانے کی ترکیب نہیں پوچھی،جلدی جواب دو۔''

وہ کچھ نہ لکھ پائی۔ مجبوراً رُندھے ہوئے لہجے میں بولی''میں کچھ نہیں جانتی۔ پلیز! ہمیں جانے دو۔''

''کیوں بے ناظم کے پتر! کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ لڑکی تمہاری بیوی ہے؟''

شہاب نے تذبذب کے عالم میں کہا''ہا......ہاں......میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تم اپنے حق میں اچھا نہیں کر رہے ہو۔میں تمہاری شکایت بہت اوپر تک پہنچاؤں گا۔''

اُس کے دھمکی آمیز لہجے کا آفیسر پر کوئی اثر نہیں پڑا۔اُس نے پیشانی پر بل چڑھا کر اپنے ماتحت سے کہا''اوئے گرمانی! تمہارے پاس ضلع ناظم کا سیلولر نمبر ہوگا،دیکھو تو......اُسے فون کرو اور پوچھو کہ تمہاری بہو ویران علاقے میں ایک اوباش جوان کے ساتھ گھوم پھر رہی ہے،کیا اُس اوباش کو تمہارا

بیٹا مان لیا جائے؟''

مصباح کو کور کئے کھڑے اہلکار نے ہِپ پاکٹ سے موبائل فون نکالا۔ چند لمحے رابطہ کرنے میں لگے۔ رابطہ ہونے پر اُس نے وائڈ سپیکر آن کرتے ہوئے پوچھا ''سردار ارباب خان سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''میں ......سردار ارباب خان، بات کررہا ہوں۔تم کون ہو؟'' شہاب کو جھٹکا سا لگا۔ مصباح کو شہاب کا ردِعمل دیکھ کر یقین ہوگیا کہ موبائل فون سے نکلنے والی آواز اُس کے باپ کی ہی تھی۔

''میں آئی بی کا اہلکار بول رہا ہوں۔ ہم نے ایک مشکوک جوڑے کو رَنگ رلیاں مناتے ہوئے گرفتار کیا ہے۔لڑکی آپ کی بہو ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔'' آفیسر نے کہا۔

''واٹ اے نان سینس!'' سردار ارباب خان نے چنگھاڑ کر کہا ''میرا ایک ہی بیٹا ہے اور اس کی ابھی تک شادی نہیں ہوئی۔ یہ لڑکی جو کوئی بھی ہے، اِسے الٹا لٹکا دو، ٹارچر سیل میں ڈال دو یا کچھ بھی کرو، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

اِس کے ساتھ ہی ضلع ناظم نے فون بند کر دیا۔ مصباح اور شہاب کی حالت خاصی دگر گوں ہوگئی۔ مصباح کا چہرہ یوں پیلا پڑ گیا تھا جیسے جسم سے خون کی ایک ایک بوند نچوڑ لی گئی ہو۔تصدیق کا مرحلہ تمام ہوتے ہی آفیسر کے حکم پر دونوں اہلکاروں نے دونوں مجرموں کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنا دیں۔ چہروں پر خاص انداز میں کپڑے کے تیار کردہ سیاہ ماسک چڑھا دیے اور لبوں پر ٹیپ لگا کر نیلی بتی والی لینڈ کروزر کے پچھلے حصے میں ایک اہلکار کی گن کے سائے میں دھکیل دیا گیا۔ دوسرا اُس کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔

لینڈ کروزر کے شیشوں پر گہرے رنگ کا گلاس پیپر چسپاں تھا جس کی وجہ سے غور کرنے پر بھی گاڑی کے اندر کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ پشت پر ہتھ کڑیوں میں ہاتھ بندھے ہونے کی بدولت دونوں اپنی مرضی سے حرکت بھی نہیں کرسکتے تھے۔گاڑی کے روانہ ہونے کے ساتھ ہی مصباح بے جان انداز میں شہاب پر گر گئی۔ اچانک دَرپیش آنے والی غیر متوقع صورتِ حال اُس کے ناتواں اعصاب کو توڑنے پھوڑنے کیلئے کافی ثابت ہوئی تھی۔

زندگی کا چلن کبھی کبھی ناقابلِ حد تک عجیب ہو جاتا ہے۔ مصباح نے جس شخص کو بھری دُنیا میں اپنا محافظ چُنا تھا، جس وجود کو خوشیوں کا خزینہ قرار دے کر ہر چیز پر ترجیح دے ڈالی تھی، وہی اُس کی شخصیت اور اُس کی زندگی کے تمام تر وقار پر سیاہ دھبہ بن گیا تھا۔ ایسے میں یہ کہنا کتنا بڑا اصدق ہوگا کہ محبت اور خودغرضی ایک ہی کھوپڑی میں پرورش پانے والے دو خوابیدہ ناگ ہیں جن میں سے کوئی ایک یا دونوں کسی بھی لمحے ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتے ہیں اور زندگی کی رَگ رَگ میں اپنا زہر بھر دیتے ہیں۔

...⊛...

قسمت نے فینی کا کٹا پھٹا لباس اُتار پھینکا۔ اپنی ماما سے ضد کر کے نیا بنوایا اور پہنا دیا۔ اِس سب کے باوجود وہ بہت زیادہ مضطرب تھی۔ ماما اُس کا دِل بہلانے کی کوشش کر رہی تھی مگر کوئی افاقہ ہوتا دکھائی نہ دیا تو اسے اُس کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔

وہ بیڈ پر اوندھے منہ لیٹی فینی کی دل جوئی کر رہی تھی۔ مانو کمرے میں داخل ہوئی تو اُس کا پارہ چڑھ گیا۔ اُٹھی اور اپنی ہوائی چپل سے اُس کی خوب پٹائی کر دی۔ مانو نے اچھا خاصا احتجاج کیا، چیختی چلاتی بیڈ کے نیچے گھس کر اُس کے دسترس سے نکل گئی۔ وہ پھولے ہوئے تنفس کے بیچ دانت پیس کر بولی ”کمینی مانو! تم کچھ زیادہ ہی چالاک ہوتی جا رہی ہو۔ دوبارہ ایسی حرکت کی تو تمہارا کھانا بند کر دوں گی۔“

فینی کو اپنے ننھے سے بازو پر لٹا کر ہمکنے لگی۔ پیار سے سلانے لگی۔ ایسے میں فینی کا کزن یاد آیا۔ سوچا ”فینی اپنے کزن سے مل کر یقیناً خوش ہوگی۔“

فینی کو بڑے آرام سے لٹا کر اُس کے کزن کو ڈھونڈنے لگی۔ وہ کہیں دکھائی نہیں دیا۔ یاد آیا کہ فینی کے کزن کو ہنس اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ ننگے پیروں گھر سے بھاگتی ہوئی نکلی۔ ہنس کے گھر کی طرف جاتے ہوئے پلاٹ میں نظر پڑی۔ ہنس کشتی کے قریب آلتی پالتی مارے دھوپ میں بیٹھا دکھائی دیا۔ وہ دَبے پاؤں اُس کے عقب میں آئی۔ اوپر سے جھانک کر دیکھا۔ ہنس نے پوڈو کے پہلو میں فینی کے کزن کو بیٹھا رکھا تھا اور زیرِ لب اُس سے باتیں کر رہا تھا۔

قسمت نے اُس کے کندھوں پر ہاتھ رکھے تو دونوں ہتھیلیاں پسینے سے چپچپانے لگیں۔ ہنس پسینے سے تر بہ تر ہو چکا تھا مگر جانے کیوں اُسے گرمی اور حبس کی ذرہ بھر پرواہ بھی نہیں تھی۔ ہاتھوں کے لمس کو محسوس کر کے چونکا اور منہ اُٹھا کر خود پر جھکی ہوئی قسمت کو دیکھ کر مسکرانے لگا۔

''وہ دراصل مجھے یوں محسوس ہوُا جیسے فینی کا کزن اکیلا رہ رہ کر اکتا گیا ہو، میں اِسے پوڑو سے ملوانے کیلئے یہاں لے آیا۔''

...⊛...

پانی کی سطح مسلسل گر رہی تھی۔ سیلابی ریلے نے پروفیسر کے کئی دِنوں کے سکون کو غارت کر دیا تھا۔ سموں کا یوں لہروں کے دوش پر زندگی موت کا کھیل کھیلتے ہوئے اُس کی جنت میں اُترنا اور پھر مایوس چلے جانا، پسلیوں کے نیچے ایک نئی کسک کو جگا گیا تھا۔ اُسے بچپن یاد دلا کر جانے والی اَبھی تک اُس کی چشمِ تصور میں بسی ہوئی تھی۔ ایسے میں ڈاکٹر اَشولال نے فون پر رابطہ کرلیا۔ اپنی ہمیشہ کی طرح زندگی سے بھرپور آواز میں احوال دریافت کرنے کے بعد بتلانے لگا ''پروفیسر! میں نے تمہاری سموں کو اُس کی بیٹی کے پاس پہنچا دیا تھا۔ شکنتلا اور کندن نے بڑی عقیدت سے تمہارا شکریہ ادا کیا تھا۔''

پروفیسر ہونٹ کاٹتے ہوئے خاموش رہا۔

ڈاکٹر اَشولال نے کہا ''میں نے محض یہ بتلانے کیلئے فون نہیں کیا، میں تمہاری توجہ ایک اور ضروری واقعے کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ کیا تم نے محسوس کیا کہ تمہاری جنت میں بجلی کا تعطل تم پر کتنا ناگوار گزرا تھا؟ یاد ہے؟''

''ہاں مُرشد!'' پروفیسر نے کہا ''یوں لگتا تھا جیسے میرا یہاں رہنا بے مقصد اور نہائت فضول ہے۔ بجلی آنے پر محسوس ہونے لگا کہ بدن نے پھر خوابیدہ روح کو اپنے اندر جگہ دے دی ہے۔''

''میڈا سئیں! یہی میں تم پر باور کرانا چاہتا ہوں، تبھی تمہیں مسلسل کچوکے دیتا رہتا ہوں۔ تم واقعے کے عینی شاہد بنتے ہو مگر اُس سے کوئی نتیجہ اخذ نہیں کرتے۔ یہ بہت بڑا انسانی عیب ہے جو تم میں بدرجہ اَتم پایا جاتا ہے۔''

’’میں سمجھا نہیں مُرشد! کھل کر بات کرو۔‘‘

’’تمہاری دُنیا سے بیزاری کے عقب میں انتظامی بے ربطگیاں بھی کارفرما ہیں۔تم یہ سوچتے ہو کہ انسانوں کے معاشرے میں بجلی کا جانا، کسی بھی سہولت کا اچانک پلٹ جانا اور حکومتی اداروں کا مسلسل کافی عرصہ تک توجہ نہ دینا محض اجارہ داراتی ناانصافی ہے۔ایسا نہیں ہے۔کیا تمہاری جنت میں بجلی کی فراہمی کی ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ایک فرد پر مشتمل گھر اپنی تنصیبات کو ہمیشہ کیلئے درست نہیں رکھ سکتا، کروڑوں نفوس پر مشتمل مختلف نوع کے انسانوں کو کیسے برابر رکھا جاسکتا ہے؟ جہاں جاگیرداروں، اجارہ داروں اور بڑے کلف والے سیاسی گماشتوں کے ہاں بے ضابطگیاں عروج پر ہیں، وہاں نچلے طبقے میں بھی بے حد خامیاں موجود ہیں جن کی اُنہیں خود بھی پرواہ نہیں، کوئی کیسے انہیں سُدھارنے کا ٹھیکہ لے سکتا ہے۔‘‘ ڈاکٹر اَشولال کی زبان چلی تو دیر تک بلا توقف چلتی رہی ’’دیکھو سئیں! میں ایک ناتواں انسان ہوں، کئی سرکاری فرائض کی انجام دہی پر مامور ہوں، اپنے مکمل دِن پر دسترس نہیں رکھتا تب بھی میں نے اپنے جیسے چند ساتھیوں سمیت سیلاب کی تباہ کاریوں میں امدادی حصہ ڈالا۔تم پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں، کھانے پینے کی فکر نہیں اور تم مسلسل سندھ ساگر کے قلب میں موجود رہے، پھر بھی تم نے کسی ڈوبتے ہوئے انسان کو بچانے کی کوشش نہیں، کسی کو ایک وقت کا کھانا نہیں دیا......اگر سموں کو پہچان نہ پاتے تو یقیناً اُسے دریا کی لہروں میں اپنے بانس سے دھکیل دیتے......ایسا کیوں ہے سئیں؟ کیا ہمیں اللہ تعالیٰ نے اِس لئے پیدا کیا ہے کہ ہم محض اپنی جان بچائیں، اپنا دُکھ سنبھالیں اور اپنے جیسے دوسرے انسانوں کو زہریلا ناگ قرار دے کر کچل دیں؟ میرا خیال ہے کہ خدا نے انسان کی تنہائی کو ختم کرنے کیلئے دوسرا انسان پیدا کیا۔دوسرے کیلئے تیسرا۔‘‘

’’میرا خیال تھوڑا سا مختلف ہے مُرشد!‘‘ پروفیسر نے کہا ’’انسان ایک فریب ہے۔انسان ہی فریب زدہ ہے۔یہی دیکھ لو کہ دُنیا کا ہر مذہب ایک مخصوص گروہ کے ہاتھ میں کھلونا بنا ہوُا ہے۔کون ہے جو نادیدہ رَب کے نام پر اپنے جیسوں کو دونوں ہاتھوں سے نہیں لوٹ رہا۔اپنے ملک میں ہی دیکھ لو۔مُلّااِزم کی دُکان پر کتنے سچے موجود ہیں۔اِن ڈایا گرامز میں فِٹ وہی آتا ہے جو دِل کھول کر چندہ

دیتا ہے۔ پیسے بٹورنے کے عمل کو کتنے عنوان دے رکھے ہیں اِن مذہبی اجارہ داروں نے......نادیدہ جنت کے ٹکٹ کتنے دھڑلے سے فروخت کئے جاتے ہیں۔فریب زدہ لوگوں پر باور کرایا جاتا ہے کہ یہ دُنیا محض عارضی اور فنا کی منتظر ہے۔اگلی دُنیا بہت طویل اوراَن لمٹیڈ ہے۔اپنے لئے کوئی بھی ٹکٹ ریزرو نہیں کراتا، دوسرے کے ہاتھوں میں تھمانے کیلئے ایجنٹوں کی ریس لگی ہوئی ہے۔اسی طرح ہر مرض کا علاج ایک جراثیم آلود پھونک، کاغذ کے ایک بے وقعت ٹکڑے اور گلے میں بے وزن طوق لٹکانے والوں پر غور کرو۔کیا اِس معاشرے کے پڑھے لکھے انسانوں کو بھی یہ سوچنے کی مہلت دیتے ہیں کہ دُنیا بھر میں ایسی دکانداریاں کہیں بھی موجود نہیں، یہاں موجود ہیں تو کیوں؟ الٹا ان کی موجودگی کو باعثِ رحمت قرار دیتے ہیں۔'' بے لاگ بولتے بولتے پروفیسر کا گلا سوکھ گیا۔

سانس لینے کو رُکا تو ڈاکٹر اَشولال کے استہزائیہ قہقہے کی گونج کان میں پڑی۔وہ کہہ رہا تھا'' میڈا سئیں! یہاں ناخواندگی کی شرح کتابوں میں درج شدہ شرح سے کہیں زیادہ ہے۔عقائد کی توڑ پھوڑ آج کی اختراع نہیں، صدیوں سے چلی آرہی ہے۔اِس کی اصلاح علم کی مساوی ترسیل سے ہی ممکن ہوسکتی ہے۔علم والے اگر تمہاری طرح خدائی جنت کا اعتبار کھو کر اپنی اپنی جنتیں بنانے نکل کھڑے ہوں تو کمزور عقائد والے لوگ کہاں جائیں گے؟ ہمیشہ کی طرح مگرمچھوں کے جبڑوں کا کھاج بنتے رہیں گے۔''

''میرا خیال ہے کہ یہ لوگ اِسی قابل ہیں کہ اِنہیں مسلسل کچلا جائے۔''

''تو پھر تمہیں اعتراض کیا ہے؟''

وہ لاجواب ہوکر بولا'' تم اپنی زندگی پر غور کرو مُرشد! تمہیں ان لوگوں نے کون سے میڈل سے نوازا ہے جن کیلئے تم نے اپنی تمام عمر، تعلیم، عہدہ، تنخواہ اور سب کچھ لٹا رکھا ہے۔تمہارے لکھے ہوئے کو کوئی سمجھنے پر تیار نہیں ہے۔تمہاری بیوی بیمار ہوئی، اُس کے علاج کیلئے تم جیسے کائناتی مسیحا کیلئے کوئی دوا موجود نہیں تھی۔دوا کیلئے پیسے موجود نہیں تھے۔اپنے ہم رتبہ افسران کی طرف نگاہ ڈالو۔کیا اُن لوگوں نے کروڑوں کی مالیت کے نجی ہسپتال نہیں بنا رکھے؟ دونوں ہاتھوں سے غریبوں کو لوٹتے ہیں، دو نمبر دوائیں بیچتے ہیں اور یہ احمق لوگ پھر بھی اُن کا احترام کرتے ہیں۔اُن کے کام کو سراہنے کیلئے

مختلف فورمز پر تقریبات کا انعقاد ہوتا ہے۔ تمہارے لئے اِس معاشرے کے پاس کچھ بھی نہیں۔ جب تم بیس روپے فیس طلب کرتے ہو تو ہر دماغ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ چھوٹا ڈاکٹر ہے۔ یہ عطائی ہے۔ یہ دو نمبر دوائی دینے والا طبیب ہے۔ جب تم کسی کی وہماتی بیماری پر مسکرا کر کہتے ہو کہ تم بالکل ٹھیک ہو، جاؤ، دیسی خوراک کھاؤ پیو اور دل پر کوئی بوجھ مت لو تو وہ تمہارے منہ پر ہی کہہ دیتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب! اگر آپ کو بیماری کی سمجھ نہیں آئی تو مجھے کسی اچھے سے ڈاکٹر کے پاس بھیج دیں......تب بھی تمہیں ان لوگوں کی نفسیات کا علم نہیں ہوتا۔ کیا یہ جہالت نہیں ہے؟''

''میرا تمام عمل انسانوں سے خراج لینے کیلئے نہیں، خدا کا قرب حاصل کرنے کیلئے انجام پاتا ہے اور مجھے مطمئن رکھتا ہے۔''

''یونہی ہی سہی۔ خدا کا قرب پانے کے بعد بھی غربت درپیش رہے تو وہ قرب ہی کیا؟ غربت سے جنگ کے کامیاب نتیجے پر غربت ہی انعام میں مسلط کر دی جائے تو پھر وہ جنگ کتنی بے معنی اور بے ثمر قرار پائے گی، سمجھتے ہو مرُشد!''

اُس نے زندگی میں پہلی مرتبہ ڈاکٹر اَشولال کی دکھتی رَگوں پر ہاتھ دھرا تھا۔ کافی دیر تک فون میں ڈاکٹر کی آواز سنائی نہیں دی تو وہ فاتحانہ انداز میں بولا'' کیوں مُرشد! بولتی بند ہو گئی ناں! تمہیں کتنے برس ہوئے سندھ ساگر کے وسنیکوں کیلئے جنگ لڑتے ہوئے؟ غالباً بیس پچیس سال! اتنے طویل عرصے میں تم نے لاکھوں روپے اُجاڑ دیے اور اِس بے سرو پا مشن میں مصروف رہنے کی بدولت اپنے لئے پانچ مرلے کا مکان ہی نہ بنا سکے۔ بتاؤ! ریٹائرمنٹ لینے پر تمہارے سر سے سرکاری چھت سرک کر کسی اور افسر کے سر پر تن جائے گی۔ ملاحوں اور ملاحوں کی کشتیاں اُسی رفتار سے چلتی رہیں گی مگر تمہاری زندگی کی رفتار کیا ہو گی؟......تم اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ مسلسل بے ایمانی کر رہے ہو۔ اُن کی فلاح سے غفلت برت رہے ہو۔ کیا روزِ محشر میں اپنے رَب سے یہی کہو گے کہ غلطی ہو گئی پروردگار! میں تمہاری غریب مخلوق کے حقوق کیلئے لڑتا رہا اور اِس مصروفیت میں گھر سے غفلت کا مرتکب ہوتا رہا؟ کیا وہاں تمہاری یہ بھونڈی اور بے محل تاویل مان لی جائے گی؟ ہرگز نہیں...... مجھے ہم خیال بنانے سے پہلے اپنے عقائد اور اِن عقائد پر حاصل ہونے والے مفادات کا موازنہ کرو۔ دودھ

کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔''

ڈاکٹر اَشولال کے حلق سے آہ خارج ہوئی۔ تھکے تھکے لہجے میں بولا ''بولتے رہو پروفیسر! خاموشی موت بن کر رَگوں میں اُترنے لگی ہے، بولتے رہو۔''

''میں نسلاً مُہانہ ہوں، تم جانتے ہو۔ مجھے اِس معاشرے نے قدم قدم پر ٹھکرانے کا عزم کئے رکھا۔ میں اِنہی خیالات کو لئے ریگنتار رہا جو تم نے اوڑھ رکھے ہیں۔ پھر کیا ہوا؟ مجھے ٹھکرانے والوں کی اخیر نہیں ہوئی، میرے عقائد کا بھانڈا پھوٹ گیا۔ یہاں کوئی بھی کسی کا نہیں بنتا۔ ہر کوئی ضرورت کی آبیاری اور مفاد کے حصول کیلئے اپنی باچھیں کانوں سے لگائے ملتا ہے، تیوریاں چڑھائے رخصت ہو جاتا ہے۔ میں، تم، وہ، سب...... اپنے مزار خان کو دیکھ لو۔ کتنے بڑے عہدے سے ریٹائرڈ ہوا۔ خالی ہاتھ۔ ریگستان کے قلب میں ایک چھوٹا سا گھر بنا کر بیٹھ گیا۔ اُسے احمق قرار نہیں دیا جائے گا تو کیا کہا جائے گا کہ اسلام آباد کی پُر رونق آبادی کو چھوڑ کر تھل میں ڈیرہ جما کر بیٹھ گیا۔ ٹیلوں پر اُگی ہوئی جڑی بوٹیوں اور گھاس پھونس کی بقاء کا علم عہد رواں کی ترقی پر ایک پھبتی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ ایک طرف لاکھوں امراء اپنی عیاشیوں کی خاطر بھیڑ بکریوں کو درندوں کی طرح چیر پھاڑ کر کھا رہے ہیں، دوسری طرف وہ اُن کی رہت کا مقدمہ لڑتے لڑتے آشفتگی کا شکار ہوتا جاتا ہے۔ لاکھوں روپے کے جلو میں آنے والا بڑھاپا نقاہت کی گیلی چادر اوڑھے ریگزار کی گرم لُو کے تھپیڑے برداشت کرتے کرتے موت سے ہم کنار ہو جائے گا۔ تب اُس کے کاز کو آگے چلانے کیلئے کوئی چرواہا اپنے گلے کو اللہ کے حوالے کر کے آگے نہیں بڑھے گا۔''

''بس سئیں؟ کچھ اور کہنا چاہو تو کہہ دو۔ کسی نے آج تک ایسا سچا آئینہ مجھے نہیں دکھایا، تم دکھا رہے ہو تو مزہ آ رہا ہے۔'' ڈاکٹر اَشولال نے بے حد سنجیدگی سے کہا ''تمہاری ہر بات اپنی جگہ درست مگر میں ہر اُس مذہب، عقیدے اور سوچ کو پوری قوت سے جھٹلاتا ہوں جو ایک انسان کو دوسرے سے دور رکھے۔ ہمیشہ اُسی قوم کو تاریخ نے یاد رکھا جس نے اپنے عضو عضو کو سنبھال کر رکھا۔''

''مثال پیش کرتے ہوئے دلیری کا مظاہرہ کرنا اور چنگیزی قوم یا ہلاکو خان کی قوم کا تذکرہ کرنا مُرشد!'' پروفیسر کے لہجے میں گہری کاٹ تھی۔

''یوں ہی سہی پروفیسر!'' ڈاکٹر اَشولال نے ہنس کر کہا'' چنگیز خان کو چند ہزار کی سپاہ کے ساتھ ناکوں تلے چنے چبوانے والا خوارزم شاہ تاریخ کے سینے پر سنہری الفاظ سے رقم ہے۔ آج بھی یہ تھل اُسی جلال الدین کی قدموں کی دھمک کے بل پر' چولِ جلالی' کہلاتا ہے۔ اِسی سندھ ساگر میں اُس نے گھوڑے سمیت چھلانگ لگائی تھی اور تمہیں بہ خوبی علم ہوگا کہ پورے جوبن پر بہتے ہوئے دریا نے بھی اُسے پار اُترنے کی اجازت دے دی تھی......''

اچانک پروفیسر کے فون میں ٹوں ٹوں کی مخصوص آواز گونجنے لگی۔ ڈاکٹر اَشولال کے فون کی سکت جواب دے گئی تھی۔ پروفیسر کال بیک کرنا ہی چاہتا تھا کہ بزر بجنے کے ساتھ سکرین پر افتخار کا نام چمکنے لگا۔ اُس نے کال ریسیو کی، فون کان سے لگایا اور بولا'' افتخار بیگ! کیسے ہو؟''

''میں بالکل اچھا نہیں ہوں۔ آپ کی طرح تنہائی کی تلاش میں ویرانوں کی طرف نکلنا چاہتا ہوں۔'' افتخار کا یہ انداز پروفیسر کیلئے یکسر اجنبی تھا۔

''کیا ہوا بیٹے؟'' پروفیسر نے چونک کر پوچھا۔

''وہ ہوا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔'' افتخار نے تھکے تھکے سے لہجے میں کہا'' میں چند دِن آپ کی جنت میں گزارنا چاہتا ہوں۔ پلیز سر! مجھے مایوس نہ کیجئے گا، میں پہلے ہی ٹھکرائے جانے کے کرب سے گزر رہا ہوں۔''

''اگر ایسا ہے تو بلا جھجک میرے پاس چلے آؤ۔ میری جنت کے پٹن تمہارے لئے روزِ اول سے کھلے ہیں بیٹا!'' پروفیسر نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ غالباً اِس دوران وہ اُسے اجازت دینے یا نہ دینے کے بارے میں غور کرتا رہا تھا۔ افتخار بیگ نے شکریہ ادا کر کے فون بند کر دیا۔

وہ پوری توجہ سے افتخار بیگ کے انداز میں واقع ہونے والی غیر معمولی تبدیلی کے بارے میں سوچتے ہوئے جان بوجھ کر ڈاکٹر اَشولال سے رابطہ کرنے سے گریزاں رہا۔ اُسے بہ خوبی اندازہ تھا کہ وہ یوں جارحانہ انداز میں جھنجوڑے جانے پر پیچ و تاب کھا رہا ہوگا، بل کھا کر جوابی چوٹ کرنا چاہتا ہوگا، اِس لئے سرِ دست اُسے مزید چھیڑنا بہت تکلیف دہ ثابت ہوگا۔ بیڈ روم سے نکلا۔ ریلنگ کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا سیڑھی تک آیا۔ ستون پر چڑھ کر جنریٹر کے پَروں کو برابر رفتار سے گھومتا دیکھنے

لگا۔ دُنیا ایسے ہی ایک ہی رُخ پر گھومے چلی جارہی ہے۔ کوئی رُکاوٹ نہیں، کوئی تغیر نہیں۔ جنریٹر کے پَروں کی رفتار کا انحصار دریا کے پانی کے بہاؤ پر ہے، زمانے کے تغیر کا دارومدار انسانی ذہن کے تناؤ پر ہے۔

ایسے میں بے اختیار ڈاکٹر اَشولال اُس کی گنگناہٹ میں ڈھل کر اُسے سمجھانے لگا۔

پہلا دھیان محبت، ڈوجھا دھیان نہ کوئی

گز ڈوگز دی اپنے نال زمین نہ کوئی

گز ڈوگز دا اپنے نال اَسمان نہ کوئی

(محبت کے علاوہ ذہن میں کوئی اور خیال نہیں، پیروں تلے مختصر سا خطہ ارضی بھی نہیں، سر پر چھاؤں جتنا آسمان بھی نہیں......)

اُس کے لبوں پر گنگناہٹ کے ساتھ بڑی جاندار مسکراہٹ اُبھر آئی۔ آج زندگی میں پہلی مرتبہ اُس نے اپنے مُرشد کو صحیح پا کیا تھا۔ اُسے جھنجوڑا تھا۔ اُس کا منتشر ذہن اِس حقیقت پر متفق تھا کہ وہ جتنی بھی تنقید کرے، اَشو کو انسان دوستی سے پَرے ہٹانے کی قدرت نہیں رکھتا۔ پروفیسر بظاہر اُس کے ہر قول کی تردید کرتا تھا مگر دل سے اُس کا احترام کرتے ہوئے اُسے مسیحا تسلیم کرتا تھا۔

پروفیسر طویل عرصہ پہلے ڈاکٹر اَشولال کے حلقۂ احباب میں شامل ہوُا تھا، پھر کبھی بھی الگ نہ ہوسکا۔ مسلسل دریا بُرد ہونے والی کچے کی بستی ''رانواں'' کی سادہ لوح عورت بخت بی بی کی گود سے بے سپر انسان کی فلاح اور طبقاتی تقسیم کے خاتمے کی ننھی سی لو تھام کر شہر کے کالج میں پہنچنے والا ''اشرف شعاع'' کیسے اَشولال بنا، وہ جانتا تھا۔ یہ بھی جانتا تھا کہ بخت بی بی کیسے گاؤں کے داخلی راستے پر تمام دِن بیٹھ کر اپنے بیٹے کا انتظار کرتی تھی۔ نظر آنے پر کیسے خوشی سے چلا اُٹھتی تھی ''میرا اَشو آ گیا......میرا لال آ گیا......اڑی دیکھو تو میرا لال اَشو شہر میں رہ کر کتنا سوہنا ہوگیا ہے!''

اُسے علم تھا کہ ڈاکٹر اَشولال نے اپنی پوری زندگی پر ماں کے ہونٹوں سے نکلنے والے محبت بھرے الفاظ کی پہچان اوڑھا دی تھی۔ وہ اشرف شعاع کو لیڈ پنسل کے لکھے لفظوں کی طرح مٹا کر اَشو لال بن گیا تھا۔

وہی اُس توجہ اور التفات کا امین تھا جو اُس کے ماموں میاں غلام حسن کے پہلو میں اپنے بھانجے کیلئے ہر وقت ہمکتی رہتی تھی۔ وہ سرکاری سکول میں ہیڈ ماسٹر تھا۔ بہ خوبی جانتا تھا کہ نسلوں کا مزاج اور معیار تعلیم سے بدلتا ہے۔ اپنی بہن کی نسل میں اُسی نے تعلیم سرائت کی تھی۔ اُسی نے شفقت بھری انگلی تھمائی اور سکول اور کالج کی منزلیں طے کروائیں۔ اشرف شعاع سن چوہتر میں ملتان بورڈ ٹاپ کرنے کے بعد قائداعظم میڈیکل کالج میں مسیحائی کی سند لینے پہنچا جہاں سے نکلنے کے بعد اُس کی نظروں میں مال ومتاع اور اختیارات کی اہمیت سرے سے ختم ہوگئی اور وہ اَشولال بن گیا۔ مِٹا ہوُا وجود ارفع ذہن کے جلو میں ہر کوئی دیکھ سکتا تھا مگر خود پر گزرنے والے واقعات کا خبر رساں وہ خود ہی تھا۔

پروفیسر اُس الوہی محبت سے بھی ناواقف نہیں تھا جو ریشم کے کیڑے کی طرح اَشولال کے فقر کو سالوں بُنتی رہی، پھر خود ہی دَم گھٹنے کے باعث مر گئی۔ اَشولال نے نادیہ سے خود سے کٹ کر محبت کی تھی۔ اُس کے وجود کو ہی کائنات اور انسانیت قرار دے کر عبادت کا ہر حق ادا کیا تھا مگر وائے بد قسمتی! اُس کی محبت کا پلڑا دولت کے میزان پر بے ثقل ہو کر اَدھ فلک پر معلق ہو گیا اور نادیہ جہاں سے آئی تھی، وہیں لوٹ گئی یا لوٹا لی گئی۔

پروفیسر کی چشم تصور میں ڈاکٹر اَشولال کی محبت ''شناں'' لہرائی تو اُس کے لبوں پر پُرعقیدت مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ اَن دیکھے زخموں پر پھاہا رکھنے کیلئے اِس اُجڑی سلطنت میں اپسرائی وجود بن کر اُتری تھی۔ اُس کی پذیرائی نے اُسے تسلیم سے ''شناں'' بنا دیا اور اُس نے بھی اپنا یہ رُوپ بغیر کسی مزاحمت کے قبول کرتے ہوئے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ بہاولپور کے بچوں میں زیورِ تعلیم بانٹنے والی اَشو کی قسمت کا جھومر بن کر ماتھے پر سج گئی۔ دیکھنے والوں کو یہ سج دھج خیرہ کر دیتی تھی۔ پروفیسر وسیم بُزدار اپنی بہکی ہوئی رو میں بڑبڑایا ''بھابی! تم کتنی خوش بخت ہو کہ تاروں بھرا آسمان بھی تم پر رشک کرتا ہے۔ اَشو کو سہارا دیتے ہوئے تم دُنیا کو اپنی ایک مٹھی میں کئے بیٹھی ہو، دوسری مٹھی میں اُخروی زندگی کی کلید تھامے بیٹھی ہو...... خدا تمہارے 'ہنس' کو اَشو کا بلند کیا ہوُا علَم تھامنے اور تھامے رکھنے کی استطاعت بخشے......''

پھر جب اَشو نے بھٹائی، بلھے شاہ، خواجہ فرید اور میاں محمد کی سلطنتوں کی آوارگی کے ساتھ ساتھ مہاتما بُدھ کے نظریات اور مہا بھارت کو کنگھالنا شروع کیا، تب اَمن اور محبت کا مضبوط پرچارک بن کر شہرت کی دوام بلندیوں پر پہنچ گیا۔ آنے والے چند برسوں میں اُس کے نظریات کو عالمی سطح پر پذیرائی ملنے لگی اور اُس کے کاز کو ہر دانشور نے سراہا۔ پروفیسر کو خوشی کا احساس ہوتا تھا جب اتنے بڑے آدمی کو غیر معمولی سادہ پیرہن میں مُہانوں اور نچلی جاتی کے اختتام پذیر حلقوں کی بقاء کیلئے ہمہ جہت برسرِ پیکار دیکھتا۔ ایسے فولادی عزائم کے سامنے دُنیا کو بالآخر جھکنا پڑتا ہے۔

اُس نے مُرشد کی اجازت کے ساتھ اُس کی ایک کتاب ''گوتم نال جھیڑا'' کو اُردو زبان میں ڈھالنے کی کوشش کی تھی۔ چند اوراق نے ہی ترجمہ کرنے کی سکت چھین لی۔ اُسے پوری طرح احساس ہو گیا تھا کہ وہ اَشو لال کے عارفانہ کلام کی اصل لطافت اور گیرائی کو کھینچ نکال کر اپنے لفظوں میں منتقل کرنے میں بُری طرح ناکام ہو رہا ہے۔ دوسرا تجربہ اُس نے ''کاں وسوں دا پکھی اے'' پر کیا جس کا نتیجہ پہلے تجربے کی طرح حوصلہ افزاء ثابت نہ ہوا تو اُس نے اپنی عادت کے مطابق ہاتھ کھینچ لیا۔

کھانا تیار کر رہا تھا جب اُس کے موبائل پر افتخار بیگ کی کال موصول ہوئی۔ اُس نے پوچھا ''ہاں بھئی انجینئر! کہاں ہو؟''

''سر جی! میں بڑی مشکل سے پکی سڑک پر پہنچا ہوں۔ آگے پانی ہی پانی ہے۔ آپ تک پہنچنے کیلئے مجھے کیا کرنا ہوگا؟'' افتخار کی آواز سنائی دی۔

وہ کچن سے نکل کر جلدی سے عرشے پر آیا۔ دیکھا۔ افتخار کہیں بھی دکھائی نہیں دیا۔ بولا ''کیا تم پتن والی جگہ پر نہیں پہنچ سکتے؟''

''یہاں سے جنت تک پانی ہی پانی ہے، پتن دکھائی نہیں دیتا۔''

''سڑک پر پانی ہے؟''

''جی! سڑک کے اوپر سے پانی بہہ رہا ہے۔''

''یہاں تک کیسے پہنچے ہو؟''

''ایک ٹریکٹر والا چھوڑ کر گیا ہے۔''

پروفیسر گہری تشویش میں مبتلا ہوگیا۔ افتخار کو کیسے جنت میں لے کر آئے؟ اُس کی ریموٹ کنٹرول بوٹ پتن تک جاسکتی تھی۔ اُس سے آگے اُس کے پھنس جانے کا خطرہ تھا۔ خطرہ مول لینا پڑ رہا تھا۔ وہ فون میں بولا ''تم وہیں کھڑے رہو، دھیان کرنا کہ پانی میں سانپ بچھو نہ کاٹ لے، میں بوٹ لے کر آ رہا ہوں۔''

افتخار بیگ نے فون بند کر دیا۔ پروفیسر نے بوٹ کی ٹینکی میں پٹرول کی دو بوتلیں ڈالیں، ستون کے ساتھ لٹکتا ہوُا بانس تھاما اور بوٹ اسٹارٹ کر کے کھلے پانی میں آ گیا۔ اُس کا رُخ ٹاہلی کے بڑے درخت کی طرف تھا۔ یہ درخت پتن پر ایستادہ تھا۔ پانی کے تیز بہاؤ نے اُس کی کمر کو بھی خمیدہ کر دیا تھا۔ وہ بڑی احتیاط سے بوٹ کو ڈرائیو کرتا ہوُا درخت تک پہنچا۔ یہاں سے عام دِنوں میں سڑک دکھائی دیتی تھی۔ اَب دکھائی نہیں دے رہی تھی البتہ سڑک پر باہیں اُٹھا کر صدائیں دیتا ہوا افتخار بیگ نظر آ گیا۔ بوٹ جھکے ہوئے درخت کی شاخوں میں ٹکائی، بانس کی چوبھ سے پانی کی گہرائی کا اندازہ کیا اور بوٹ کو آگے بڑھا دیا۔ ایسے ہی پانی کو ماپ ماپ کر وہ نصف فاصلہ نہائت سست رَوی سے طے کرنے میں کامیاب ہوا۔ پانی کے غیر متوازن بہاؤ کی وجہ سے سیدھ میں چلنا ممکن نہیں تھا۔

سڑک سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر پہنچ کر بوٹ پر سفر جاری رکھنا مشکل ہوگیا۔ پانی کی گہرائی بہت کم ہوگئی تھی۔ اُس نے بیری کے ایک درخت کے ساتھ بوٹ کو باندھا اور پانی میں اُتر آیا۔ یہاں پانی گھٹنوں تک گہرا تھا البتہ اُس کا بہاؤ غیر معمولی حد تک تیز اور خطرناک تھا۔ پیر چکنی دلدلی مٹی میں دھنس رہے تھے۔ بانس کی مدد سے وہ نصف گھنٹے میں افتخار تک پہنچا اور ہاتھ ملا کر ہانپنے لگا۔

چند منٹ ستانے کے بعد واپسی کا قصد کیا جو نسبتاً سہل ثابت ہوُا کیوں کہ قدموں نے راستہ بھانپ رکھا تھا۔ جنت میں قدم رکھتے ہی افتخار بیگ نے عافیت بھرا سانس لیا، ٹھٹکا اور بولا ''سر جی! آپ کے احترام میں آج تک خاموش رہا مگر دِل ہی دِل میں حالات سے آپ کے فرار کو بے جا قرار دیتا رہا۔ آج دل سے قائل ہو کر کہتا ہوں کہ آپ واقعی بہت عظیم ہیں۔ دُنیا عظیم نہیں ہے۔''

پروفیسر نے سر جھٹکا اور بغیر جواب دیے کچن کا رُخ کیا۔ کھانا تیار کرنے کے بعد ٹیبل پر سجا دیا۔ افتخار بیگ نے اِس دوران منہ ہاتھ دھو لیا تھا۔ دونوں نے خاموشی سے شکم سیر کیا اور چائے پینے کے

دوران پروفیسر نے سیگرٹ سلگاتے ہوئے کہا ''اگر تم مناسب سمجھو تو اپنے فرار کا سبب بتلا دو۔ ممکن ہے کہ تمہارا فیصلہ سرے سے غلط ہو جسے تم اپنی اُبالی فطرت میں درست قرار دے کر انتہائی قدم اُٹھانے پر مجبور ہو گئے ہو۔''

افتخار کے بدن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ کرسی کی پشت چھوڑ کر سیدھا ہو بیٹھا۔ ٹیبل پر پڑے پروفیسر کے سیگرٹ کیس سے سیگرٹ نکال کر سلگانے لگا۔ محبوب کے پہلے بوسے کی طرح سیگرٹ کا پہلا کش بدن کے نظام کو تہس نہس کر دیتا ہے۔ اُسے کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ کھانستے کھانستے بے حال ہونے لگا مگر کش پر کش لیتا رہا۔ آنکھوں میں فرطِ جذب سے آنسو آ گئے۔ جدائی کے دُکھ کی آمیزش نے آنسوؤں کو چھلکا دیا۔ چہرے پر دونوں ہاتھ رکھ کر رونے لگا۔ پروفیسر نے اُس کا کندھا تھپتھپایا، طعنہ زن ہوُا ''بیٹا! مرد رونے کیلئے نہیں، آنسو پونچھنے کیلئے بنے ہیں۔ آنسوؤں کو لگام دو، روتے ہوئے تم ہرگز اچھے نہیں لگ رہے ہو۔''

افتخار نے ہاتھ ہٹائے اور شکوہ کناں لہجے میں بولا ''سچ کہیں سر! آپ کبھی نہیں روئے؟''

پروفیسر نے نفی میں سر ہلایا، پھر خیال آیا کہ بے مقصد جھوٹ بول کر وہ گنہ گار ہو رہا ہے، اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا ''مگر میں کسی کے سامنے آج تک نہیں رویا۔''

''مجھ سے یہ منافقت بھی نہیں ہو پا رہی سر جی!'' افتخار کا لہجہ بھرایا ہوُا تھا۔

پروفیسر نے کہا ''میں سمجھتا ہوں کہ تم کسی ہیجان انگیز واقعے کے عینی شاہد بن کر آ رہے ہو۔ ایسا ہی ہوتا ہے۔ انسان کو کوئی ایک واقعہ، کوئی ایک انسان یا کوئی ایک جذبہ اتنا تغیر فراہم کر دیتا ہے کہ اُسے خود پر بھی اختیار نہیں رہتا۔ کیا تم محبت کی پاداش میں روئے ہو؟''

وہ خاموش رہا۔ خاموشی کو اقرار سمجھنے میں پروفیسر نے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔

''وہ کہاں ہے؟'' پروفیسر نے سوال داغا۔

''وہ کون؟'' افتخار کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

''وہ، جس نے تمہیں یہاں بھیجا ہے۔''

ایک ہی لمحے پر جیسے وقت رُک گیا ہو، افتخار بیگ کی سانس ٹھہر گئی ہو، دل نے دھڑکنا بند کر دیا ہو۔

بولا ''مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا سوائے جنت کی پر سکون تنہائی کے۔ میں زمانے کی ناانصافی کا شکار ہو گیا ہوں سر جی! جس وجود کو اپنی ذات کے فلک پر چاند کی طرح بچپن سے آج تک سجائے رکھا، وہی دولت اور اختیارات کی خیرہ کن چمک پر للچا کر ضلع ناظم کے بیٹے کی گود میں اُتر چکی ہے۔ یوں کہ اُس نے اپنے اُجلے ہالے کی شکستگی پر بھی دھیان نہیں ڈالا۔ خاندان کی بدنامی اور میری آزردگی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے وہ سردار شہاب خان کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی ہے۔ اِس کے باوجود کہ اُس کے باپ نے اُسے شہاب خان سے شادی کی اجازت دے رکھی تھی......''

پروفیسر کو اُس کی لو اسٹوری کا علم نہیں تھا مگر نتیجہ سُن کر سُن رہ گیا۔ بہ دقّت تمام گویا ہوُا ''ذرا تفصیل کے ساتھ بتلاؤ۔''

''بتلانے کا کچھ فائدہ نہیں مگر آپ جیسے مہربان استاد سے کچھ چھپانا خیانت کے مترادف ہوگا۔ سنئے!'' افتخار نے کہا اور سر جھکا کر اپنا غبارِ دل ہلکا کرنے لگا۔ پروفیسر کا انہاک قابلِ دید تھا۔ شاید مصباح کے ذکر میں اُسے مریم اور رُباب کی شبیہیں میسر آ رہی تھیں......

کہانی ختم ہوئی تو وہ اُٹھا اور افتخار کے نہائت قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ اپنے ہاتھوں سے اُس کے آنسو پونچھتے ہوئے بھرائے ہوئے لہجے میں کہنے لگا ''دُنیا کے فلسفیوں نے، شاعروں اور اَدیبوں نے نہائت غلط نظریہ اتنے تواتر سے پیش کیا کہ آج کا ہر مرد یہ کہنے پر مجبور ہو گیا ہے کہ عورت کی معیت کے بغیر وہ نامکمل اور اَدھورا ہے۔ اِسی خام نظریے نے محبت اور عشق جیسی خرافات پیدا کر دی ہیں جنہوں نے مرد کو آہنی شکل سے پگھلا کر موم میں ڈھال دیا ہے۔ بدنی اور معاشرتی ضرورت کو اَن گنت شاعرانہ نام دے کر اِس کی اہمیت کو دوچند کر دیا ہے۔ عورت کے حسن پر بہت کچھ لکھا گیا۔ فطری کمزوریوں کے سبب پیدا ہونے والی نرمی اور گداز کو حسن کا استعارہ بنا کر عورت کی اہمیت کو خاصا بڑھا دیا۔ تم بھی اِسی عقیدے کی بھینٹ چڑھ گئے ہو۔''

افتخار کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ جانے والی سمجھ کی تمام تر صلاحیتیں اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے لفظ لفظ کرید کر بولتے ہوئے پروفیسر کو دیکھتا رہا۔ پروفیسر اپنی ہی رو میں بھٹکتا جاتا تھا ''افتخار! تم نے کوئی جرم نہیں کیا، کوئی غلطی نہیں کی۔ ایسی صورت میں رونا تمہارا مقدر نہیں ہونا

چاہیے بلکہ اُس بدصورت اور اَدھوری عورت کو رونا چاہیے، پچھتانا چاہیے جو تمہارے وجود پر کسی اور کو ترجیح دے کر تمہیں توڑنے کے جرم کا ارتکاب کر چکی ہے۔ میں یہی کہتا ہوں کہ عورت وجہ فساد ہے، وجہ انتشار ہے۔قریب ہو تو جذبات میں ہر دم انتشار پیدا کرتی رہتی ہے۔ دور ہو تو قریب بلانے کیلئے لالچ دیتی رہتی ہے۔ ضلع ناظم کا بیٹا اُسے بھگا کر لے گیا، میرے خیال میں اُس کیلئے یہی سزا کافی ہوگی کہ اُسے تمہاری محبوبہ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ عرصہ تک رہنے دیا جائے۔ اگر تمہیں اپنے ذہن پر اختیار حاصل ہے تو اُٹھو، جشن مناؤ، خوشیاں مناؤ کہ تم ایک بہت بڑے سانحے سے بچ گئے ہو۔ لیٹ اَس انجوائے دِس مومنٹ ڈیئر!''

پروفیسر نے اُس کا ہاتھ تھاما اور کھینچتے ہوئے سٹڈی روم میں لے گیا۔ وہ بادلِ نخواستہ اُس کے ساتھ گھسٹ رہا تھا۔ پروفیسر نے کمپیوٹر آن کیا۔ ایک جذبات انگیز ویب سائٹ کھولتے ہوئے کہا''دیکھو جوان! یہ سب دُنیا کے مختلف معاشروں کی عورتیں ہیں جنہیں ماڈل بنا کر مردوں کی نظروں میں پیش کیا جاتا ہے۔ دیکھو! اِن برہنہ قامتوں کو دیکھو۔ کیا یہ مردوں کو پھانسنے کے اشتہار نہیں ہیں؟ یہی وہ فلسفہ ہے جسے سمجھنا بہت مفید اور نہ سمجھنا قیامت ثابت ہوتا ہے۔ یہی وہ وجود ہے جس کے گداز اور کشش پر مختلف زبانوں کے شاعروں نے اَن گنت کتابیں لکھ چھوڑی ہیں۔ مگر یہ ہے کیا؟ بہ غور دیکھ کر سمجھنے کی کوشش کرو۔ تم انجینئر ہو۔ قدرت کی انجینئرنگ کو ملاحظہ کرو گے تو فوراً سمجھ جاؤ گے کہ یہ سب ایک جیسی ہیں۔ ہیں ناں؟ کوئی فرق نہیں ہے۔ پھر جب یہی فزیبیلٹی ہماری معاشرتی اقدار کے پروردہ اسرار میں لپٹ جاتی ہے تو اشتہا انگیز ٹفن بن جاتی ہے جس کے بارے میں یہ پتہ نہیں ہوتا کہ اِس میں موجود لنچ کا مینو کیا ہے؟ وہ بھی ایسی ہی ہے......سب کے جیسی۔ بس تمہاری نظر اور ذہن میں اُترنے والی بار بار کی فیڈنگ نے تمہیں جذباتی بنا دیا اور تم نے یہ سوچا کہ مصباح نہیں تو دُنیا میں کچھ بھی نہیں۔ ہیں؟ میں غلط نہیں کہتا، درست کہتا ہوں۔ تم سمجھنے کی کوشش کرو گے تو یہ اسرار قبل اَز وقت کھل جانے والے گفٹ پیک کی طرح بے وقعت ہو جائے گا۔''

افتخار کا جیسے سانس سینے میں کہیں اَٹک گیا ہو۔ ہوش رُبا قیامتیں دیکھ کر کن اکھیوں سے پروفیسر کے چہرے کو دیکھا جہاں سوائے سنجیدگی کے کچھ بھی دکھائی نہیں دیا۔ ایک لڑکی کے فوٹو گراف پر ماؤس کا

پوائنٹر روکتے ہوئے پروفیسر نے کہا ''اِسے دیکھو بیٹا! یہ یورپین لڑکی ہے۔ اِس کے بالوں کی شائننگ دیکھو کہ ٹراؤٹ بھی تھم تھم کر دیکھنے پر مجبور ہو جائے، اِس کی پلکوں کا خم دیکھو کہ چنگیزی تلوار کی کاٹ یاد آ جائے، اس کے کندھوں کی ملائم جلد کی چمک دیکھو کہ نظر ٹکنے کا نام نہیں لیتی، اِس کے بھرے بھرے سرخ ہونٹوں کی عمودی لکیروں پر توجہ دو تو توجہ ہٹنے کا نام ہی نہیں لے گی، اس کا بے سلوٹ، آنکھوں کو خیرہ کرنے والا وجود ملاحظہ کرو اور دل ہی دل میں موازنہ کرو کہ کیا تمہاری مصباح اِس سے زیادہ خوبصورت ہے؟ میں جانتا ہوں کہ تم طرفداری کرو گے اور تمہاری سوئی ہمیشہ مصباح پر اَٹکی رہے گی کیونکہ یہ یورپین لڑکی پوری کی پوری تمہاری نگاہوں کے سامنے ہے جبکہ اُس نے چہرے کے بعد آج تک کچھ بھی نہیں دکھایا۔ یہی اسرار کہ وہ کیسی ہوگی، تمہیں اُس کا دیوانہ بنائے رکھے گا۔ میں تمہیں دوشی نہیں ٹھہراتا کیوں کہ تم نے مذہب کے بعد اِسی عقیدے کو اَن گنت زاویوں سے پڑھ رکھا ہے۔ اتنی مرتبہ کہ وہ تمہارے لاشعور میں جاگزیں ہو گیا ہے جو نوچے سے بھی جان نہیں چھوڑتا۔ میں چھت پر جا رہا ہوں، تم اِس اسرار سے جان چھڑانے کی عملی کوشش کرو۔''

پروفیسر سانس لینے کو رُکا، پھر اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مضبوط لہجے میں بولا ''مجھے یقین ہے کہ غور کرنے پر تم میرے ہم خیال بن جاؤ گے۔ آئی کیئر اِباؤٹ یو مائی سن!''

پروفیسر نے ماؤس پر سے ہاتھ اُٹھالیا اور بلا جواز ہاتھ جھاڑ کر سٹڈی روم سے نکل کر چھت پر جانے کیلئے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ ڈھلتی سہ پہر کی دھوپ میں غیر معمولی تپش تھی۔ دریا سے اُٹھنے والی ہوا میں نم ناک ٹھنڈک تھی۔ زندگی ایسے ہی امتزاج کا نام ہے۔ اوپر سے گرم گرم، نیچے تہہ میں فریب آگیں یخ بستگی لئے ایک دم موت کی طرح ساکت و سرد۔

......

اپنے محبوب کی برتھ ڈے پارٹی میں شمولیت اور اپنی نمائش کی غرض سے گھر سے نکلنے والی گھر گھراتے پنکھے تلے پختہ فرش پر آڑھی ترچھی لیٹی ہوئی تھی۔ اُس کی بے ہوشی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے شہاب اپنے ساتھیوں کے ساتھ موبائل فون پر مشاورت کر رہا تھا۔ اُنہیں سمجھا رہا تھا کہ آگے کیا

کرنا ہے......خود سمجھ رہا تھا کہ لوہے کو موڑنے کیلئے کس حد تک گرم کرنا چاہیے۔ ایسے میں بے ہوش پڑی مصباح کا بدن کسمسانے لگا۔ شہاب بغیر کوئی لمحہ ضائع کئے اُٹھا اور اُس نے موبائل فون بند کئے بغیر دروازے اور فرش کے درمیانی خلا سے باہر کھسکا دیا۔ پلٹ کر مصباح کے قریب آ کر اکڑوں بیٹھ گیا اور اُس کے لبوں پر چپکی ہوئی ٹیپ اُتارنے لگا۔ ٹیپ کی گم کے ساتھ لبوں کے اطراف کی باریک لوئیں کھنچنے لگیں۔ تکلیف کے مارے وہ سسکاری بھر کر اُٹھ بیٹھی۔ بے اختیار اپنے دونوں ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ ہتھ کڑی دکھائی نہیں دی۔

پھر اپنے محبوب کو دیکھا۔ پریشانی کے عالم میں اُس سے چمٹ گئی۔ سسکیاں لے کر رونے لگی۔ اپنے انجام کے بارے میں دریافت کرنے لگی۔ شہاب نے مایوس لہجے میں بتلایا کہ وہ اَبھی تک سرکاری اہلکاروں کی گرفت میں ہیں۔ اُس نے تشویش ناک انداز میں یہ بھی بتایا کہ وہ آئی بی کے ہیڈ کوارٹر کے ایک پوشیدہ کمرے میں عارضی طور پر بند کئے گئے ہیں۔ مصباح یہ سُن کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ پرس کو سنبھالا، دکھائی نہیں دیا تو آنسوؤں کے گرنے کی رفتار میں اضافہ ہو گیا۔ پرس کے ساتھ اُس میں رکھا ہوا موبائل فون بھی غائب ہو چکا تھا۔ وہ کسی کے ساتھ رابطہ نہیں کر سکتی تھی۔ شہاب نے مایوسی کے عالم میں سر ہلاتے ہوئے کہا ''اُن کمینوں نے میرا موبائل بھی چھین لیا ہے۔ افسوس! اَب میں کسی سے رابطہ نہیں کر سکوں گا۔''

مصباح اُس کے سینے سے لگی رو رہی تھی۔ روتے روتے کہہ رہی تھی ''مجھے نہیں پتہ تھا کہ تم ضلع ناظم کے بیٹے ہو، تم نے کبھی بتایا بھی تو نہیں تھا۔ تمہارے باپ نے تم پر آئی ہوئی مصیبت کے بارے میں سُنا اور کچھ نہیں کیا، مجھے حیرت ہے۔''

شہاب نے باپ کی صفائی پیش کی ''بابا کو میں نے تمہارے نام سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ اَب غلطی کا احساس ہوتا ہے مگر کچھ کیا نہیں جا سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ جب بابا کو میرے غیاب کا پتہ چلے گا، تب وہ زمین آسمان ایک کر دے گا اور میری مدد کیلئے پہنچ جائے گا۔''

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی ''مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ لگتا ہے ہماری مدد کیلئے کوئی بھی نہیں پہنچ پائے گا اور......اور...... ہائے اللہ! میں اور میرا خاندان تباہ ہو گیا۔ اگر جلدی رہائی نہ ملی تو ہر کوئی

ہمارے خاندان پر تھوتھو کرے گا۔ مجھے گھر سے بھاگی ہوئی قرار دے کر میری ماما اور پاپا کا جینا حرام کردے گا...... ہائے! یہ کیا ہو گیا شہاب! کچھ کرو ورنہ میرے بھائی پاگل ہو جائیں گے...... وہ اتنی بڑی بے عزتی برداشت نہیں کر پائیں گے۔ میں نے بڑی غلطی کی جو تمہارے ساتھ چلی آئی......''

دونوں کی کلائیاں خالی کردی گئی تھیں۔ اُنہیں وقت کا بالکل اندازہ نہیں تھا کہ وہ کتنی دیر سے یہاں موجود ہیں۔ شہاب کا خیال تھا کہ اُنہیں لاک اَپ میں پڑے دو گھنٹے گزر چکے ہیں۔ اِس کا مطلب تھا کہ مصباح کو بے ہوش ہوئے اڑھائی گھنٹے یا اِس سے زیادہ وقت گزر چکا تھا۔

اچانک دروازے کے باہر قدموں کی بھاری چاپ اُبھری۔ آنے والے ایک سے زیادہ تھے۔ لاک کھلنے کی آواز سنائی دی۔ دروازہ کھلا۔ دونوں ایک ہی وقت میں کھڑے ہوئے اور دروازے کے بیچ ریوالور تھامے کھڑے آفیسر کو سراسیمہ نگاہوں سے گھورنے لگے۔ آفیسر کے عقب میں وہی دونوں اہلکار خونچکاں نظروں سے اُنہیں دیکھ رہے تھے۔ مصباح ڈر کر غیر ارادی طور پر شہاب کے پیچھے چھپنے کی کوشش کرنے لگی۔ آفیسر نے غرا کر کہا ''سامنے کھڑی رہو ورنہ گولی ماردوں گا۔''

شہاب نے مزاحمت دکھائی ''مگر آفیسر ہمیں ہمارا قصور تو بتلا دو۔ ہم دونوں شریف خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمارے یوں اغوا نما غیاب سے ہماری خاندانی ساکھ تباہ و برباد ہو جائے گی۔''

آفیسر کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ تیرنے لگی ''تم دونوں کو ہم نے نازیبا حرکات کرتے ہوئے علاقے کے معززین کی موجودگی میں عین موقع پر پکڑا ہے۔ دو تین دِنوں کے ریمانڈ کے بعد تمہیں کورٹ میں پیش کیا جائے گا۔ میڈیا کو دعوت دی جائے گی۔ بتلایا جائے گا کہ نام نہاد شریف خاندانوں کے لڑکے اور لڑکیاں کیا گل کھلاتے ہیں۔''

مصباح کا رَنگ پیلا پڑ گیا۔ شہاب نے جلدی سے کہا ''ہم نے کوئی نازیبا حرکت نہیں کی اور نہ ہی کسی معزز آدمی کی موجودگی میں تم نے ہمیں پکڑا ہے۔''

''معصوم بچے! ایسے اَن گنت معززین ہر وقت ہماری جیب میں پڑے اینڈتے رہتے ہیں۔ اُن کی فکر نہ کرو، اپنی فکر کرو۔''

''مگر اِس سے تمہیں کیا حاصل ہوگا؟'' شہاب نے مصباح کو غیر محسوس انداز میں پکڑ کر اپنے پیچھے

کرتے ہوئے تشویش آمیز لہجے میں کہا۔

''پیسہ!'' وہ کراہت آمیز ہنسی ہنسا ''تمہارے باپ کے سیاسی مخالفین دونوں ہاتھوں میں نوٹوں بھرے بریف کیس پکڑ کر ہمارے آگے پیچھے پھر رہے ہیں۔ اِدھر تم کو عدالت میں مجرم بنا کر پیش کیا، اُدھر تمہارے باپ کی سیاست چوپٹ...... ہاہ! کتنا مزہ آئے گا جب لیلیٰ مجنوں کی جوڑی اخباروں اور چینلز کے کیمروں کے سامنے کھڑی ہوگی اور پورا مُلک دیکھ رہا ہوگا۔''

''تمہیں کتنا پیسہ چاہیے؟'' شہاب نے بے بسی سے کہا۔

''دو کروڑ روپے!'' آفیسر نے عجیب سے انداز میں ہنستے ہوئے کہا ''کیا تمہاری اتنی اوقات ہے؟''

''یہ تو بہت بڑی رقم ہے۔'' شہاب کے منہ سے نکلا۔

''اتنی بڑی بھی نہیں کہ تمہارے باپ کے سیاسی دُشمن مل کر اَدا نہ کر سکیں۔'' آفیسر نے ریوالور والا ہاتھ لہراتے ہوئے کہا ''ہم ڈیوٹی پر جا رہے ہیں۔ رات کو کسی پہر میں ہماری واپسی ہوگی۔ تمہیں بن نکاح کے سہاگ رات منانے کی اجازت ہوگی، پھر شاید موقع نہیں ملے گا۔ کل ملیں گے، تب تک کیلئے گڈ بائی!''

شہاب کے روکنے اور مصباح کی منت سماجت کرنے کے باوجود آکر ڈرانے دھمکانے والے دروازہ مقفل کر کے چلے گئے۔ وہ زیرِلب گالیاں دیتے ہوئے دروازہ پیٹنے لگا۔ تھک کر بے دم ہو گیا تو دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ دل ہی دِل میں شکر کر رہا تھا کہ اُس کے ساتھیوں نے اُنہیں اِس کمرے میں قید کیا تھا۔ پوری حویلی میں اٹیچڈ باتھ والا یہی اکلوتا کمرہ تھا۔ کچھ دیر تک سر جھکائے بیٹھا رہا پھر اُٹھ کر باتھ روم میں گھس گیا۔ وہ دل ہی دل میں فرخ اور بابر کے فول پروف انتظامات کو سراہ رہا تھا۔ اُنہوں نے عام سی حویلی کے ایک کمرے کو آئی بی کے ہیڈ کوارٹر کا کمرہ ثابت کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا۔ غلے والے کمرے میں چلتا ہوُا آٹو ریورس ٹیپ پلیئر ایک تسلسل کے ساتھ دفتری ماحول کی مخصوص آوازیں فضا میں بکھیر رہا تھا۔ مصباح کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ کسی سرکاری عمارت کے بجائے فرخ کے زرعی فارم کے عین وسط میں واقع حویلی کے ایک کمرے میں

مقید ہے۔ زیرلب مسکرایا۔ اُسے اپنے ساتھیوں کے جسموں پر سجی ہوئی یونیفارم کے خیال پر ہنسی آئی تھی۔

اندازے کے مطابق دوپہر ہو چکی تھی۔ مصباح اتنی زیادہ پریشان تھی کہ اُسے بھوک کا قطعی احساس نہیں ہو رہا تھا۔ اُسے رہ رہ کر اپنی غلطی پر پچھتاوا ہو رہا تھا۔ اُسے یوں منہ اُٹھا کر شہاب کے ساتھ لانگ ڈرائیو پر نہیں نکلنا چاہیے تھا۔ پکڑ کر قید کرنے والوں کی دھمکی سیدھی دل پر اثر کر رہی تھی اور ندامت کے ہتھوڑوں سے مسلسل ضربیں لگا رہی تھی۔ جب اُسے ایک مجرمہ کی حیثیت سے کٹہرے میں کھڑا کیا جائے گا، میڈیائی لوگ طرح طرح کے سوال پوچھیں گے اور اُس کے والدین اور بھائی ندامت سے عدالت کے فرش میں گڑے جائیں گے تب کیا وہ زندہ رہ پائے گی؟ اُس نے اپنی زندگی میں کبھی بھی ایسی ذلت کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ اُس نے ماما کو بتلایا تھا کہ وہ دوپہر تک لوٹ آئے گی۔ دوپہر ہو چکی تھی مگر واپسی کی ہر راہ مسدود دکھائی دے رہی تھی۔

ایسے میں صرف شہاب ہی بچاؤ کی کوئی صورت نکال سکتا تھا مگر وہ دیکھ رہی تھی کہ شہاب کی حالت اُس سے بھی زیادہ دگرگوں ہو گئی تھی۔ ایسی کیفیت میں رہ کر وہ کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں تھا۔ مصباح کی آنکھیں اور ذہن اپنی پوری رفتار سے کام کر رہا تھا۔ نہ ہی اشک تھمتے تھے، نہ ہی کوئی ترکیب سجھائی دیتی تھی۔ کافی دیر تک دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے، پریشان ذہنوں میں آنے والے وقت کی تکلیف دہ صورت کو ملاحظہ کرتے رہے اور ایک دوسرے پر اپنی پریشانیوں کا اظہار کرتے رہے۔ ایسے میں پھر دروازے پر قدموں کی آہٹ اُبھری۔ دونوں تن کر بیٹھ گئے۔ قفل کھول کر کمرے میں داخل ہونے والا اکیلا تھا۔ وہ سرکاری یونیفارم میں ملبوس تھا جبکہ اُس کے ہاتھ میں گن کے بجائے چھوٹا سا پستول دَبا ہوَا تھا۔

اُس نے اپنے عقب میں دروازہ بند کیا، احتیاط سے اُن کے قریب آیا اور بولا ’’مجھے افسوس ہے شہاب خان کہ محکمے نے تمہاری حیثیت کو مدنظر نہ رکھتے ہوئے اِس صورتِ حال سے دوچار کر دیا۔ میں تمہارے باپ کا نمک خوار ہوں مگر سردار سائیں کے دیرینہ مخالف چوہدری امتیاز رفیق نے اتنا مضبوط ہاتھ ڈالا ہے کہ میں کچھ بھی نہیں کرسکتا۔‘‘

شہاب نے چونک کر اُسے دیکھا۔ بولا ''تم کون ہو؟''

''میرا نام صادق حسین ہے۔ اِسی علاقے کا رہنے والا ہوں۔ تمہیں اور اِس لڑکی کو گرفتار کرنے اور مقدمہ بنا کر عدالت میں پیش کرنے کے احکامات اوپر سے جاری کئے گئے ہیں اِس لئے یہاں کی تمام انتظامیہ بے بس ہے۔ کاش! میں تمہارے لئے کچھ کر سکتا۔'' صادق حسین نامی باریش اہلکار نے مایوسی سے کہا۔

مصباح نے اُس کے لہجے میں خلوص اور ہمدردی کو محسوس کرتے ہوئے منت آمیز لہجے میں کہا ''انکل! خدا کیلئے کچھ کیجئے ورنہ میں جیتے جی مر جاؤں گی۔ میرے گھر والے بھی زندہ نہیں رہ پائیں گے۔''

صادق حسین نے تسلی دینے کے انداز میں کہا ''یہاں سے نکلنے کی کوئی ترکیب نہیں ہے۔ سکیورٹی خاصی ٹائٹ ہے۔ پرندہ بھی پر مارنے کی غلطی کرتا ہے تو اُس کی گردن ماردی جاتی ہے۔ تمہیں اگر کمرے سے نکال بھی دوں تو تم دونوں گولیوں کا نشانہ بن جاؤ گے۔'' وہ اُن کے قریب ہی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور اپنی داڑھی میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ مصباح نے دیکھا کہ وہ واقعی اُن کیلئے خاصا پریشان تھا۔

شہاب چوہدری امتیاز رفیق کی اِس سازش کے بارے میں اُسے کریدتا رہا مگر صادق حسین کو محض اتنا ہی معلوم تھا جتنا وہ پہلے ہی بتا چکا تھا۔ تینوں سر جوڑ کر باہر نکلنے کی ترکیب سوچنے لگے۔ کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایسے میں صادق حسین کے چہرے پر خوشی کا عکس لہرایا اور اُس نے دَبے دَبے جوش میں کہا ''ایک زبردست آئیڈیا سوجھا ہے۔ نہ جانے تم لوگ اس پر عمل پیرا ہو گے یا نہیں۔''

مصباح نے جلدی سے پوچھا ''وہ کیا؟''

''تم پر جو کیس بنایا جا رہا ہے اُس کا ایک ہی جواب ہو سکتا ہے کہ تم دونوں اپنا نکاح نامہ پیش کر دو۔ چونکہ تمہاری اَبھی تک شادی نہیں ہوئی، اِس لئے تم ایسا نہیں کر سکو گے اور قانونی موشگافیوں میں الجھتے چلے جاؤ گے۔ میں نے یہ ترکیب سوچی ہے کہ آفیسر اور اُس کے ساتھیوں کے آنے سے پہلے پہلے اگر تم لوگوں کا نکاح ہو جائے، رجسٹر میں اندراج ہو جائے تو تمہاری جان چھوٹ سکتی ہے۔

نکاح نامے کی کاپی دیکھ کر وہ تمہیں عدالت میں لے کر جانے کی غلطی نہیں کریں گے۔'' صادق حسین نے شہاب خان کے کانوں کے قریب کھسر پھسر کی۔آواز اتنی بلند تھی کہ مصباح بھی بہ آسانی سن رہی تھی۔شہاب نے حیرت سے پوچھا''اتنی سی دیر میں نکاح کیسے ہوسکتا ہے؟''

صادق حسین نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے انگلی پر انگوٹھے کی مخصوص حرکت سے واضح کیا کہ پیسہ ہر مرض کی دوا ہوتا ہے۔شہاب نے دریافت کیا'' کتنے پیسوں سے کام چل جائے گا؟''

''پانچ دَس ہزار روپے تو نکاح رجسٹرار بٹور لے گا۔ یہاں موجود عملے کا منہ بھی بند کرنا ہوگا۔میری خیر ہے، میں تو تمہارے خاندان کا پرانا نمک خوار ہوں اور سردار ارباب خان نے آج تک میرا حق نہیں رکھا بلکہ میری سوچ سے زیادہ دیا ہے۔'' صادق حسین کے لہجے میں خاصی پختگی تھی''ہیڈکوارٹر کی عمارت کے عقب میں ایک بوڑھا نکاح رجسٹرار رہتا ہے۔کہو تو اُسے بلا لیتا ہوں۔ وہ اپنے رجسٹر سمیت یہاں آئے گا اور تم دونوں کا نکاح پڑھا دے گا۔ میں باہر جا کر چند معزز لوگوں کی گواہی ڈال کر کام پکا کر دوں گا۔اُن کے آنے سے پہلے تمہارے ہاتھ میں نکاح فارم کا ایک پرت موجود ہوگا جو ہیڈکوارٹر سے باعزت نکلنے کا پروانہ ثابت ہوگا۔ میں دس پندرہ منٹ کے بعد آتا ہوں،تم دونوں صلاح ومشورہ کرلو۔ بعد میں نہ کہنا کہ صادق حسین نے کوئی مدد نہیں کی تھی۔''

وہ اُنہیں سمجھاتا ہوُا کمرے سے نکل گیا۔ جاتے ہوئے کمرے کو مقفل کرنا نہیں بھولا تھا۔شہاب نے شرمساری سے مصباح کی طرف دیکھا۔کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔مصباح بولی'' کیا سوچ رہے ہو؟ جو بھی کرنا ہے،جلد کرو اور یہاں سے نکلو ورنہ میں پاگل ہوجاؤں گی۔''

شہاب نے کچھ کہنے میں تامل کیا تو وہ بہ مشکل خود پر قابو پا کر بولی'' کیا اُس نے جو کچھ کہا ہے، وہ قابلِ عمل ہے؟''

''قابلِ عمل تو ہے مگر......''

''اگر مگر نہ کرو کیونکہ ہمارے پاس کرگزرنے کا وقت کم ہے۔اُس کی بات مانو اور یہاں سے نکلنے کی سوچو۔'' مصباح نے جلدی سے کہا۔

''مگر مصباح! یہ مناسب نہیں ہے کہ ہم اتنے اچھے کام کو یوں چوروں کی طرح سرانجام دیں۔

نکاح بچوں کا کھیل نہیں ہے۔'' شہاب نے تذبذب آمیز لہجے میں کہا۔

''تو کیا خود کو تماشا بنانے کا ارادہ رکھتے ہو؟'' مصباح نے تلخی سے کہا ''تم مرد ہو، تمہارے بدن پر بدنامی گرد کی طرح پڑے گی۔ میرے بدن پر زخم کے نشان کی طرح ہمیشہ کیلئے چپک جائے گی۔ تمہیں اگر اِس طرح میرے ساتھ نکاح پڑھوانے پر اعتراض ہے تو خوشی مجھے بھی نہیں ہے۔ بے شک یہاں سے نکلتے ہی طلاق دے دینا، مجھے اعتراض نہیں ہوگا۔'' مصباح کا پارہ چڑھنے لگا تھا۔ اُسے یہاں سے نکلنے کا ایک راستہ سجھائی دیا تھا، بھلے وہ راستہ موت کی کھائی سے گزر کر ہی باہر نکلتا تھا، وہ کود جانا چاہتی تھی۔

شہاب نے بے بسی سے کندھے اُچکائے، بولا ''تم کہتی ہو تو مان لیتا ہوں وگرنہ......''

مصباح نے اُسے تند نگاہوں سے گھورا تو وہ کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔ چند منٹوں کے بعد صادق حسین نے قفل کھول کر اندر جھانکا، سوالیہ نگاہوں سے پوچھا۔ شہاب نے کہا ''تم اُس نکاح رجسٹرار کو یہاں لے آؤ۔ کوئی قانونی سقم نہیں رہنا چاہیے اور ہاں! سر دست میرے پاس اتنی رقم نہیں ہے۔ باہر نکلتے ہی تمہارا منہ نوٹوں سے بھر دوں گا۔ کیا مجھ پر اعتماد کرتے ہو؟''

اُس نے باچھیں چیر کر مسکراتے ہوئے کہا ''تم بیٹوں کے برابر ہو، باپ برابر شخص کو دھوکہ دے کر کہاں تک جا سکو گے؟ میں نے تمہیں بتایا ناں کہ تمہارے باپ کے مجھ پر بڑے احسانات ہیں، میں اُن احسانات کے باعث اپنے محکمے کو دھوکہ دینے پر مجبور ہوں۔ مجھے پیسوں کی فکر نہیں ہے، تمہارے مستقبل کی فکر ہے۔''

وہ دروازہ مقفل کر کے چلا گیا۔ شہاب نے آہ بھر کر مصباح کی طرف دیکھا۔ بڑبڑایا ''ہمارا نکاح یوں ہوگا، میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ میں تو چاہتا تھا کہ ہم جب ایک لڑی میں دو موتیوں کی طرح پروئے جائیں تو دُنیا اُس خوبصورت لمحے کا نظارہ کرے اور ہر وجود رقص کی تال پر تھرکتا ہوا پاگل ہونے کو آ جائے۔ مبارک باد کے شور میں میں تمہیں اپنے دِل میں ہمیشہ کیلئے بساؤں......آہ! نہ جانے قسمت نے یہ کھیل کیوں کر میرے ساتھ کھیلا ہے؟''

مصباح نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ سر جھکا کر بیٹھی رہی۔ نصف گھنٹے کے بعد صادق حسین بوڑھے

نکاح رجسٹرار کو لے کر آ گیا۔ دونوں کا نکاح پڑھانے، دستخط لینے اور پَرتوں کی بھرائی کے بعد اپنا رجسٹر سمیٹ کر رخصت ہو گیا۔ اُس کے جانے کے بعد دونوں ایک دوسرے سے آنکھیں چراتے رہے، کچھ نہ کہتے ہوئے بہت کچھ کہتے رہے۔ پھر جب گواہوں اور وکیلوں کے دستخطوں سمیت پَرت اُن تک پہنچا تو دونوں کے اندیشوں بھرے دلوں کو یقین آ گیا کہ وہ اَب دو الگ وجود نہیں رہے، ایک ہو گئے ہیں۔ دُنیا ایسی ہی ہے۔ اگر کوئی جدائی پر خوش ہو تو اُسے تکلیف دہ وصال کا تحفہ دیتی ہے۔ اگر کوئی وصال کی خواہش میں تڑپنے لگے تو اُسے فراق کا لمبا چُغہ اوڑھا دیتی ہے۔ یہ سوچنا بھی بڑا عجیب لگتا ہے کہ دُنیا کی بے ثباتی نے اُنہیں ایک وجود میں ڈھال دیا ہے۔

مصباح نے روتے ہوئے کہا ’’قسمت پھوٹ جائے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ تمہاری مرضی پر اپنا آپ دکھانے کیلئے تمہارے ساتھ آئی تھی، اپنی مرضی کے بغیر اپنا آپ گنوا بیٹھی ہوں۔ کیا شادیاں ایسے بھی ہوتی ہیں؟‘‘

شہاب نے آنکھیں چُرا لیں۔ دل میں تأسف بھر گیا۔ جس ہستی کو زندگی کے پَل پَل میں آسودہ رکھنے کا عزم رکھتا تھا، اُس کی زندگی میں ہمیشہ چبھنے والا سُول اُسی کے ہاتھوں نے رکھ دیا تھا۔ سر جھکا کر بولا ’’کاش! یہ سب کچھ کسی اور انداز میں سرانجام پاتا۔‘‘

مصباح نے کانپتے ہاتھوں میں تھاما ہوُا نکاح نامے کا پَرت اُس کی جھولی میں پھینکتے ہوئے کہا ’’تمہاری ضد نے مجھے اِس عذاب سے گزارا ہے۔ میں شاید کبھی بھی اِس نکاح کو قبول نہ کر پاؤں کیونکہ اِس پَرت پر نہ تو میرے کسی بھائی کے دستخط ہیں اور نہ پاپا کے۔ میری مما نے اجازت نہیں دی، یہ بوگس ہے...... یہ محض مجبوری کا سودا ہے جو اِس بدنامی کے چنگل سے نکلنے کیلئے طے پایا ہے۔ میں یہ اُمید رکھتی ہوں کہ یہاں سے نکلنے کے بعد تم اِس معاہدے کو بھول جاؤ گے۔‘‘

شہاب نے چونک کر اُسے دیکھا۔ وہ جو کہہ رہی تھی، اُس کے چہرے سے بھی وہی کچھ عیاں تھا۔ اپنی محنت کو اکارت جاتے دیکھ کر وہ پچھتانے لگا۔ یہی بات فرخ نے اُسے قبل از وقت کہی تھی۔ سب کچھ پا کر بھی خالی دامن رہنا بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے، اِس کا احساس شہاب کو ہونے لگا تھا۔ معاملے کی سنگینی دور کرنے کیلئے بولا ’’تم جو بھی کہو گی، مانوں گا، مگر پلیز! یہاں سے نکلنے تک کوئی فیصلہ مت کرو۔‘‘

''شہاب! کیا تم......''

اچانک فائر کی دہشت ناک آواز گونجی۔ فائر کہیں قریب میں ہی ہوُا تھا۔ فائر کے ساتھ ہی انسانی چیخ نے دونوں کے رونگٹے کھڑے کر دیے۔ اَبھی وہ دہشت سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے کہ ایک زوردار آواز کے ساتھ دروازہ کھلا۔ دونوں گھبرا کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ کھلے دروازے میں تین ہٹے کٹے افراد ہاتھوں میں کلاشن کوفیں تھامے کھڑے تھے۔ اُن کے چہرے کپڑے کے روائتی ڈھاٹے میں چھپے ہوئے تھے جبکہ خون آشام نگاہیں اُن پر جمی ہوئی تھیں۔ مصباح کے حلق سے چیخ برآمد ہوئی اور وہ شہاب سے لپٹ کر کانپنے لگی۔ شہاب کا ساکت بدن بے سانس ہوُا جا رہا تھا۔ موقع کی نزاکت کو پوری طرح نہ سمجھ پانے کے باوجود بہت کچھ سمجھ رہا تھا۔ آنے والے کسی اچھے ارادے سے نہیں آئے تھے۔ کھلے دروازے سے اُن تینوں کے عقب میں کئی افراد کھڑے دکھائی دیے۔ حلیوں سے وہ اُنہی کے ساتھی معلوم ہوتے تھے۔

دو ڈھاٹا پوشوں نے شہاب کو کھینچ کر علیحدہ کر لیا اور اُس پر ٹھڈوں اور لاتوں کی بارش کر دی جبکہ تیسرے نے لرزتی کانپتی مصباح کا ہاتھ تھاما اور اُسے گھسیٹتا ہوُا باہر نکل گیا۔ وہ اتنی ڈر گئی تھی کہ اُس کے منہ سے کوشش کے باوجود کوئی آواز برآمد نہیں ہو رہی تھی۔ بری طرح گھسٹتی ہوئی کمرے سے نکلی تو یوں لگا جیسے ناگاہ کسی حیرت کدے میں قدم رکھ بیٹھی ہو۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ چند ہی لمحوں میں اُس کے دِل پر عجیب سی کیفیت بیت گئی۔ یہ کوئی سرکاری عمارت نہیں تھی بلکہ عام سی حویلی تھی۔ ایسی اَن گنت حویلیاں زرعی علاقوں میں جا بہ جا دیکھی جا سکتی تھیں۔ آن کی آن میں اُس کی سمجھ میں آ گیا کہ اُسے کسی سرکاری ادارے نے نہیں، شہاب کے دوستوں یا دشمنوں نے اغوا کیا تھا۔

ہاتھ سختی سے پکڑ کر گھسیٹنے والا اُسے حویلی سے باہر لے جا رہا تھا مگر وہ بغیر کسی مزاحمت کے گردن موڑے حویلی کو دیکھ رہی تھی۔ اچانک جیسے ذہن نے کام کرنا بند کر دیا ہو۔ صحن کے عین وسط میں صادق حسین کی خون سے تر نعش پڑی تھی۔ اُس کی داڑھی اُس کی نعش سے چند فٹ کے فاصلے پر زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ آنِ واحد میں مصباح پر عقدہ کھل گیا کہ صادق حسین نے دھوکہ دینے کیلئے یا خود کو چھپانے کیلئے اپنے کلین شیو چہرے پر مصنوعی داڑھی بڑی مہارت سے چپکا رکھی تھی۔

وہ حلق کے بل پوری قوت کے ساتھ چیخی۔ چہرے پر پڑنے والے زوردار تھپڑ نے اُس کا منہ بند کر دیا۔ بُری طرح لہرائی اور گرفت میں جکڑے ہونے کے باوجود زمین بوس ہوگئی۔ ڈھاٹا پوش کا پستہ قامت ساتھی بھاگ کر قریب آیا۔ دونوں نے مل کر اُسے اُٹھایا اور حویلی کے دروازے پر کھڑی بغیر نمبر پلیٹ والی فور ویل جیپ کی پچھلی نشست پر ڈال دیا۔ ایک ڈاکو اُس کے ساتھ سیٹ پر بیٹھ گیا جبکہ دوسرا تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوُا حویلی کے اندر چلا گیا۔ چند ہی منٹوں کے بعد سبھی دوڑتے ہوئے باہر آئے اور بڑی مستعدی سے جیپ میں سوار ہو کر جس طرف سے آئے تھے، اُس طرف روانہ ہو گئے۔

اٹیچڈ باتھ والے کمرے کے فرش پر شہاب زخمی حالت میں آڑا ترچھا بے ہوش پڑا ہوُا تھا۔ وہ سُدھ مندی میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اُس کے ترتیب دیے گئے بے داغ منصوبے کا انجام اِس قدر بھیانک اور خون آلود بھی ہو سکتا ہے۔

......

قسمت سہ پہر سے از حد سست دکھائی دے رہی تھی۔ ماما نے اُسے پیراسیٹامول کا سیرپ بہ طور احتیاط پلا دیا تھا۔ کھانا بھی اُس نے بے رغبتی کے ساتھ کھایا۔ قسمت کے پاپا نے تھرمامیٹر لگایا۔ ٹمپریچر سو پر تھا۔ اَبھی خطرے کی کوئی بات نہیں تھی مگر رات کو کسی بھی وقت جسم زیادہ حرارت پکڑ سکتا تھا اِس لئے اُس نے قسمت کو اُس کی ماں کے ساتھ سُلا دیا اور خیال رکھنے کی تاکید کی۔

اُس نے الماری میں سے چند انجیکشن اور سیرپ منتخب کر کے نکالے اور بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھ چھوڑے تھے۔ سارا دِن آپریشن تھیٹر میں انسانی اعضا کی قطع و برید کرنے والا ڈاکٹر اپنی اکلوتی بیٹی کی ہلکی سی تکلیف کو بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

نصف شب کا عمل ہو گا جب اچانک قسمت نے زوردار چیخ ماری۔ دونوں میاں بیوی ایک ساتھ گھبرا کر اُٹھ بیٹھے۔ جلدی سے بیڈ لیمپ روشن کیا۔ دیکھا۔ چلتے ہوئے ائر کنڈیشنر کی ٹھنڈک کے باوجود قسمت پسینے میں تر بیڈ کے درمیان میں بیٹھی ہوئی پھٹی پھٹی نگاہوں سے اردگرد دیکھ رہی تھی۔ ماما

نے جلدی سے اُسے بانہوں میں بھرتے ہوئے پوچھا ''قسمت بیٹا! کیا بات ہے؟ کیا ڈر گئی ہو؟''

اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ اَبھی تک غیر معمولی حد تک سہمی ہوئی تھی۔ ماما نے پچکارا، چھاتی سے لگا کر بھینچا اور چہرے کا خال خال چوما۔ بہت مرتبہ پوچھنے پر وہ روتے ہوئے بتانے لگی ''ہائے ماما! میری فینی کو بہت سارے کتوں نے چیر پھاڑ ڈالا ہے۔''

دونوں بانہیں پوری وسعت میں کھول کر بولی ''اتنا بڑا ایک جنگل ہے ماما! جہاں میری فینی بھاگی پھرتی ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اُس کے کپڑے کتوں نے پھاڑ ڈالے۔ وہی والے کپڑے جو آپ نے مجھے سی کر دیے تھے۔ اُسے بچالیں ماما! کتے اُس کے پیچھے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔''

بتانے کے بعد پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ پھر ٹھٹک کر چپ ہوگئی۔ ماما کا ہاتھ تھام کر جھنجوڑتے ہوئے بولی ''اور ماما! کتوں کے موتھوں سے سرخ سرخ خون ٹپک رہا تھا۔''

ماما نے سراسیمہ نظروں سے اپنے شوہر کو دیکھا۔ قسمت کا چہرہ اپنی چھاتی میں چھپاتے ہوئے بولی ''پگلی کھیل کھیل میں اتنا آگے نکل جاتی ہے کہ میرے بدن سے جان کھینچ نکالتی ہے۔ ہنس کے ڈوگی نے اِس کی گڑیا کو اُٹھا کر بھنبھوڑ دیا تھا۔ وہی منظر خواب میں دیکھ کر ڈرنے لگی ہے۔''

''تم اِسے ہنس کے ساتھ کھیلنے ہی نہ دیا کرو۔''

''کیسی بات کرتے ہیں۔'' ماما نے اچنبھے سے کہا ''خدا خدا کر کے کسی کے ساتھ کھیلنے لگی ہے، روکا تو پھر پہلے جیسی تنہائی پسند ہو جائے گی۔''

''کم از کم رات کو سوتے میں ڈرے گی تو نہیں۔''

''یہ ہنس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔'' ماما کی آواز بہت دھیمی تھی۔

''یہ کیا بات ہوئی؟''

''یہ بات نہیں، واقعہ ہے۔''

''کیا؟''

''یاد ہے، آپ نے ہی ایک مرتبہ مجھ سے کہا تھا کہ دیکھے اور ملے بنا نہ رہ سکنے کی کیفیت کو محبت کا

نام دیا جاتا ہے۔''

''تو کیا دونوں ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے ہیں؟'' کہنیوں کے بَل نیم دراز ڈاکٹر عثمان کے لبوں پر مسکراہٹ اُبھر آئی۔

وہ نظر انداز کرتے ہوئے بولی ''پلیز! آپ اِس پگلی پر آیۃ الکرسی پڑھ کر پھونک ماردیں۔ اِسے نظر بھی بہت جلد لگ جاتی ہے، صبح اس پر سے مرچیں وار کر پھینکوں گی۔''

...۞...

مقدر سوجائے تو انسان کا جاگنا یا سونا ایک برابر ہوجاتا ہے۔ وہ نہ جانے کب تک بے ہوشی کی نیند سوئی رہی، جاگی تو خود کو بان کی چارپائی پر بندھی ہوئی حالت میں پایا۔ وہ گردن گھما کر اردگرد دیکھ سکتی تھی مگر اُسے جس کمرے میں رکھا گیا تھا اُس میں سوائے ایک کھلی کھڑکی اور بند دروازے کے، کچھ تھا ہی نہیں جسے وہ لالٹین کی زرد رُو بیمار روشنی میں دیکھتی۔ کمرے کے عین وسط میں پڑی اکلوتی چارپائی پر وہ خود پڑی ہوئی تھی۔ کھڑکی کی فولادی سلاخوں کے باہر اندھیرے کی سیاہی پھیلی ہوئی تھی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ پُرمصائب حالات کا شکار ہونے کے سبب اُس کے اعصاب مکمل طور پر جواب دے چکے تھے۔ بہت دیر سے کچھ کھایا پیا نہیں تھا جس کی وجہ جسم پر بھوک کی نقاہت بھی طاری تھی۔ سر کو دائیں بائیں حرکت دینے پر سر میں اُٹھنے والی درد کی ٹیسوں نے اُسے کراہنے پر مجبور کردیا۔

غیر اختیاری طور پر اُس نے رسی کی بندشوں سے آزاد ہونے کی کوشش کی۔ ناکامی پر جھنجلانے کے بجائے مایوس ہوکر رونے لگی۔ رفتہ رفتہ یاد آنے لگا۔ وہ جن حالات سے گزر کر یہاں تک پہنچی تھی، وہ ہر پہلو سے تکلیف دہ تھے۔ خود پر لعنت ملامت کرنے لگی۔ اُس نے شہاب کو سمجھنے میں بہت بھیانک غلطی کرلی تھی۔

اُسے احساس ہوچکا تھا کہ اُس کے خاندان کا وقار خاک میں مل چکا تھا۔ اُس کی محبت نے اُس کے بھائیوں کی گردن میں سے ریڑھ کی ہڈی کی اکڑ نکال دی تھی۔ نہ جانے پاپا اور ماما کس حال میں ہوں گے؟ وہ ایک طویل آہ بھر کر یہاں سے نکلنے کے بارے میں سوچنے لگی۔ اُسے یہ اندازہ تو تھا کہ جن

لوگوں نے صادق حسین کو قتل کرنے اور شہاب کو بے دریغ مارنے پیٹنے کے بعد اٹھا کر اُسے یہاں پہنچایا تھا، اُسے یوں مہارت سے باندھا تھا، وہ اُسے بہ آسانی یہاں سے جانے نہیں دیں گے۔ وہ تعلیم یافتہ تھی، نادان نہیں تھی کہ متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والی خوبصورت اور جوان لڑکی کے اغوا کا سبب نہ جان پاتی......سوائے اُس کی جوانی سے حظ اُٹھانے کے یوں سفاکانہ انداز میں اغوا کے پیچھے کوئی مقصد کارفرما نہیں تھا۔

...⁂...

کافی دیر گزر گئی۔ پیاس کے مارے بُرا حال ہو گیا۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمنے لگیں۔ حلق میں کانٹے چبھنے لگے۔ بے بسی سے لکڑیوں کی بنی چھت کو گھورتے ہوئے خدا سے مدد مانگتی رہی۔ اپنی غلطی کی معافی مانگتی رہی۔ مدد نہیں آئی، روم روم سے جان نکالنے والے ڈراؤنی شکلوں والے شیطان آن وارد ہوئے۔ وہ تعداد میں تین تھے۔ اُنہیں دیکھ کر مصباح کے حلق سے دہشت کے مارے چیخ نکل گئی۔

وہ سہمی ہوئی نگاہوں سے اُنہیں دیکھتے ہوئے کانپتی رہی۔ تینوں کے پاس کوئی اسلحہ نہیں تھا۔ دیہاتی طرز کے تہبند اور بنیانیں پہنے ہوئے انسان نہیں، ہوسیلے دیو دکھائی دے رہے تھے۔ ایک نے آگے بڑھ کر اُس کی رسیاں کھولیں، دوسرے نے کوئی مہلت دیے بغیر اُسے دبوچ لیا۔ آن کی آن میں اُس کے بدن کو چھپانے والا لباس تار تار ہو گیا۔ پہلے اُس کی زبان گنگ رہی، پھر وہ چیخ پڑی۔ منت سماجت، اللہ نبی کے واسطے، رحم کی التجائیں، سب کچھ اکارت گیا۔ جوانی بھرا اپنے ایک ایک عضو کو غیر معمولی نفاست سے سنبھال کر رکھنے والی درندوں کے پنجوں اور نوکیلے دانتوں کی زد میں کٹ چھل رہی تھی، تڑپ رہی تھی، مچل رہی تھی مگر......

بے ہوش ہوئی تو اُس پر پانی کا جگ انڈیل کر ہوش میں کھینچ لایا گیا۔ کچھ پانی بدن پر پڑا، کچھ چہرے پر اور کچھ منہ میں ٹپکا۔ سیاہ فام اور بد ہیئت درندے نے جگ اُس کے منہ سے لگا دیا۔ وہ بچا کھچا پانی پاگلوں کی طرح غٹا غٹ پی گئی۔ پانی بدن میں پہنچ کر تیزاب کی طرح کاٹنے لگا، باہر گستاخ

اور ہوس آلود ہاتھ انگاروں کی طرح بدن داغنے لگے۔ قیامت بن کر گزرنے والے ایک گھنٹے میں وہ نہ جانے کتنی بار بے ہوش ہوئی، کتنی بار ہوش میں لائی گئی۔ پھر قیامت کی آگ ایک لمحے پر آ کر ٹھہر گئی۔

وہ چلے گئے۔ دو اور آ گئے۔ اُن میں سے ایک کو چنگیزی ترس آیا۔ اُس نے باسی روٹی اور ٹھنڈا سالن لا کر اُس کے سامنے رکھ دیا۔ توے کی پھولوں والی روٹی پر ناک بھوں چڑھانے والی ندیدوں کی طرح کچی پکی روٹی پر جھپٹ پڑی۔ ایک لقمہ اندر پہنچا، یوں لگا جیسے دم باہر نکلنے کو حدیں پھاڑنے پر تُل گیا ہو۔ اُسے بہت زور کی کھانسی آئی۔ جو کھایا تھا، قے کے ساتھ نکل گیا۔ ترس کھانے والے کو اپنے کئے پر ندامت ہوئی۔ پانی کی بالٹی بھر کر لایا۔ اُس کے کٹے پھٹے بدن اور چارپائی کے بان کو قے کی غلاظت سے صاف کرنے لگا۔ پھر اُسے کچھ یاد نہیں رہا...... ایک بھیانک خواب کی طرح کتے اُسے بھنبھوڑتے رہے، بدن پر بے داغ جلد تلاش کرتے رہے، خون آلود دانتوں سے کاٹتے رہے۔ وہ خواب میں ہی چیختی رہی، مدد کیلئے پکارتی رہی مگر اِس ویرانے میں اُس کی مدد کیلئے کوئی پہنچنے والا نہیں تھا۔

ایسی رات کو صبح کا اجالا نصیب نہیں ہوتا مگر اُس کی پھیلی پھیلی بے جان آنکھیں کھڑکی سے جھانکتی کرنوں کی دیکھ رہی تھی۔ ذہن بالکل خالی خالی سا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ نہیں ہے، اُس کا کوئی احساس بھی زندہ نہیں ہے اور جو کچھ ہے وہ بھی حقیقت میں عدم ہے......

اُس نے کہنیوں کے بَل اُٹھنا چاہا۔ اُٹھ نہ پائی۔ عضو عضو پھوڑا بنا ہوُا تھا۔ اُس کے منہ سے غیر ارادی طور پر ایک تسلسل کے ساتھ کراہیں خارج ہو رہی تھیں حالانکہ وہ خاموش رہنا چاہتی تھی۔ ایسے میں سینے پر کہیں ٹیس جاگی۔ اُس نے داہنا ہاتھ سینے پر رکھا۔ عریانی کے احساس نے جگر کاٹ کر رکھ دیا۔ ہاتھ تھکے ہارے جواری کی طرح ہر روندی ہوئی جگہ کو ٹٹول کر محسوس کرتا رہا، آنکھ ہر تباہی پر اشک بہاتی رہی اور دماغ قسمت کی لکیروں پر بیٹھ کر سینہ کوبی کرتا رہا۔

چوپٹ کھلے دروازے کے باہر صحن میں کئی مرد متحرک تھے۔ کوئی گن صاف کر رہا تھا، کوئی کپڑے دھونے میں مصروف تھا تو کوئی چولھے پر بیٹھا ہوُا تھا۔ جا بہ جا مختلف نوعیت کا اسلحہ پڑا دکھائی دے رہا

تھا۔ صحن کے پار، کچی دیوار کے اوپر درختوں کی جھالر دکھائی دے رہی تھی اور فضا میں عجیب نامانوس سی بُو پھیلی ہوئی تھی۔ نہ سمجھ میں آنے والا شور بھی سماعت پر گراں گزر رہا تھا۔ اُسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ وہ کس جہنم کدے میں بیٹھی اپنی تضحیک کا ماتم کر رہی ہے۔

کمرے میں مچھروں کی بھی بہتات تھی جنہوں نے اُس کے برہنہ بدن پر جا بہ جا بیٹھ کر فراغت سے اپنی پیاس بجھائی تھی۔ جانے پھر کیا ہؤا کہ اُس کی آنکھیں پتھرا سی گئیں، جسم سُن ہو گیا اور یوں لگا جیسے وہ بے بدن، بے وزن ہواؤں میں اڑتی پھرتی ہے۔ وہ اُٹھی۔ کئی مردوں کی موجودگی میں ننگے پنڈے دیوار کا سہارا لیتی ہوئی کھلے صحن میں آئی۔ آخری گوشے میں بنے ناپختہ ٹوائلٹ تک گئی۔ نکلنے لگی تو لہرا کر گر گئی۔ ایک درندہ لپک کر قریب آیا۔ بانہوں میں بھر کر نلکے تک لایا۔ بچپن میں ماں نہلایا کرتی تھی، جوانی میں کتوں کے خونی پنجے غسل دے رہے تھے۔ اُس کی چیخیں بے آواز تھیں ''ہائے آسمان! تو ٹوٹ کر اِس دھرتی کے جیالوں پر گر کیوں نہیں جاتا؟...... اے زمین! تو پھٹ کر انسانیت کو نگل کیوں نہیں جاتی؟...... یا میں، کل مونھی، بھاگوں جلی ہی مر کیوں نہیں جاتی؟''

گرمیوں کے لمبے دِن کی طویل قیامت گزرنے پر اُس کا چہرہ بھیانک ہو گیا۔ ڈراؤنا ہو گیا۔ اگر ایسی حالت میں آئینہ دیکھتی تو یقیناً پاگل ہو جاتی۔ مچھروں کے کاٹے نے اپنا کام دکھانا شروع کر دیا تھا۔ دُنیا کے ہر ذائقے کو بھول جانے والا منہ کڑوا ہونے لگا۔ جسم میں بھری جانے والی آگ بھی اپنا کام دکھانے لگی۔ بدن چولھا بن گیا۔ لالٹین روشن ہونے تک اُس کی حالت خاصی خراب ہو گئی تھی۔ سانسیں تنور سے نکلتی تپش زدہ ہواؤں کے تھپیڑے بن گئیں۔ کون نوچ رہا ہے، کون توڑ رہا ہے، وہ ہر فکر سے لمحہ بہ لمحہ غافل ہوتی جاتی تھی۔ ایسے میں ڈاکوؤں کے سردار کو اُس پر رحم آ گیا۔ اُس کی کلائی پر ہاتھ رکھ کر بولا ''اَبے جاہلو! اِسے تو بہت تیز بخار چڑھا ہؤا ہے۔''

ایک دیو پھنکارا ''تو ہم کیا کریں؟ کیا ہم نے ڈاکٹری کی دکان کھول رکھی ہے جو اِس کا علاج معالجہ شروع کر دیں۔''

''یہ مر جائے گی۔''

کمرے کے باہر ایک قہقہہ بلند ہوا۔ کسی نے پاٹ دار آواز میں کہا ''مرنے والی ہوتی تو صبح

ہونے سے پہلے ہی مر جاتی۔ جو اتنے مردوں میں ایک دن اور ایک رات گزار چکی ہے اور اَبھی تک مری نہیں، وہ کبھی نہیں مرے گی۔ تم لوگ فکر نہ کرو۔''

کئی قہقہوں نے اُس کی بات کی تائید کی۔ ایک گن کا برسٹ بھی اُس پر تضحیک کا بارود پھینکنے لگا۔ وہ پاگلوں کی طرح کئی ہنستے چہروں کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگی۔ لبوں کے گوشوں سے رال بہنے لگی، آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں مگر کوئی اشک رخساروں تک نہیں پہنچا وگرنہ نمکینی اُس کے چہرے پر لگے ننھے ننھے زخموں میں چبھن بھر دیتی۔

سردار نے ڈپٹ کر سب کو چپ کرایا۔ اُس کے چہرے پر چند لمحے نظریں جمائے کھڑا رہا پھر بولا ''اِسے کاڑھا پلاؤ، مٹھوں کا جوس پلاؤ، بچ جائے تو ٹھیک ورنہ ساگر میں پھینک دینا۔ اور ہاں خبردار! اَب کوئی اِس کے نزدیک نہ جائے۔''

باہر سے کسی نے قہقہہ لگا کر مقامی زبان میں کہا ''شیرے گرمانی نے اِسے پہچان لیا ہے۔ لگے ہاتھوں ہم غریبوں کو بھی بتا دے سردار! یہ تمہاری کیا لگتی ہے؟''

''بکواس بند کرو ورنہ سینے میں گولی اُتار دوں گا۔'' سردار نے غرا کر کہا اور ہاتھ تنبیہی انداز میں اُٹھا کر اکڑتا ہوُا کمرے سے نکل گیا۔

وہ چارپائی میں بیٹھی خالی الذہنی کی کیفیت میں ڈوب کر اپنے چہرے پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ قدرت نے اُس کے گالوں میں دو ننھے ننھے گڑھے بنائے تھے جنہیں دیکھ کر ہر نظر ٹھٹک کر اُن میں گرنے کو لپکتی تھی۔ درندوں نے جابجا گڑھے کھود ڈالے تھے جن کی موجودگی کا احساس بذاتِ خود مصباح کیلئے کراہت کا باعث بن گیا تھا۔

......

اختیار والوں کی دُنیا کا چلن مختلف ہوتا ہے۔ وہ بھی اختیار والا تھا۔ لمبے ہاتھ ہر وقت ضلعی بساط پر اپنی دسترس قائم رکھتے تھے۔ اُس کے لمبے ہاتھوں نے دور تک پھیلی فساد کی جڑ کو کھینچ کر اُس تک پہنچا دیا تھا۔ مہروں کو پٹنے کیلئے تھانے کی حوالات میں قید کر دیا تھا۔ مرکزی تھانے کا ایس ایچ او اپنی فورس

کے ساتھ دریائے سندھ کے قریب واقع حویلی سے صادق حسین کی نعش اُٹھالایا تھا۔شہاب کو بھی اُسی گاڑی میں لایا گیا تھا جبکہ فرخ اور بابر کو جعلی وردیوں سمیت پولیس کی دوسری ٹیم نے گرفتار کیا تھا جو اِس وقت تھانے کی حوالات میں اپنے ساتھی رضی الدین، جس پر اُنھوں نے صادق حسین کا عارضی لیبل چسپاں کیا تھا، کے قتل کے الزام میں تفتیش کا عذاب بھگت رہے تھے۔شہاب اپنی خواب گاہ میں فیملی ڈاکٹر کے زیرعلاج پڑا تھا۔قانون کی نظر میں وہ معصوم تھا۔

ہوش میں آتے ہیں اُٹھ کر ارد گرد دیکھنے لگا۔ پریشان ہوگیا، کہاں تھا، کہاں موجود ہے؟ سوچنے پر سر میں درد ہونے لگا۔ بیڈ سے اُترنا چاہا تو نگہداشت پر مامور ملازمین نے سمجھا دیا کہ وہ اپنے گھر میں ہونے کے باوجود قید میں ہے۔صرف اپنے باپ کی اجازت کے بغیر کمرے سے نکل سکتا ہے۔ ملازمین باہر جاتے تو دروازے کو باہر سے مقفل کر دیتے۔ وہ گھبرا گیا۔ جونہی پوری طرح اُس پر بیتے لمحات کی روئیداد اپنی تمام تر سنگینی کے ساتھ کھلی تو کمرے کی فضا میں آکسیجن کم ہونے لگی۔ اُس نے کھڑکی کھولی۔ وہ سیکنڈ فلور پر کھڑا تھا۔ نیچے چھلانگ لگانے کا مطلب بخوبی جانتا تھا مگر وہ رہ نہ سکا اور کھڑکی سے مرمریں فرش پر کود گیا۔

چھلانگ لگانے کا پہلا تجربہ ہی بھیانک ثابت ہوا۔کودنے کے فوری بعد اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا اور کولہے کے بَل فرش پر آن گرا۔حلق سے تیز چیخ برآمد ہوئی اور وہ دوبارہ اپنے قدموں پر کھڑا نہ ہوسکا۔ ملازمین بھاگ کر اُس تک پہنچے۔سنبھالا، اٹھایا، دیکھا کہ ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی۔ آن کی آن میں گھر میں شور بپا ہوگیا۔سردار ارباب خان کو مطلع کیا گیا۔ ڈسٹرکٹ ہیڈکوارٹر ہسپتال کی ایمبولینس سردار کے پہنچنے سے پہلے پہنچ گئی۔ اُسے فوری طور پر ہسپتال شفٹ کیا گیا جہاں ابتدائی طبی امداد دینے کے بعد اُسی ایمبولینس میں ملتان روانہ کر دیا گیا۔شام کو ہوش آیا، باپ کو دیکھ کر منہ پھیر کر بولا''بابا! آپ نے اچھا نہیں کیا؟''

''اللہ کا شکر ہے بیٹا! تمھیں ہوش آ گیا۔تمہاری ہڈی بھی بالکل ٹھیک جُڑ گئی ہے۔'' سردار نے اُس کی بات کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے کہا''ڈاکٹر کہتے ہیں کہ یہ پلاسٹر ڈیڑھ ماہ تک لگا رہے گا۔ جب اِسے کاٹا جائے گا، تمہاری ٹانگ بالکل ٹھیک ہو چکی ہوگی۔''

وہ بولا ''مجھے اپنی ٹانگ کی پرواہ نہیں، مصباح اور میرے دوست کہاں ہیں؟''

باپ نے نظریں چُرا لیں۔ پیٹھ کر کے کھڑا ہو گیا ''تم اُن لوگوں کو یاد نہ کرو تو بہتر ہے۔ سنا ہے کہ فرخ اور بابر نے اپنے دوست رضی الدین کو قتل کر دیا ہے۔ رضی کے گھر میں قیامت اُتری ہوئی ہے، دونوں قاتلوں کے گھروں کا چولھا بھی بجھا ہوا ہے۔''

وہ بے یقینی سے باپ کو دیکھنے لگا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اُس کا باپ اُسے کیا کہہ رہا تھا۔ سردار پلٹ کر اُس کے قریب آ گیا۔ بازو سہلاتے ہوئے بولا ''تم اپنی بے وقوفی کے باعث بہت بڑی مصیبت میں پھنس چکے تھے۔ اگر میں فوری طور پر معاملے کو سنبھال نہ لیتا تو تم بہت بری طرح قانون کی گرفت میں آ جاتے۔ مصباح کا بھائی اور اُس کے تین چار کزنز کتوں کی طرح تمہاری بُو سونگھتے پھرتے ہیں۔ تمہیں رضی الدین کی لاش پر سے اُٹھایا گیا تھا۔ تم پر براہِ راست قتل کا مقدمہ بن جاتا۔''

''رضی کو کس نے قتل کیا؟'' اُس کا دماغ پھٹنے کو تھا۔

''یہ تو تمہیں علم ہونا چاہیے، میں کیا کہہ سکتا ہوں؟'' سردار نے لاپرواہی سے کہا ''پولیس نے ایف آئی آر میں رضی کا قتل تمہارے دونوں دوستوں کے کھاتے میں ڈال دیا ہے۔ تفتیش میں پتھر بھی بول پڑتے ہیں، وہ بھی بول پڑیں گے۔ تمہارا نام بار بار لیں گے، تھانیدار بار بار تمہارے نام کو ہوا میں تحلیل کرتا رہے گا، لاکھوں روپے ڈکارتا رہے گا۔ تم نے اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی پھنسا دیا ہے بے وقوف لڑکے!''

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے سخت لہجے میں بولا ''بابر اور فرخ اُسے قتل نہیں کر سکتے بابا!''

بابا نے کندھے اُچکائے ''یہ پولیس کا دردِ سر ہے، میرا یا تمہارا نہیں۔''

''مصباح کہاں ہے؟''

''میں نے کہا ناں کہ اِن باتوں کا مجھے کوئی علم نہیں، صرف تمہیں علم ہے اور میں پوچھنا ضروری خیال نہیں کرتا۔''

شہاب نے باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ لہجے میں سانپ کی پھنکار عود کر آئی ''بابا! میں نے ایک کھیل کھیلا تھا۔ جونہی اپنے کھیل میں کامیاب ہوا، آپ کے کھلاڑی میدان میں اُتر

آئے۔ مجھے مار پیٹ کر بے ہوش کرنے کے بعد وہ مصباح کو اُٹھا کر لے گئے، ممکن ہے جاتے ہوئے رضی کو بھی قتل کر گئے ہوں۔ اُس وقت بابر اقبال اور فرخ حویلی میں موجود نہیں تھے۔ پولیس نے اُنہیں کہاں سے گرفتار کیا؟ یہ آپ جانتے ہیں۔ مصباح کہاں ہے؟ آپ جانتے ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ مجھے فوراً مصباح تک پہنچا دیں یا اُسے یہاں لے آئیں، بابر اور فرخ کو رہائی دلوا دیں ورنہ......''

''کیا ورنہ؟'' بابا کی پیشانی پر اَن گنت بل پڑ گئے۔

''وہ ہوگا جو آپ نے زندگی بھر نہیں سوچا ہوگا'' وہ دانت پیس کر بولا ''مصباح میری محبوبہ نہیں رہی، میری بیوی بن چکی ہے، آپ کی بہو، جسے آپ نے کتوں کے آگے نچڑنے کیلئے پھینک دیا۔ کیا غیرت......''

بابا نے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر ارد گرد دیکھا۔ ہسپتال کے عملے کا کوئی بھی فرد موجود نہیں تھا۔ ملازمین ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ اُن کا ہونا یا نہ ہونا ایک برابر تھا۔ وہ بیڈ پر چاروں شانے چت لیٹے ہوئے جوان بیٹے کے کان پر جھکا، سلگتے ہوئے لہجے میں بولا ''میں سمجھا رہا ہوں کہ اپنی زبان بند رکھو۔ میں نہیں جانتا کہ کون لوگ مصباح کو اُٹھا کر لے گئے ہیں۔ یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ زندہ ہے یا مر چکی ہے، ویسے بھی اغوا ہو جانے والی لڑکی سے مجھے کوئی ہمدردی نہیں، تمہیں بھی نہیں ہونی چاہیے۔ تمہاری زبان پر آئندہ اُس کا نام نہیں آنا چاہیے ورنہ ہمارا پورا خاندان بدنامی کی لپیٹ میں آ جائے گا۔ خاموش رہو گے تو تم پر کوئی آنچ نہیں آنے دوں گا۔''

باپ ڈرا دھمکا کر چلا گیا۔ ہسپتال کا پرائیویٹ روم اُس کیلئے قید خانہ بن گیا۔ اگلی صبح اُسے پتہ چلا کہ اُسے لگنے والی چوٹ اُس کے باپ کیلئے رحمت ثابت ہوئی تھی۔ اُس نے سرٹیفکیٹ بنوا لئے جو کسی بھی عدالت میں بہ آسانی ثابت کر سکتے تھے کہ مصباح کے غیاب سے دو دِن پہلے اُس کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹی تھی۔ سماج کی ہر نگاہ کو ماننا پڑے گا کہ ٹوٹی ہوئی ٹانگ کے ساتھ وہ کسی لڑکی کو اغوا نہیں کر سکتا تھا۔ مصباح کے بھائی وجدان نے اُس کے خلاف تھانے میں مصباح کے اغوا کی ایف آئی آر درج کرا دی تھی۔ ملازمین نے بتلایا کہ وجدان مصباح کی تلاش میں پاگل ہوتا جا رہا ہے اور کوئی بعید نہیں کہ سامنا ہونے پر اُسے گولی مارنے سے بھی دریغ نہ کرے۔

اُسے گولی کی پرواہ نہیں تھی، اُسے فرخ اور بابر کی بھی کچھ زیادہ پرواہ نہیں تھی، مصباح کے لئے بے حد پریشان تھا۔ جب یاد آتی تو پھر جانے کا نام ہی نہ لیتی۔ اُسے گھسیٹ کر باہر لے جانے والے ڈھاٹا پوش کی شبیہہ اُس کے لاشعور میں ثبت ہوگئی تھی۔ اُسے کامل یقین تھا کہ حویلی میں اُن پر حملہ آور ہونے والے، مصباح کو اغوا کرنے اور رضی کو قتل کرنے والوں کا تعلق اُس کے بابا سے ہے۔ اُسے اپنے باپ کی ذہنیت پر افسوس ہونے لگا۔ اپنی ضد کو منوانے کیلئے اُس نے تین چار گھروں کو برباد کرڈالا تھا۔ اپنی بہو کو درندوں کے حوالے کردیا تھا۔ مصباح کے انجام کا سوچا تو دل بیٹھنے لگا۔ فرار کی کوشش میں ناکامی نے اُسے ہلنے جلنے سے قاصر کردیا تھا۔

بہت تیزی سے سوچنے کے باوجود یہاں سے نکلنے اور اپنے ساتھیوں سے رابطہ کرنے کی کوئی ترکیب سجھائی نہیں دے رہی تھی۔ کسی ڈاکٹر یا عملے کے بندے کو اپنی مدد کیلئے آمادہ نہیں کرسکتا تھا کیونکہ اُس کے باپ کے زرخرید چوبیس گھنٹے چھوٹے سے پرائیویٹ روم میں موجود رہتے تھے۔ ویسے بھی کوئی دہکتی ہوئی آگ میں کودنا پسند نہیں کرتا۔ بابر، فرخ اور رضی جیسے لوگ ہی اُس کی خاطر آگ کے الاؤ میں کودنے پر تیار ہوگئے تھے۔ وہ باپ کی خودساختہ جنت میں قید ہوگیا، وہ دہکتے ہوئے تنور میں پھینک دیے گئے۔ رضی کی موت پر وہ کئی بار اشکبار ہوُا تھا۔ اُس نے ایک دو مرتبہ اپنے ملازموں سے موبائل فون طلب کیا تھا جس پر معمر ملازم نے ہاتھ جوڑ کر کہا ''چھوٹے مالک! ہم مجبور ہیں۔ آپ کیلئے کچھ نہیں کرسکتے۔ سردار صاحب نے ہمیں سختی سے منع کررکھا ہے۔''

اُس کا دماغ پھٹنے کو آگیا مگر کوئی کلید ہاتھ نہیں لگی۔ سردار اَرباب خان نے ڈاکٹرز سے مشورہ کرنے کے بعد اُسے ملتان والی کوٹھی میں منتقل کردیا۔ انسانوں کی بھری دُنیا کے بیچ رہتے ہوئے اُسے بڑی مہارت سے تنہا کردیا گیا۔ اُس کا جسمانی علاج ہورہا تھا، ذہنی تناؤ سے صرفِ نظر برتا جارہا تھا۔ چند ہی دِنوں میں اُسے یقین ہوگیا کہ وہ اپنے بااختیار باپ کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ بے بسی کے مارے دل بھر آیا اور وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر عورتوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ چیخنے لگا ''ہائے میری مصباح! تم کہاں ہو؟ دُنیا میں ایسا نکاح شاید کبھی بھی نہ پڑھایا گیا ہوگا جس کا پرت ہاتھ میں آتے ہی دُلہن ہمیشہ کیلئے آنکھوں سے اوجھل ہوجاتی ہو۔ اپنے پیروں پر چلنے کے

قابل ہوجاؤں تو پل جھپکتے میں تم تک پہنچ آ ؤں گا، تب تک تم میرے پاس آنے کی کوشش کرو......
مجھے معاف کردو، میرے پاس چلی آ ؤ......تمہارے بدن پر لگی ڈاکوؤں کے ہاتھوں کی میل کو اشکوں
سے دھوڈالوں گا۔ ازالہ کردوں گا۔''

وہ شاید نہیں جانتا تھا کہ محبت میں رَوا رکھی گئی بربریت کا ازالہ زندگی نثار کردینے سے بھی نہیں
ہوتا۔ اُس نے پوری قوت سے دائیں جانب والی دیوار پر مکا دے مارا۔ ہاتھ کو تکلیف نہیں ہوئی،
ٹانگ میں درد کی ٹیس جاگ پڑی۔ وہ کراہا۔ دانت پیس کر پھر دیوار پر حملہ آور ہوگیا۔ چند ہی لمحوں
میں پوری کوٹھی اُس کی چیخوں سے بھر گئی۔ ملازموں کے دوڑتے قدموں کی آوازوں نے ماحول کے
تناؤ میں بے حد اضافہ کردیا۔

بخار کسی بھی عمر میں چڑھے، بدن کو توڑ پھوڑ دیتا ہے۔ بدن توڑنے والا طبیعت پر ناگوار گزرتا ہے
مگر اُس پر رحمت بن کر اُترا تھا۔ شام سے نصف رات تک وہ بخار کی حدت میں پھنکتی رہی اور کوئی
اُس کے قریب نہیں آیا۔ یوں محسوس ہورہا تھا جیسے وہ اچھوت ہوگئی ہو۔ چارپائی سے اُترنے کی سکت
بدن میں نہیں تھی۔ پانی سے نکلی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپتی رہی، سر پٹختے ہوئے کراہتی رہی مگر سننے
والوں نے شاید کانوں میں روئی کے پھائے ٹھونس رکھے تھے۔

مسلسل سولی پر ٹنگے رہنے کے سبب وہ نڈھال تو پہلے ہی تھی، بخار نے غشی طاری کردی۔ سردار
نے دروازے میں کھڑے ہوکر اُس کی حالتِ زار دیکھی۔ لالٹین کی زرد روشنی میں اُس کے چہرے پر
چھائی ہوئی موت کی پیلاہٹ کو دیکھ کر اپنے ایک توانا اور جسیم ساتھی کو ہاتھ کے اشارے سے پاس
بلایا۔ قریب آیا تو قدرے نیچی آواز میں بولا ''مولا داد! اِسے اُٹھا کر ساگر میں پھینک دے۔ یہ
مرنے والی ہے۔''

مولا داد نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ واپس گیا۔ لانگ شوز پہن کر کمرے میں آ گیا۔ سیلاب کے
بعد جابجا سانپ دکھائی دینے لگتے تھے۔ رات کے اندھیرے میں چھپے ہوئے ناگ بہت خطرناک

ثابت ہوتے تھے۔ مصباح کے عریاں وجود کو بانہوں میں بھر کر اُٹھایا اور کندھے پر لادلیا۔ اُس کی دونوں بانہیں اُس کے عقب میں بے جان انداز میں لہرانے لگیں۔

کمرے سے نکل کر سردار سے مخاطب ہوا ''سردار! پورے بدن سے آگ نکل رہی ہے۔''

''تبھی تو اِسے ٹھنڈا کرنے کیلئے دریا میں پھینکنے کا حکم دے رہا ہوں۔''

''سردار! یہ تو ظلم ہے۔''

''ہم لوگوں نے اَب تک اُس کے ساتھ جو کچھ کیا، وہ ظلم نہیں تھا؟'' سردار کے لہجے میں درشتی عود کر آئی۔

مولا داد نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ دیوار کے ساتھ پڑی کانٹے دار جھاڑیوں سے بچتا بچاتا ڈیرے سے باہر آ گیا۔ کیچڑ اور گندے پانی کو عبور کرتے ہوئے اُسے دریا تک پہنچنے کیلئے ایک میل کا سفر طے کرنا تھا۔ جی ہی جی میں سردار کو کوستا ہوا اچل پڑا۔ اُس کی رفتار خاصی سست تھی۔ تھوڑی سی غلطی اُسے کسی بھی دلدلی گڑھے میں پھینک سکتی تھی۔ چونکہ بہت سالوں سے یہاں کی خاک چھانتا آیا تھا، اس لئے کہیں ٹھوکر کھا کر گرے بغیر گھنٹہ بھر میں ساگر کے کنارے پر پہنچ گیا۔

سفر طے ہو گیا تو کندھے پر لدے بوجھ کی جانب توجہ گئی۔ اِس بوجھ کو بوجھ بنانے میں اُس کا کردار بھی کچھ کم نہیں تھا۔ تپش خواہ جوانی کی ہو، بخار کی ہو، بے چین کرنے لگتی ہے۔ وہ بھی بے چینی محسوس کرنے لگا۔ اُسے کندھے سے اُتار کر ٹیلا نما ابھری ہوئی جگہ پر جال کے درخت کے نیچے ڈالا۔ یہاں کے وسنیکوں کا خیال ہے کہ جال کا درخت، درویش رُکھ ہوتا ہے تبھی اِس کی افزائش مزاروں اور درگاہوں میں نسبتاً اچھی ہوتی ہے۔ وہ بھی توہم پرست انسان تھا۔ نظر اُٹھا کر جال کی خالی ٹہنیوں کو دیکھا۔ پیلھوں کب کی جھڑ چکی تھیں۔ پیلھوں پک جائیں تو بھی اِس دور میں کسی کے پاس جال کے نیچے کھڑے ہونے کی فرصت نہیں ہوتی۔ تہی داماں درخت کی جھولی درویشی سے بھی عاری ہوتی ہے۔ مولا داد کی نظریں جھک کر قدموں میں پڑی ہوئی مسلی کچلی ہوئی پیلھوں پر پڑی تو اچانک سانس تیز ہونے لگا۔

وہ موت کے گھاٹ اترنے والی تھی مگر سدھ مند نہیں تھی۔ چند لمحے تک اُسے جھنجوڑتا رہا۔ گرم بدن

کو بہانے بہانے سے سہلاتا رہا۔ جب سے آئی تھی، برف کی سل کی طرح یخ بستہ تھی۔ اَب ہاتھوں سے نکلنے والی تھی تو بھٹی سے نکلنے والی تازہ پختہ اینٹ کی طرح ہاتھوں کو جلانے لگی تھی۔

وہ اُس کے پاس بیٹھ گیا۔سوچ میں پڑ گیا۔اَب تب میں فنا ہونے والی کو دیکھ کر رال ٹپکنے لگی تھی۔ دماغ نے کہا'' بیمار ہے، مرنے والی ہے، جانے دو۔اپنا منہ کالا نہ کرو۔''

وہ بے دھیانی سے سر کو سہلانے لگا، سمجھانے لگا''وہ جب سے یہاں آئی ہے، لاش کی طرح چار پائی پر پڑی رہی۔ یوں لگتا تھا جیسے اُس کے بدن میں خون کی گردش موجود نہیں ہے۔ اَب ہاتھ لگانے سے تنور میں جلتی آگ کا احساس ہوتا ہے، منہ کالا کیا، گورا کیا؟''

برسوں کے بعد ایک عورت ہاتھ لگی تھی۔ اَب جانے زندگی تشنہ ہی رہتی۔ وہ ہتھیلیوں کے بَل پر اُٹھ کر اُس پر جھک گیا۔ خدا کے دیکھے کا ڈر نہیں تھا، سردار ایک میل پیچھے رہ گیا تھا جس کا دل کو ڈر تھا۔ مصباح نے ایک چند لمحوں کیلئے آنکھیں کھولیں۔سر کو دائیں بائیں پٹخا، پھر گہری غشی میں چلی گئی۔ نعش گرم ہو، نعش ٹھنڈی ہو، بے روح ہوتی ہے۔ مصباح کے بے روح بدن کو کسی بھی استحصال کا اندیشہ نہیں رہا تھا۔

ایسے میں جال کے تنے سے لپٹا ہوُا کالا ناگ زمین پر اُترا۔ کیچڑ زدہ زمین پر لہراتا ہوُا خاموشی سے مولا داد کی طرف بڑھا۔ مولا داد اپنے قدموں پر کھڑا ہوتا تو شاید ناگ کے وار سے بچ جاتا۔ اِس حالت میں بچ نہ پایا اور اُس کے حلق سے سسکاری نکل گئی۔ جھٹکے کے ساتھ اُٹھا اور پلٹ کر سانپ کو تیزی سے جھاڑیوں کی طرف جاتے دیکھ کر سن رہ گیا۔ سچ کہتے ہیں کہ سانپ کا زہر بعد میں اثر کرتا ہے، اُس کی دہشت پہلے ہی آدھی جان نکال لیتی ہے۔ گھٹنے سے ایک آدھ انچ اوپر ران پر ڈنک زدہ جلد پر ہاتھ ٹک گیا۔ ایک ٹانگ پر چھلانگ لگا کر چند قدم دور ہٹ گیا۔ جال کی درویش ٹہنیوں نے اُس پر اپنا قہر اُتار دیا تھا۔

چند لمحے سنبھلنے میں لگے۔ ایک زوردار ٹھوکر مصباح کی پسلیوں میں ماری۔ وہ ایک فٹ اوپر اُچھلی اور دوبارہ پہلو کے بَل گر کر گردن ڈھلکا گئی۔ مولا داد نے اُسے دو چار غلیظ گالیوں سے نوازا اور پاؤں سے دھکیلتا ہوُا عین کنارے پر لے گیا۔ جب مصباح کی زندگی محض ایک ٹھوکر کی زَد میں آخری

سانسیں لے رہی تھی، تب ساگر کی لہریں مچلنے لگیں اور دونوں بانہیں کھول کر اُسے بلانے لگیں ''آ جاؤ میری رانی! تمہارے آئینے جیسے شفاف بدن کو انسانوں کی دُنیا نے غلاظتوں سے بھر دیا ہے۔ آ کہ تجھے مرنے سے پہلے اچھی طرح نہلا دوں۔ تیری نظروں میں، تیری زبان پر، تیری روح پر اِن آلائشوں کا بوجھ رہے تو رہے، بدن پھر سے آئینے کی طرح شفاف ہوجائے گا جو سانسوں سے بھی دھندلانے لگتا ہے۔''

مولا داد نے دانت پیستے ہوئے اُس کی کمر پر زور دار لات جمائی۔ وہ لڑھک کر پانی میں جا گری۔ یوں لگا جیسے چولھے پر بیٹھی ہوئی کسی خاتون نے اَدھ جلی لکڑی اُٹھا کر پانی بھری پرات میں ڈال دی ہو۔ چھپاک کی آواز کے ساتھ ہی اُس کے بدن میں لگی ہوئی آگ بجھ گئی، دہکتی ہوئی جہنم دم توڑ گئی اور وہ چند ہی لمحوں میں مولا داد کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔ ساگر کی گود میں بڑی گہرائی ہوتی ہے۔ گناہوں کو تَل میں رکھ لیتی ہے، روح کو ہمکا کر اپنے پاس بیٹھا لیتی ہے اور چھلکے کو ہلکا کر کے سطحِ ساگر پر اُچھال دیتی ہے۔

مولا داد جانتا تھا کہ چند ہی منٹوں میں اُس پر زہر کا غلبہ طاری ہونے لگے گا۔ اُس نے جلدی سے اپنے تہبند کی کناری پھاڑ کر رسی بنائی اور زخم سے کچھ اوپر سختی سے باندھ دی۔ جلن میں کمی نہیں ہوئی، دل کو تسلی ہوگئی کہ اَب زہر اوپر سرائت نہیں کرے گا۔

نصف میل تک وہ اپنے حواس میں تھا۔ اچانک پاؤں پھسلا اور لہرا کر گرا تو پھر اُٹھ نہ سکا۔ چند ہی لمحوں میں ذہن میں غنودگی بھر گئی۔ روٹھ کر جاتی ہوئی زندگی کو ایک مرتبہ بدن نے کھینچ کر چھاتی سے لگانے کی کوشش کی تو وہ تڑپ کر اُٹھ بیٹھا۔ خالی خالی نظروں سے دائیں بائیں دیکھا۔ ہر درخت کے ساتھ مصباح کی اَن گنت برہنہ نعشیں لٹکی دکھائی دیں۔ زمین پر ہر طرف سانپ ہی سانپ دکھائی دیے۔ اُس نے چیخنے کیلئے منہ کھولا، چھاتی کو جھٹکا سا لگا اور منہ خون سے بھر گیا۔ خونی قے نے جھولی بھر دی۔ اُس نے چند لمحوں تک اپنے بھاری پڑتے سر کو سنبھالنے کی کوشش کی، پھر نا کام ہو کر پیچھے کی طرف گر پڑا۔ ایسے میں بدن پیچھے رہ گیا، روح آگے نکل گئی۔

...

ٹیپ شدہ سرخ اینٹوں والے کوارٹر کی بیرونی دیوار خاصی بلند تھی مگر سایہ بہ مشکل بالشت بھر کا تھا۔ دونوں دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ ہنس بڑے جوش کے ساتھ گزشتہ رات پی ٹی وی پر نشر کئے جانے والے ڈرامے کی کہانی سنا رہا تھا۔ قسمت نے ڈرامہ دیکھ رکھا تھا، پھر بھی سُن رہی تھی۔ اُس کے آدھے چہرے پر دھوپ پڑ رہی تھی، آدھا چہرہ سائے میں تھا۔ دو حصوں میں منقسم معصوم سے چہرے پر دُکھ کی پرچھائیاں مترشح تھیں۔ ہنس اپنی دھن میں مگن تھا ورنہ اُس کی اداسی کو ضرور بھانپ لیتا۔ کہانی ختم ہوگئی۔ ردعمل معلوم کرنے کیلئے قسمت کو دیکھا۔ چونک کر بولا

''قسمت! کیا تمہیں ماما نے ڈانٹا ہے؟''

وہ نفی میں سر ہلا کر بولی ''نہیں۔ میری ماما بہت اچھی ہیں۔''

''ڈانٹتی تو رہتی ہیں۔''

''پیار بھی تو کرتی ہیں۔'' قسمت نے فوراً کہا۔

''ٹھیک ہے مگر تم چپ چپ کیوں ہو؟'' ہنس کھسک کر اُس کے مزید قریب ہوگیا۔

''ہنس! ماما کہہ رہی تھیں کہ پاپا کا ٹرانسفر ہوگیا ہے۔'' وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی۔

''تو اِس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟'' ہنس نے تعجب سے پوچھا۔

قسمت منہ سے کچھ نہیں بولی۔ ایک ٹک اُسے دیکھتی گئی۔ وہ منہ بنا کر بولا ''تمہاری شکل دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے تمہارا لنچ بکس ٹوٹ گیا ہو، وہی مِکی ماؤس والا۔''

اُس نے سر دائیں بائیں گھمایا۔ ہنس نے پھر پوچھا ''کہاں ٹرانسفر ہوا ہے؟''

''پتہ نہیں۔'' وہ کوفت سے بولی۔

''تمہیں کچھ پتہ ہی نہیں ہے تو پریشان کیوں ہو رہی ہو؟''

اُس کی آنکھیں بھر آئیں۔ دو تین مرتبہ آنکھیں جھپکیں۔ آنسو گالوں پر لڑھک آئے۔ چند ہی لمحوں میں وہ سسکیاں لیتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ہنس پریشان ہوگیا۔ سوچنے لگا، جب

وہ روتا ہے تو ماما یا بابا کیا کرتے ہیں؟ بچے ایسے ہی سیکھتے ہیں۔ وہ آن کی آن میں سمجھ گیا کہ قسمت کو بہلانے کیلئے کیا کرنا چاہیے۔ وہ اُٹھ کر اُس کے سامنے دھوپ میں بیٹھ گیا۔ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اُس کی نم آنکھوں کو پونچھتے ہوئے بولا ''ناں میری جان! میرے ہوتے ہوئے تمہیں رونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ چپ! بس اَب چپ ہوجاؤ ورنہ میں بھی رونے لگوں گا۔''

بابا ایسے ہیں اُس کی دلجوئی کرتے تھے۔ وہ مان جایا کرتا تھا، قسمت نہیں مانی۔ وہ چپ نہیں ہوئی تو ہنس گڑبڑا گیا۔ ماما کا طریقہ یاد آیا۔ اُسے کھینچ کر اپنی چھاتی سے لگاتے ہوئے گالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ ساتھ ساتھ گالوں کے بوسے لیتے ہوئے پچکارنے لگا ''تم روتی ہوتو میرا دِل بیٹھنے لگتا ہے۔ آنسو بہاتی رہو گی تو چیونٹیوں کے گھر میں پانی گھس جائے گا اور اُن کے ننھے منے بچے ڈوب کر مرجائیں گے۔''

رونا تھم گیا۔ استعجاب آمیز لہجے میں بولی ''تو کیا اُنہیں تیرنا نہیں آتا ہنس؟''

وہ فتحیابی کے احساس سے مسکرانے لگا۔ وہ عجیب سی نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھی، پوچھ رہی تھی۔ جواب نہ پا کر سوچ میں پڑ گئی۔ خیال آیا کہ ہنس نے اُس کے ساتھ مذاق تو نہیں کیا؟...... وہ اپنی قمیص کے پلو سے اُس کا چہرہ صاف کرتے ہوئے بولا ''اچھے بچے روتے نہیں، ہنستے ہیں۔ چلو مجھے مسکرا کر دکھاؤ۔''

وہ ہنس دی۔ بدلیوں کے ہٹنے پر مطلع صاف ہوگیا۔ کافی دیر تک اپنے پیروں کے ناخنوں کو کریدتی رہی، کچھ سوچتی رہی، پھر بولی ''ہنس! ماما کہہ رہی تھیں کہ ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔''

''کیوں؟'' ہنس کی حیرت دیدنی تھی۔

''بتایا تو ہے کہ پاپا کا ٹرانسفر ہوگیا ہے۔ میں نے ڈرامے کی پوری کہانی سنی، تم نے میری ایک بات بھی نہیں سنی۔ تم گندے ہو۔'' قسمت کا منہ پھول گیا۔

''تو کیا تم بھی چلی جاؤ گی؟'' ہنس نے جیسے اُس کی بات سنی ہی نہیں تھی۔

''میں اپنے پاپا اور ماما کے ساتھ یہاں سے دور چلی جاؤں گی۔''

ہنس پھٹی پھٹی نگاہوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ پہلے وہ روئی تھی۔ اَب وہ رونا چاہتا تھا۔ ہونٹ

کپکپانے لگے۔ اَٹک اَٹک کر بولا ''تم چلی جاؤ گی تو میں کس کے ساتھ کھیلوں گا؟''

''پوڈو اور کشتی کے ساتھ کھیلنا، میں تمہیں پاپا کے فون پر کال کیا کروں گی۔'' وہ سر جھکا کر بولی۔

اُس نے منہ بنایا۔ دو آنسو نکل آئے۔ ہونٹ مخصوص انداز میں کھلنے اور بند ہونے لگے۔ پھر وہ حسبِ عادت آنکھوں پر دایاں بازو رکھ کر رونے لگا۔ قسمت بھی رونے لگی۔ جدائی ایسی ہی ہوتی ہے، رونے والے کو چپ کرانے کی مہلت کسی کو نہیں ملتی۔ ایسے میں شناں ہنس کو ڈھونڈتی ہوئی اِدھر آ نکلی۔ دونوں کو پورے اہتمام سے روتے دیکھ کر پریشان ہوگئی۔ پوچھا تو قسمت نے سر اُٹھا کر کہا ''آنٹی! میں یہاں سے چلی جاؤں گی تو ہنس اکیلا رہ جائے گا۔ اِس کے ساتھ کون کھیلا کرے گا؟''

شناں کا ماتھا ٹھنکا۔ دونوں کو بغلوں میں چھپا کر بولی ''تم میری بیٹی ہو، میں تمہیں کہیں بھی نہیں جانے دوں گی۔''

ہنس نے سر اُٹھایا ''ماما! قسمت کے پاپا کا ٹرانسفر ہو گیا ہے۔ کیا جس کا ٹرانسفر ہو جائے، وہ ہمیشہ کیلئے چلا جاتا ہے؟''

پسینے اور آنسوؤں سے تر دونوں بچوں پر نیلا دوپٹہ سایہ فگن کر کے وہ اُنہیں کمرے میں لے آئی اور فریج میں سے آئس کریم نکال کر کھلانے لگی۔ دل ہی دل میں سوچنے لگی ''قسمت چلی گئی تو ہنس اَپ سیٹ ہو جائے گا۔ وہ ایک دِن دکھائی نہیں دیتی تو بے چین ہو جاتا ہے، کبھی دکھائی نہ دی تو کیا ہوگا؟ ...... میں اِسی لئے دونوں کو زیادہ قریب دیکھ کر پریشان ہو جاتی تھی مگر ہنس کے بابا کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی تھی۔''

دھیان بٹانے کیلئے پوچھنے لگی ''تمہارے پوڈو کا کیا حال ہے؟''

''آج کل مزے میں ہے۔ اُس کا مہمان آیا ہوا ہے، سارا دِن دونوں بیٹھ کر گپیں لگاتے رہتے ہیں۔'' ہنس نے کہا۔

قسمت جھٹ سے بولی ''نہیں آنٹی! میں نے فینی کے کزن کو کشتی سے اُٹھا لیا تھا۔ ہنس کو پتہ ہی نہیں چلا۔''

ہنس کا غصہ دیدنی تھا ''تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟''

''میری مرضی!'' وہ کندھے اُچکا کر بولی ''پوڈو میرا ہے، جو میرے دِل میں آئے گا، کروں گی، تمہیں کیا؟''

''کشتی میری ہے، مرضی بھی میری ہی چلے گی۔ فینی کا کزن پوڈو کے پاس بیٹھے گا۔'' وہ اکڑ گیا۔

''نہیں بیٹھے گا!'' اُس نے آنکھیں دکھائیں۔

چند ہی لمحوں میں بساط پلٹ گئی۔ دونوں نے آئس کریم کے پیالے میز پر رکھ دیے اور ایک دوسرے کو گھورنے لگے۔ جدائی کے صدمے سے دوچار ہو کر رونے والے بلیوں کی طرح ایک دوسرے پر جھپٹ پڑے۔ شناں نے بدقّت تمام دونوں کو علیحدہ کیا، ڈانٹا اور اُن کا تنازعہ جان کر تصفیہ کرا دیا ''تم ایسا کرو کہ فینی کے کزن کو پَرے رکھو، اُس نے کشتی دیکھ لی ہے، اَب فینی کو کشتی کی سیر کرا دو۔ بے چاری للچاتی نظروں سے کشتی کو دیکھتی رہتی ہے۔''

قسمت نے نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے کچلتے ہوئے کچھ دیر تک سوچا پھر مسکرا دی۔ سر جھک گیا۔ بولی ''ٹھیک ہے آنٹی! فینی ویسے بھی کافی بیمار ہے، اُسے اپنے ہاتھ سے کھانا پکا کر کھلاؤں گی، پوڈو دوائی دے گا تو وہ جلدی جلدی ٹھیک ہو جائے گی۔''

شناں نے ہنس کی طرف استفہامیہ نگاہوں سے دیکھا۔ وہ بولا ''فینی کو دوائی پوڈو نہیں دے گا، میں دوں گا۔''

''تم دوائیں کہاں سے لاؤ گے؟'' قسمت نے آنکھیں نچائیں۔

''بابا مجھے لا کر دیں گے۔''

قسمت طنزیہ انداز میں مسکرانے لگی۔ اُس کی آنکھیں بھی بول رہی تھیں، کہہ رہی تھیں ''تمہارے بابا کبھی بھی تمہیں دوائیں لا کر نہیں دیں گے، دیکھ لینا۔''

شناں دونوں کے پَل پَل رنگ بدلتے چہروں کو باری باری دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی ''ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ جدائی کی ویکسین بچپن میں لگ جائے تو بڑا ہو کر انسان ہمیشہ جدائی کے اندوہ اور تکلیف سے بچا رہتا ہے۔ اُس میں فطری طور پر قوتِ مزاحمت پیدا ہو جاتی ہے۔''

وہ آج تک یہ پوچھنے کی جرأت نہیں کر پائی تھی کہ اُنہیں بچپن میں ویکسین دی گئی تھی؟...... اگر دی

گئی تھی تو وہ اپنی مکمل تنہائی کو نادیہ کے دُکھ سے کیوں محفوظ نہیں رکھ پاتے؟......اگر نہیں دی گئی تھی تو پھر میری موجودگی میں کبھی اُسے یاد کیوں نہیں کرتے؟

دل میں بولی ''وہ شاید ٹھیک ہی کہتے ہوں مگر اُنہیں یہ علم نہیں کہ ویکسین کی مقدار زیادہ ہوجائے تو جس مرض سے بچانے کیلئے انجیکٹ کی جاتی ہے، وہی مرض لاحق ہوجاتی ہے۔ سیانے کہتے ہیں بچپن سے چمٹنے والا روگ جاتے جاتے جوانی کو بھی چاٹ جاتا ہے۔ آنکھ کھلتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ بچپنا ایک جست بھر کر بڑھاپے میں داخل ہوگیا ہے۔ بیچ کا عرصہ عمر بھر ڈھونڈے سے نہیں ملتا۔ سچے سائیں! میرے ہنس کو جدائی کے دُکھ سے ہمیشہ بچائے رکھنا۔''

اُسے کون سمجھاتا کہ جدائی کے دُکھ سے آج تک کوئی نہیں بچ پایا، کوئی بھی بچ نہیں پائے گا۔

...⁂...

''افتخار بیٹا! کیا تمہارے گھر والوں کو علم ہے کہ تم میرے پاس ہو؟'' پروفیسر نے اپنے سامنے بیٹھے افتخار سے دریافت کیا۔ دونوں چائے پی رہے تھے۔

وہ چونک پڑا ''نہیں سر! میں نے کسی کو نہیں بتایا۔''

''گھر میں سے کسی نے تمہارے فون پر رابطہ نہیں کیا، کیا وجہ ہے؟'' پروفیسر کا لہجہ استعجاب آمیز تھا۔

''میں نے یہاں پہنچتے ہی فون پاوَرڈ آف کر دیا تھا۔''

''کیوں؟''

''میں کسی سے ملنا نہیں چاہتا۔''

''کیا ایک لڑکی کی خاطر تم اِس حد سے گزر گئے ہو؟''

''سر جی! وہ محض ایک لڑکی نہیں تھی، ایک مکمل رسم کا درجہ رکھتی تھی۔ اُس کے یوں جانے پر مجھے یوں محسوس ہوُا جیسے میرا وجود دُنیا پر بوجھ بنا گیا ہو، میں خود کو نہائت غیر ضروری اور فالتو سمجھنے لگا ہوں۔ ایک طرف اپنے ٹھکرائے جانے کا غم، دوسری طرف یہ ندامت کہ میں کتنی غیر ذمہ دار اور خود

غرض لڑکی کو آج تک چاہتا رہا ہوں، مجھے چین نہیں لینے دیتی۔''افتخار کی آواز میں تھکاوٹ عود کر آئی۔

''کیا یہ طے ہے کہ وہ اپنی مرضی سے شہاب کے ساتھ گئی ہے؟''

افتخار نے مخصوص انداز میں ہونٹ سکیڑے جیسے کہہ رہا ہو کہ اِس کے علاوہ کوئی صورت بنتی دکھائی نہیں دیتی۔

''یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ اُس کے ساتھ کوئی بہت بڑا دھوکہ ہوُا ہو۔''

اُس نے جواباً نفی میں سر ہلایا''نہیں سر جی! وہ اتنی بھی بے وقوف اور کم عمر نہیں ہے۔''

پروفیسر نے کندھے اُچکائے، دل ہی دِل میں اُس کی حماقت پر اُسے ملامت کی، کہا''تمہیں اُس کے بعد کسی دوسری لڑکی کا انتظار کرنا چاہیے تھا، یہاں جنت میں کوئی لڑکی نہیں آئے گی، اپنی دُنیا میں لوٹ جاوَ۔''

''آپ نے تین عورتوں کا چلن دیکھا، اَشولال نے ایک عورت سے محبت کرنے کا جُرم کیا، میں نے بھی۔ کیا یہی تجربات کافی نہیں ہیں؟''

پروفیسر ہنسا''بے وقوف ہو تم! عورت سے پہلے مرد جنت کا پکھو (پرندہ) ہوُا کرتا تھا۔ کوثر کی فضا میں اُڑانیں بھرتا تھا۔ خدا نے مَرد کو جنت سے نکالنے کیلئے عورت کے فریب کا سہارا لیا، خود کو الزام سے بَری الذمہ قرار دینے کیلئے ایک کھیل کھیلا جو جنت سے شروع ہو کر جہنم تک جاری رہا، جاری ہے اور جاری رہے گا۔ مَرد اگر دوسروں کے تجربے سے سیکھنے والا ہوتا تو دُنیا عورت کے وجود سے کب کی خالی ہو کر پھر سے جنت بن چکی ہوتی۔ تم ہمارے کئے دھرے کو بالائے طاق رکھو، خود گزشتی کو پَرکھ کا معیار جانو۔''

افتخار کا جھکا ہوُا سر بتلا رہا تھا کہ اُسے پروفیسر کی باتوں سے اتفاق نہیں ہے۔ پروفیسر نے اُسے فون آن کرنے کا حکم دیا۔ اُس نے طوعاً و کرہاً فون آن کر دیا۔ کوئی جیسے اِسی انتظار میں بیٹھا ہوُا تھا۔ فوراً ہی بزر بجنے لگا۔ افتخار نے شکوہ کناں نگاہوں سے پروفیسر کی طرف دیکھا اور فون آن کر کے کان سے لگا لیا۔ پروفیسر نے اُس کی گفتگو سے اندازہ لگایا کہ دوسری طرف وجدان بول رہا ہے۔ فون بند ہونے تک افتخار کی حالت خاصی خراب ہو گئی تھی۔ پروفیسر نے اُس کی اُڑی اُڑی رنگت کو دیکھ کر دریافت کیا

''کیا بات ہے افتخار؟''

وہ ایک طویل سانس لے کر کھڑا ہو گیا۔ چند لمحوں تک عرشے پر اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا اور اپنے اضطراب پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ پروفیسر نے سگریٹ سلگا لیا۔ اپنی توجہ ہٹانے کیلئے لمبے لمبے کش لیتے ہوئے افتخار کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ بولا تو اُس کی جذباتی کیفیت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ انداز خود کلامی ایسا تھا ''وجدان نے بتایا ہے کہ میرے گھر والے بہت زیادہ پریشان ہیں، سارے خاندان کا یہی خیال ہے کہ میں مصباح کی تلاش میں نکلا ہوا ہوں۔ اُس نے یہ بھی بتلایا ہے کہ شہاب مصباح کے غائب ہونے سے پہلے کار کے ایک حادثے میں ٹانگ تڑوا کر ہوسپٹلائزڈ ہو چکا ہے۔ وجدان نے چھپ کر اُس کی حالتِ زار دیکھی ہے اور اُسے یقین ہے کہ مصباح کے اغوا میں اُس کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ شہاب کے دو قریبی دوست جو اُس کی سرگرمیوں کے بارے میں کچھ بتلانے کے اہل ٹھہرتے ہیں، وہ ایک جھگڑے میں اپنے دوست رضی الدین کو قتل کر کے حوالات میں پہنچ چکے ہیں۔ کتنی عجیب بات ہے، اگر شہاب کو مصباح کی خبر نہیں تو وہ کہاں گئی؟''

پروفیسر کی پیشانی پر فکر و تردد کی غماز لکیروں کا جال تن گیا۔ وجدان سے ہونے والی گفتگو کا لفظ لفظ سن کر بھی وہ کوئی رائے قائم کرنے کے قابل نہیں تھا۔ متفکر لہجے میں گویا ہوا ''تم نے یہاں آنے کی حماقت نہ کی ہوتی تو مجھے یقین ہے کہ تم نے کوئی نہ کوئی کھوج اَب تک نکال لیا ہوتا۔''

''جو ہونا تھا، ہو گیا، اَب آگے کی طرف رہنمائی کریں سر!'' افتخار کے لہجے میں بیزاری تھی۔ اچانک ٹھٹک گیا۔ متردد انداز میں بولا ''کہیں ایسا نہ ہو کہ وجدان مجھے ڈاج دے رہا ہو، شہاب ہم سب کو بہکانے کیلئے ناٹک کھیل رہا ہو یا مصباح ہی گیم کھیل رہی ہو؟''

پروفیسر نے ہاتھ اُٹھا کر روک دیا۔ اُس کے چہرے سے خفگی عیاں ہونے لگی۔ افتخار کا یوں سوچنا اُسے اچھا نہیں لگا تھا۔ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ اُس کے فون کا بزر بجنے لگا۔ فون کی ڈسپلے سکرین پر اَشو لال کا نام زیرِلب پڑھا اور آن کر کے کان سے لگا لیا ''جی مُرشد!''

''بسم اللہ سئیں!'' اَشو لال کی آواز کانوں میں رَس گھول گئی ''تمہارے پاس کون ہے؟''

''افتخار اپنی جوانی کو سندھو کے پوتر پانی میں دھونے اور ٹھنڈا کرنے کیلئے چند دنوں سے یہاں مقیم ہے، خیر تو ہے مُرشد؟'' پروفیسر نے استعجاب آمیز انداز میں پوچھا۔ اُسے حیرانی ہوئی تھی کہ اَشولال کی آواز ویسی ہی کھنک بار تھی مگر لہجہ مضطرب سا تھا جو کبھی بھی اُس کی شخصیت کا خاصہ نہیں رہا تھا۔

''اگر کچھ پوچھوں تو بتاؤ گے؟''

وہ مزید پریشان ہو گیا ''میں نے کبھی انکار کیا ہے؟''

''نہیں مگر جو پوچھنے چلا ہوں، وہ ہمارے مابین چھڑی رہنے والی گفتگو کا حصہ نہیں ہے، تبھی دریافت کر رہا ہوں۔''

''پوچھو مُرشد!''

''کیا افتخار اپنی کسی کزن سے محبت کرتا ہے؟''

پروفیسر نے کن اکھیوں سے پاس کھڑے افتخار کو دیکھا، باچھیں کھینچ کر بولا ''جی...... کبھی حوا جنت سے نکلواتی ہے، کبھی جہنم سے نکلوا کر جنت کی طرف بھیج دیتی ہے۔ اسے بھی جنت کی طرف دھکیلا گیا ہے۔''

اَشولال کے منہ سے ''اوہ'' کی لمبی آواز نکلی، پھر لمبی چپ فون پر ٹھہر گئی۔ پروفیسر نے گھبرا کر پوچھا ''کیا بات ہے مُرشد؟ بولتے بولتے چپ کیوں ہو گئے ہو؟''

''اُس کا نام کیا ہے؟''

پروفیسر نے پھر افتخار کی طرف دیکھا۔ اپنی اَور متوجہ پا کر ہولے سے بولا ''اِس سوال کا جواب اُدھار رہا۔''

اَشولال سمجھ گیا۔ بولا ''سمجھ گیا سئیں! اُس پر عیاں کر دو کہ اُس کی فینی کسی بڑی مصیبت سے دو چار ہونے والی ہے۔''

''ہائیں...... یہ فینی کون ہے؟''

اَشولال نے جلدی سے کہا ''میں نے افتخار کی محبوبہ کو ایک فرضی نام دیا ہے، جب تک تم اُس کا نام بتلا نہیں دو گے۔''

پروفیسر کا سانس سینے میں ہی کہیں اَٹکنے لگا۔لرزتی ہوئی آواز میں بولا''کیا تم اُسے جانتے ہو؟''

''نہیں، مگر جو کہہ رہا ہوں، وہ سچ ہے۔''اَشولال کے لہجے میں عجیب سا تاثر تھا جسے پروفیسر کوئی نام نہیں دے پایا۔

''مجھے سمجھاؤ مُرشد! جسے تم جانتے تک نہیں، نام سے آگاہ بھی نہیں، اُس کے بارے میں اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہو جبکہ دیکھنے میں یہ آچکا ہے کہ اُس پر مصیبت ٹوٹ پڑی ہے۔''

''کیا ہوُا اُسے؟''اَشولال نے چونک کر پوچھا۔

''تم کیا جانتے ہو، بتلاؤ، میں پھر بتلاؤں گا۔''

''مجھے تو بس یہی پتہ چلا ہے کہ وہ درندوں کے ہاتھ لگ چکی ہے یا لگنے والی ہے۔''

افتخار فون پر ہونے والی گفتگو کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر نا کام ہو رہا تھا۔اُسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ پروفیسر اور ڈاکٹر اَشولال مصباح کے بارے میں بات چیت کر رہے ہیں۔

پروفیسر کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ اُبھری''تم جھوٹے ہو مُرشد! تم کچھ بھی نہیں جانتے ہو، خود کو نمایاں کرنے کیلئے سوانگ رَچا رہے ہو۔اَن پڑھوں اور ضعیف الاعتقاد لوگوں پر وار کرو، تم پر اپنی جان وار دینے پر کمر بستہ ہو جائیں گے، میں نہیں۔''

اَشو کے لہجے میں زہر گھل گیا''پروفیسر! مجھ پر اعتماد کرو، میں کچھ بھی نہیں ہوں مگر قسمت......''

وہ روانی میں بولتے بولتے رُک گیا۔ پروفیسر نے استہزائیہ انداز میں کہا''قسمت کے لکھے کو پڑھنے لگے ہو؟''

اَشولال نے مایوسی سے کہا''میں پورے وثوق سے کچھ بھی نہیں کہہ سکتا، جو کہہ سکتا تھا، کہہ چکا۔ ہو سکے تو افتخار کو بتلا دینا کہ اُس کی کزن کسی بہت بڑے حادثے کا شکار ہو گئی ہے یا ہونے والی ہے، اُسے جنت سے نکال کر دُنیا میں بھیج دو۔خدا حافظ میڈے اکھڑ مزاج سئیں!''

پروفیسر کے کچھ کہنے سے پہلے ہی رابطہ منقطع ہو گیا۔افتخار نے جلدی سے پوچھا''ڈاکٹر صاحب کیا کہہ رہے تھے؟''

پروفیسر نے کوئی جواب نہ دیا۔ماتھے پر آیا پسینہ پونچھتے ہوئے سوچ میں پڑ گیا''یہ کیسے ممکن ہے؟

اَشولال کو جھوٹ بولنے کی عادت نہیں اور نہ ہی اُسے اپنی نمائش کا شوق ہے۔ اگر ہوتا تو اِس وقت کروڑ پتی ہوتا، سونے کا نوالہ منہ میں رکھتا، چاندی کی مسہری پر سوتا...... کچھ بھی کرتا، فقر اختیار نہ کرتا۔''

تھکے تھکے لہجے میں بولا'' یار افتخار! تم اپنے گھر چلے جاؤ۔ مصباح گھر سے بھاگی نہیں، قسمت نے اُسے کسی رُونما ہونے والے حادثے میں کھینچ لیا ہے۔ جاؤ...... اُسے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔''

وہ خود بھی جلد از جلد گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ پروفیسر کے حکم پر ریموٹ کنٹرول اُٹھالایا، ٹیبل پر رکھا اور سر جھکا کر بوٹ کی طرف بڑھ گیا۔ اُس کے ذہن میں جھکڑ چل رہے تھے۔

بوٹ ریموٹ سے نکلتی لہروں سے بندھ کر واپس آ گئی تو پروفیسر فون پر ڈاکٹر اَشولال سے رابطہ کیا۔ اُسے مصباح کے بارے میں بتلایا۔ پھر پوچھا'' مگر مُرشد! کیا تم پر کوئی الہام اُترا ہے؟''

''میرا عقیدہ ہے کہ دُنیا کو الہام کی طلب نہیں رہی، میں جو کچھ گزشتہ کئی دنوں سے دیکھتا آ رہا ہوں، وہی بتلا رہا ہوں۔ میں عجیب سے ڈر کا شکار ہوں، سوچتا ہوں کہ میں کسی بہت طاقتور شئے کی حرکات وسکنات کا گواہ بنتا جاتا ہوں۔ کہیں یہ نہ ہو کہ مجھ پر راز افشائی کا مقدمہ بن جائے، مجھے سزا سنادی جائے۔ اِس لئے کھل کر کچھ کہتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں۔'' اَشولال نے گھمبیر لہجے میں کہا تو پروفیسر کی ریڑھ کی ہڈی سنسنا اُٹھی۔ وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا'' کیا مصباح کے انجام کو بھی دیکھ رہے ہو؟''

''اَبھی تک ایسا کچھ بھی دکھائی نہیں دیا، شام کو دیکھنے کی کوشش کروں گا۔''

''کیا لوحِ محفوظ کی کوئی شبیہہ دکھائی دینے لگی ہے تمہیں؟'' پروفیسر کے لہجے میں گہری کاٹ تھی جسے اَشولال محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اُس نے کہا'' میرا خیال ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ لوحِ محفوظ پر ایک واقعہ درج نہیں ہوسکتا، اَن گنت ہوں گے۔ یہاں صرف چند کرداروں پر مشتمل ایک فلم چلتی دکھائی دیتی ہے۔''

''کیا اُس فلم کے کسی منظر میں میں بھی دکھائی دیتا ہوں؟''

''ہاں!'' اَشو نے پورے وثوق سے کہا۔

''ناممکن ہے مُرشد!'' پروفیسر نے زور زور سے سر ہلا کر کہا ''تم مجھے یہاں سے نکال کر اپنی دُنیا میں لانے کیلئے نئی چال چل رہے ہو۔''

''واللہ! میں ایسا ہر گز نہیں کر رہا ہوں۔ سوچتا ضرور ہوں، سوچ کر کڑھتا بھی رہتا ہوں مگر یہ معاملہ یکسر مختلف ہے۔''

پروفیسر نے غیر فطری انداز میں قہقہہ لگایا۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ اُس کا قہقہہ قطعاً کھوکھلا تھا۔

اَشولال نے کہا ''شاید مجھے دکھایا جانا مقصود ہے یا مجھے سزایاب کرنے کیلئے مجرم بنایا جا رہا ہے، کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ہاں دوست! مجھے یہ بھی دکھایا گیا ہے، جس کی پہلے سمجھ نہیں آتی تھی، اَب آنے لگی ہے کہ مصباح کو اُس کے کسی دوست نے اپنے ساتھ لیا تھا، پھر درندوں نے اُس سے مصباح کو چھین لیا...... اِس کے بعد وہ دونوں کس حال میں ہیں؟ یہ تو سوہنا رَب ہی جانتا ہے۔''

ایسے ہی وقت میں فون کے سپیکر سے ٹوں ٹوں کی آواز اُبھرنے لگی۔ پروفیسر کا فون تہی دامن ہو گیا تھا۔ پری پیڈ کارڈ لوڈ کرنے کے بعد اُس نے دانستہ ڈاکٹر اَشولال سے رابطہ نہیں کیا۔ وہ اپنے طور پر کبھی اَشولال کی باتوں کو جھٹلانے لگتا، کبھی سوچ کر دہلنے لگتا، عجیب کیفیت میں مبتلا ہو کر اپنے لئے کھانا تیار کرنے لگا۔

وہ سہ پہر تک انٹرنیٹ پر اپنی پسندیدہ ویب سائٹس کھولے بیٹھا رہا۔ آج کوئی آگ اگلتا ہوا بدن توجہ حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہا تھا، کوئی اَدبی شاہ پارہ اپنی ٹرانس نہیں بنا سکا تھا اور نہ ہی دریا کے لمحہ لمحہ اُترتے پانی کو دیکھتے رہنے پر طبیعت مائل ہو رہی تھی۔ وہ سوچتے سوچتے تھک کر سب لوگوں کو کوسنے لگے۔ لعن طعن کرنے لگا جنہوں نے اُس کی جنت میں اَپنے دُکھ اُتار دیے تھے۔ ایسے میں ایک دو مرتبہ اُس کا جی چاہا کہ افتخار سے رابطہ کر کے موجودہ صورتِ حال سے آگہی حاصل کرے پھر خود ہی اپنی خواہش کا گلا دَبا دیا۔ اِنہی ناانصافیوں اور انسان دُشمن بے ضابطگیوں سے فرار حاصل کرنے کیلئے اُس نے سندھ کی لہر دَر لہر سطح پر پناہ حاصل کی تھی۔ شام کو اَشولال نے دو مرتبہ اور افتخار بیگ نے متعدد مرتبہ فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر پروفیسر نے کال اوکے نہیں کی۔ وہ اپنے خول میں سمٹ کر چھپ بیٹھا تھا۔

وقت سے پہلے کھانا کھا کر چھت پر آ گیا۔ مچھر دانی میں گھس کر لیٹ گیا۔ چند ہی لمحوں میں اُس پر نیند اپنا غلبہ اُتارنے لگی۔ جب جی چاہا، سو گیا، جب جی چاہا، جاگ گیا، یہی آزادی اُسے درکار تھی جو اُس کی جنت اُسے فراہم کر رہی تھی۔ نہ جانے رات کے کس پہر میں اُس کی آنکھ کھل گئی۔ بیداری کا سبب پیاس کی شدّت تھی۔ اُس نے چارپائی کے نیچے پڑی ہوئی پانی کی بوتل اُٹھائی۔ ہاتھ کے لمس نے بتلا دیا کہ پانی گرم ہو چکا ہے۔ بادلِ نخواستہ چھت سے اُترا اور فریج کی طرف بڑھا۔ پانی کی بوتل نکال کر منہ سے لگائی۔

عرشے پر آ کر آسمان کی جانب دیکھ کر وقت کا اندازہ لگانے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔ پلٹ کر بیڈ روم میں گیا۔ سگرٹ کیس اور لائٹر اُٹھا کر عرشے پر آ گیا۔ جی چاہا کہ رات کے اِس پہر میں پانی کی ٹھنڈک کو بدن میں اُتارا جائے۔ جنت کی بغلی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ گھٹنوں تک ٹانگیں پانی میں بھیگ گئیں۔ اُسے رات کے اِس پہر میں کسی بھی سانپ کا خوف لاحق نہیں تھا۔ ٹھنڈے پانی نے چند ہی منٹوں میں اُسے پرسکون کر دیا۔ پانی کی سطح پر دونوں کھلی ہتھیلیاں مارتے ہوئے چھپاک کی مخصوص آواز سے لطف اندوز ہوتا رہا، وقت گزارتا رہا۔ سگرٹ کی طلب ہوئی تو اُس نے سگرٹ سلگا لی۔

ہر طرف سکون ہی سکون تھا۔ پانی کی سطح پر پھیلی ہوئی چاندنی عجیب نظارہ پیش کر رہی تھی۔ چاندنی کے انعکاس کی وجہ سے پانی کی سطح میلی دکھائی نہیں دیتی تھی بلکہ یوں لگتا تھا جیسے دریا کے پانی پر کسی نے سفید رنگ کی چمکیلی چادر اوڑھا دی ہو۔ اُس پر جذب کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ آنکھیں موند کر بڑی آہستگی سے خود کلامی کرنے لگا ''اے سندھو سائیں! آج پتہ چلا کہ تجھ میں خدائی اوصاف بھی پائے جاتے ہیں۔ تو رات کے ہر پہر میں جاگتا ہے۔ ہر پہر میں تیری جولانی الگ ہوتی ہے...... ہائے! تو خدا کی طرح مہربان کیوں نہیں؟ تجھے اپنے غریب ساتھیوں کو نگل لینے میں کیا لطف آتا ہے؟''

سطحِ آب پر کہیں کہیں مچھلیاں اُبھر کر چھلانگیں لگاتیں، پھر پانی میں گم ہو جاتیں۔ سکوت میں پانی کے بہاؤ کی مخصوص آواز اور تَل سے ٹکرا کر ایک تواتر کے ساتھ اُبھرنے والے پانی کا شور سماعت میں کئی لطافتیں بھر رہا تھا۔ اُس نے سیڑھی کی بغلی ریلنگ کے ساتھ سر ٹکا دیا۔ اُسے افسوس ہونے لگا

تھا کہ وہ رات کے اِس پہر کے چاند سے اَب تک کیوں نہیں ملا تھا۔

جنت کے مخصوص ہچکولوں میں ایک ناشناسا جھٹکا بہت بُرا محسوس ہوا۔ اُس نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور اردگرد دیکھا۔ کچھ دکھائی نہیں دیا۔ وہ ہتھیلیوں کے بل اُٹھ کر اوپر والی سیڑھی پر بیٹھ گیا۔ اچانک جنریٹر کے گھومتے ہوئے پَر کے قریب پانی میں غیر معمولی حرکت دکھائی دی۔ اُس نے چونک کر غور سے دیکھا۔ ایک گھٹڑی سی پَروں سے ٹکرائی تھی یا ٹکرانے والی تھی۔ اچانک گھٹڑی کھل گئی۔ اَب وہ اُس کی نگاہوں کے عین سامنے تھی۔ چاند کی روشنی میں اُس نے پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کی کہ پانی میں لوٹ پوٹ ہوتا وجود کسی عورت کا تھا۔ وہ چونک گیا۔ یہ تعین کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ پانی میں بہہ کر یہاں تک پہنچنے والا ننگا وجود زندگی کی حرارت رکھتا ہے یا ساگر کے پانی کی طرح ٹھنڈا ٹھار ہو چکا ہے۔

بہہ کر آتی ہوئی عورت کے ہاتھوں میں اچانک حرکت پیدا ہوئی۔ شڑاپ کی آواز نے اُس کے زندہ ہونے کا ثبوت پیش کیا تو وہ بُری طرح نروس ہو گیا۔ عورت کا چہرہ نظر نہیں آتا تھا بلکہ پانی کی سطح پر بال ہی بال پھیلے ہوئے تھے جنہوں نے چہرہ اور نچلا وجود چھپا رکھا تھا۔ اچانک بالوں کے نیچے سے ایک ہاتھ نکلا، سطحِ آب پر پھیلے ہوئے بالوں میں چہرے کے آثار دکھائی دیے تو وہ غیر ارادی طور پر مزید ایک سیڑھی اوپر چڑھ گیا۔ عورت کا ہاتھ ہوا میں لہرایا اور برق رفتاری سے سیڑھیوں کی گول پائپ والی ریلنگ پر پڑا اور چمٹ گیا۔ عورت کا چہرہ پانی سے نکل کر چاند کی روشنی میں دکھائی دے رہا تھا مگر نقوش پر سر کے لانبے لانبے بال چپکے ہوئے تھے۔ پروفیسر نے اُسے غور سے دیکھا، اندازہ ہؤا کہ وہ بولنے کے قابل نہیں ہے۔ اُس نے اپنے بائیں پیر کو بڑھایا اور ریلنگ پر عورت کے ٹکے ہوئے ہاتھ کو پَرے کھسکا دیا۔ ہاتھ کی گرفت دَم توڑ گئی اور وہ ''ڈب'' کی آواز کے ساتھ پانی کے اندر چلی گئی۔ چند لمحوں کے بعد سطحِ آب پر اُبھری اور اُس نے پھر ہاتھ بڑھا کر ریلنگ تھام لی۔ پروفیسر نے پھر پاؤں کی مدد سے اُس کا ہاتھ چھڑا دیا۔

تیسری مرتبہ اُس کی گرفت کو چھڑانے کیلئے پروفیسر کو اپنی پوری قوت صرف کرنا پڑی۔ دانت پیس کر بڑبڑایا ''زندگی شئے ہی ایسی ہے، جانے لگتی ہے تو انسان اتنی مضبوطی سے پکڑتا ہے کہ خدا کے

علاوہ کوئی اپنی جانب کھینچ نہیں سکتا......تم مرنے والی ہو، تڑپ تڑپ کر مرو گی تو سندھو سائیں کو قرار آئے گا۔''

اُسے عجیب لگا تھا کہ تینوں مرتبہ اُسے موت کے منہ میں دھکیلنے پر اُس نے چیخ و پکار نہیں کی تھی، کوئی واویلا یا مدد کی پکار اُس کے حلق سے برآمد نہیں ہوئی تھی اور یہ نہائت غیر فطری بات تھی۔ چوتھی مرتبہ جب اُس نے ریلنگ کو دائیں ہاتھ سے پکڑا تو پروفیسر نے اپنا پاؤں پیچھے کھینچ لیا اور انہماک سے اُس کی زندگی بچانے کی جدوجہد کو دیکھنے لگا۔

وہ کئی منٹوں تک ساکت رہی۔ اُس کا وجود گردن تک پانی میں ڈوبا ہوُا تھا۔ لمبے بالوں کو پانی بہا کر ایک طرف لے جا رہا تھا جس کی وجہ سے اُس کا آدھا چہرہ چاند کی روشنی میں دکھائی دینے لگا تھا۔ پروفیسر کو جھرجھری سی آئی۔ وہ یقیناً خاصی ڈراؤنی تھی۔

اُس کی آنکھوں میں زندگی کی رمق پیدا ہوئی۔ بولنے کیلئے منہ کھولا تو منہ سے پانی کا فوارا اُبل پڑا۔ پانی خاصی مقدار میں پیٹ میں جمع ہو چکا تھا۔ پروفیسر نے چہرے سے نظریں ہٹا لیں، ریلنگ تھامے بازو کو دیکھا۔ عجیب سا لگا۔ چہرہ ڈراؤنا تھا، بازو اور ہاتھ کی انگلیاں پُرکشش تھیں۔ اچانک انگلیاں ریلنگ پر سے پھسلنے لگیں۔ یقیناً وہ اپنی زندگی پر سے گرفت کھونے لگی تھی۔ پروفیسر کے لبوں پر عجیب سی مسکراہٹ اُبھر آئی۔

اچانک اُس کے حلق سے عجیب سی آواز نکلی اور اُس نے دانت پیستے ہوئے دوسرا بازو پانی سے نکال کر ریلنگ تھام لی اور سر جھکا لیا۔ اُس کے منہ سے پانی اَبھی تک نکل رہا تھا۔ پروفیسر بنا آنکھ جھپکے اُسے دیکھ رہا تھا مگر اُس کی مدد کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ عورت نے کچھ دیر تک ساکت رہ کر اپنے پانی زدہ پھیپھڑوں میں ہوا اُتاری، دَم لیا اور دوبارہ بولنے کی کوشش کی۔ ناکام ہو کر پھٹی پھٹی نگاہوں سے پروفیسر کو دیکھنے لگی۔ پروفیسر نے چند لمحوں تک اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں، پھر تاب نہ لا کر اُس کے دونوں سوجن زدہ ہاتھوں کو دیکھنے لگا۔ خود پر پوری طرح قابو پا کر اُس نے سگریٹ سلگائی اور اپنے مخصوص انداز میں کش لینے لگا۔ وہ دانستہ ڈوب کر اُبھرنے والی آنکھوں میں جھانکنے سے گریز کر رہا تھا کیونکہ اُن آنکھوں سے مترشح زندگی کی فریاد اُس کے ارادے کو متزلزل کر سکتی تھی۔ وہ

بڑی بے رحمی سے اُس کی جدو جہد کو مزید کچھ دیر تک دیکھنا چاہتا تھا۔

پروفیسر کو شائبہ پڑا کہ اُس کے کانوں میں ''بچاؤ'' کی آواز پڑی ہو۔ اُس نے چونک کر عورت کے چہرے کی طرف دیکھا۔ لب ہل رہے تھے اور منہ سے پانی بہہ رہا تھا۔ ہلتے ہوئے لبوں پر واقعتا ''بچاؤ'' ہی ثبت تھا۔ پروفیسر کے جسم میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوئی تو اُس کی آنکھوں میں مایوسی بھر گئی۔ اُس نے یکبارگی سے اپنے بدن کی پوری قوت صرف کی اور پانی میں خاصی بلندی تک اُٹھ آئی۔ پروفیسر کو اُس کا عریاں بدن دیکھ کر ایک جھٹکا سا لگا۔ منہ پھیر کر جلدی جلدی سیگرٹ کے کش لینے لگا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ چند لمحوں میں ہی ڈھیر سارا دھواں حلق سے اُتار کر بدن میں حبس بھرنا چاہتا ہو۔ پروفیسر اپنی جنت کے بڑھتے ہوئے ہچکولوں کو محسوس کرتے ہوئے عورت کی جستجو کو ماپتا رہا پھر اچانک گردن موڑ کر بولا ''اے! تم کون ہو؟''

ایک مدھم سی آواز سنائی دی ''بچاؤ!''

''میں نے جو پوچھا ہے، اُس کا جواب دو۔'' وہ غرایا۔

''بب......بچا!''

وہ حلق کے بَل چیخا ''میں پوچھتا ہوں، کون ہو تم؟''

''خدا......خدا......کک......بچ!''

وہ ایک جھٹکے کے ساتھ کھڑا ہوا۔ فلٹر تک جل جانے والا سیگرٹ اُس پر اچھال دیا اور مجنونانہ انداز میں قہقہے لگاتا ہوٴا عرشے پر چڑھ گیا۔ رُک کر چند لمحے اُسے دیکھتا رہا پھر پیچھے مُڑ کر دیکھے بغیر تیزی سے چھت پر چڑھ کر ریلنگ پر جھک گیا۔ دونوں ہاتھ ریلنگ پر ٹکائے کچھ دیر تک پھیلے بالوں کا سیاہ دھبہ دیکھتا رہا، پھر بڑبڑاتا ہوٴا چارپائی پر لیٹ گیا۔ اُسے یقین تھا کہ تھوڑی ہی دیر میں عورت کی سکت جواب دے جائے گی اور وہ ساگر کے خاموش پانی میں ڈوب جائے گی اور کبھی نہ ڈوبنے کیلئے سطحِ آب پر اُبھر کر گم ہو جائے گی۔ اِنہی خیالات کی یورش میں سونے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ ایسے میں اُس کا دھیان جنت کے ہچکولوں میں کمی کی طرف گیا۔ شاید زندگی اور موت کی جنگ میں زندگی نے سپر ڈال دی تھی اور ریلنگ اُس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔

وہ حلق کے بَل چیخا ''سندھوسئیں! آج تو نے کمال کر دکھایا۔ مَرد کو جنت سے نکلوانے والے ایک وجود کو بے وجود کر دیا۔ ہاہ! اَن گنت مَردوں پر اپنے بدن کی بجلیاں گرانے والی تیرے تَل میں پہنچ کر خاکستر ہو جائے گی۔ تو نے بہت اچھا کیا۔ تو نے بہت اچھا کیا۔''

وہ چارپائی میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ دیوانوں کی طرح قہقہے لگاتے ہوئے چیخنے لگا ''اے سندھو! غریبوں کے مشقت زدہ جسموں کو نگلتے نگلتے تجھے اُن کا گوشت کھانے کی عادت سی ہو گئی تھی۔ آج تو نے ایک امیر زادی کے پُرگداز بدن کو چکھ لیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ آئندہ تو کسی غریب کے جھریوں بھرے، بوڑھے اصیل مرغ کے چھیچھڑوں جیسے بدن پر اپنی آنکھیں نہیں گاڑے گا بلکہ ہر آن امیر زادوں کی طرف لپکتا رہے گا۔ یقین مان! یہ کوئی جرم نہیں ہے۔ یہ کوئی انیائے نہیں ہے۔ یہ تو خراج ہے جو تو اِن ظالموں سے حاصل کرے گا۔ اِنہی لوگوں نے تیرے بیٹوں کو قتل کیا تھا۔ یہی وہ لوگ ہیں جو تیرے فطری بہاؤ کے دُشمن ہیں۔''

بے ارادہ چھت سے اُتر آیا۔ کنٹرول روم میں گیا اور جنت کی تمام لائٹس آن کر دیں۔ آہستہ رَوی سے چلتا ہوا سیڑھیوں تک آیا۔ ریلنگ پر ہاتھ دکھائی نہیں دیا تو عافیت کا سانس حلق سے خارج ہوا۔ ایک ننھی سی کسک دِل میں جاگ پڑی۔ ضمیر نے مُردہ دِلی سے کہا ''تمہیں ایک انسان کی جان بچانے کے قابل کیا گیا تھا، تم نے اپنی قابلیت کو ضائع کر دیا۔ تیرا کیا چلا جاتا کہ اُس کا ہاتھ تھام کر اوپر کھینچ لیتا۔''

سیڑھیوں پر قدم رکھا تو اُسے دوسری ریلنگ کے ساتھ چمٹے ہوئے دیکھا۔ وہ سانس لے رہی تھی مگر اُس کے بدن میں کوئی حرکت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ایسے میں اُس کا دِل پسیج گیا۔ زندگی بہت پیاری ہوتی ہے۔ اپنی زندگی کو بچانے کیلئے ہاتھ پیر مارتی عورت پر اُسے رحم آ گیا۔ اُس نے جھک کر اُس کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لئے۔ اپنی پوری قوت صرف کر کے اُسے اوپر کی طرف کھینچنے لگا۔ پانی نے بھی اُس کی مدد کی، اُسے کچھ اچھالا دیا۔ چند لمحوں کے بعد وہ عرشے پر اُس کے پیروں میں چاروں شانے چت پڑی تھی۔ اُس کی بے تاثر آنکھیں کھلی ہوئی تھیں جن میں زندگی کی رمق اَبھی باقی تھی۔ روشنی اُس کے بدن پر پڑ رہی تھی۔ پروفیسر نے بہ غور دیکھ کر زیرِ لب کہا ''اِتنی بھی گئی گزری نہیں، نہ

جانے کن حالات کی ماری ہوئی ہے؟''

وہ ہوش میں ہوتے ہوئے بھی بے ہوش تھی۔ پروفیسر اُس کے پاس بیٹھ گیا۔ نبض اور دل کی دھڑکن چیک کرنے پر اُس کی خستہ حالی کا شدّت سے احساس ہوا۔ اُس کا پیٹ دَبا کر پانی نکالا تو وہ کراہنے لگی۔ پروفیسر نے تیز روشنی میں اُس کے تمام تر برہنہ وجود پر جا بہ جا تشدد کی علامتیں دیکھیں اور اُسے یقین ہو گیا کہ زندگی کی جنگ بہ دقّت تمام جیتنے والی لڑکی عصمت کی بازی پوری طرح ہار کر پانی میں اُتری تھی۔ چھوٹے چھوٹے اَن گنت زخموں کو دریائی پانی نے سوزش زدہ کر دیا تھا۔ جا بہ جا نیل دکھائی دے رہے تھے اور...... یہ دیکھ کر اُسے جھرجھری سی آ گئی کہ اُس کے نازک اندام بدن پر دست درازوں کی انگلیوں تک کے نشان ثبت تھے۔

اسی اثناء میں لڑکی کا بدن کپکپانے لگا۔ اُس کے دانت بھی بجنے لگے۔ پروفیسر نے اُسے اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور بیڈ روم میں لے آیا۔ کمرے کی فضا اُس کیلئے نسبتاً بہتر تھی۔ گردن تک چادر اوڑھا دی اور طبی تقویت دینے کا اہتمام کرنے لگا۔ اُس نے جنت میں آنے سے پہلے ابتدائی طبی امداد پہنچانے کی تربیت حاصل کی تھی۔ اُس ٹریننگ کو آزمانے کا سخت جان کن موقع آج کی شب میں وارد ہو چکا تھا۔

نصف گھنٹے میں اُس نے تین انجیکشن لگائے۔ اُس کے منہ میں دوا کے قطرے ٹپکائے اور جب پوری طرح مطمئن ہو گیا تو بیڈ روم سے باہر نکل آیا۔ سموں نے اُسے آزمائش میں ڈالا تھا، وہ کامیاب رہا تھا۔ آج اِس نو وارد نے اُس کی آنکھوں اور بدن کو تشویش ناک امتحان میں ڈال کر رکھ دیا تھا مگر اُس نے اپنی جذباتی کیفیت کو کسی لمحے میں بھی خود پر حاوی نہیں ہونے دیا تھا۔ ایک مرتبہ پھر وہ عورت کی ضرورت کے فلسفے کو عملی طور پر جھٹلانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

عرشے پر ریلنگ سے کمر ٹکائے وہ کافی دیر تک بیٹھا سوچتا رہا۔ اُس کی جنت میں ایک بار پھر سموں اپنا رُوپ بدل کر قدم رکھ چکی تھی۔ جونہی سگرٹ سلگایا، ہاتھوں کی انگلیاں کپکپانے لگیں اور آگ کی اِک عجیب دوشاخہ لپٹ نے اُسے اپنے حصار میں لے لیا۔ بہت پہلے چھوڑ جانے والی مریم کا مرمریں بدن آنکھوں میں لہرا گیا۔ بے سبب چھوڑ جانے والی رُباب کا عضو عضو یاد آنے لگا جو اُس کی

ہر ناممکن تنہائی میں بولنے لگتا تھا اور مدہوشی طاری کرنے والا نغمہ بن کر اُسے اپنی جانب کھینچنے لگتا تھا۔
اُس نے سر جھٹکا۔ دانت پیس کر بڑبڑایا ''میں اُن کم ذاتوں کو کیوں یاد کر رہا ہوں؟ کیا میرے وجود پر اِس عورت کے بدن کا لمس اپنی تاثراتی الائشیں چپکانے میں کامیاب ہو گیا ہے؟''

اُس نے دائیں ہاتھ کا مکا بنایا اور پوری قوت سے فرشی تختے پر دے مارا۔ چوٹ لگی مگر اُس چوٹ کی کسک کو دَبا نہ سکی جو اُس کے شعور میں جاگزیں ہو چکی تھی۔

...(✿)...

گرمی اور حبس کے باوجود ڈاکٹر اَشولال کے گلے میں حسبِ معمول مفلر جھول رہا تھا۔ اُس کے پہلو میں شناں کھڑی تھی جو وقفے وقفے سے بڑی عجیب نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ بولی ''بچوں کے کھیل کو اتنے انہماک سے دیکھتے ہوئے آپ بڑے عجیب سے لگتے ہیں۔''

ڈاکٹر نے اپنی توجہ کھڑکی کے پار مبذول رکھی، سرگوشی کے سے انداز میں بولا ''شناں!''

''جی!''

''قسمت کو دیکھ رہی ہو؟''

''جی! کیا ہوَا اُسے؟''

''وہ واقعی قسمت ہے۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟'' شناں نے چونک کر کہا ''میں نے کب کہا ہے کہ وہ قسمت نہیں ہے۔''

وہ مزید کچھ کہے بغیر خاموشی سے باہر دیکھتا رہا۔ شناں نے یاد دِلایا کہ آج بیرونِ شہر سے آئے ہوئے چند دوستوں سے ملنے کیلئے اُسے کہیں جانا تھا۔ اُس نے نفی میں سر ہلا کر کہا ''مجھے اپنے ہنس کو دیکھنے دو، مجھے ہنس کی قسمت کو دیکھنے دو۔ یہ زیادہ ضروری کام ہے۔''

وہ ہونٹ بھینچ کر کچن کی طرف چل دی۔

کھڑکی کے باہر خاردار تاروں والے پلاٹ میں ایک دُنیا آباد تھی۔ ہنس اور قسمت ایک دوسرے سے جُڑ کر بیٹھے تھے اور نہ جانے اُن کے مابین کیا باتیں ہو رہی تھیں۔ یہی پتہ چلتا تھا کہ وہ کسی اختلافی

مسئلے کا شکار ہو گئے ہیں۔ اُس نے کان لگائے مگر سمجھ نہ پایا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا کوارٹر کے عقبی دروازے سے نکل کر سنتھے کی باڑ کی اوٹ میں آ گیا۔ اَب وہ اُن کی باتیں سن سکتا تھا۔

قسمت کہہ رہی تھی ''فینی کو کتوں نے چیر پھاڑ کر پھینک دیا اور وہ کشتی میں چلی گئی ہے۔''

''مگر اُس کے جسم پر کوئی زخم تو ہے نہیں...... جھوٹ کیوں بولتی ہو؟''

''تم بے وقوف ہو ہنس!''

''تم بھی!'' وہ گردن موڑ کر جلدی سے بولا ''دکھاؤ کہاں چوٹ لگی فینی کو؟''

وہ کوفت سے بولی ''تمہیں بتلایا تو تھا کہ اُسے خواب میں چوٹیں لگتی ہیں۔''

''تو کیا وہ خواب میں کشتی پر گئی ہے؟'' ہنس نے سوچ کر پوچھا۔

قسمت نے اپنے سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی اپنی پیشانی پر ''چٹاک'' سے ماری اور غصے سے بولی ''تم کوئی بات سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے ہو۔ میں جب کہہ رہی ہوں کہ فینی زخمی ہے تو پھر زخمی ہے۔ بس!''

ہنس نے زچ ہو کر کہا ''چلو ٹھیک ہے، وہ زخمی ہے مگر اُس کا کشتی میں کیا کام؟...... پوڈو کا موڈ خراب ہو جائے گا جب اُسے کشتی میں دیکھے گا۔''

''میں اُسے سمجھا لوں گی۔''

''کیسے؟'' وہ اتفاق کرنے پر تیار نہیں تھا۔

''ایسے!'' قسمت نے جھٹ سے ہنس کا چہرہ تھاما اور گال پر متواتر تین چار بوسے ثبت کر دیے۔ ہنس نے اپنا چہرہ اُس کی گرفت سے چھڑایا اور اُسے دھکا دے کر گراتے ہوئے بولا ''پوڈو بھی اِسی طرح فینی کو دھکا دے کر دریا میں پھینک دے گا۔ دیکھنا، ہاں!''

وہ بڑا خوش قسمت تھا۔ قسمت کو دھکا دے کر بھی اپنے پیروں پر جما بیٹھا تھا۔ وہ اُٹھی اور دونوں ہاتھوں کے ننھے ننھے مکوں سے اُسے پیٹنے لگی۔ وہ بجائے چیخنے چلانے یا مدافعت کرنے کے ہنسنے لگا۔ بیٹھے رہنا ڈاکٹر پر گراں گزرنے لگا تو وہ باڑ کے عقب سے نکل کر اُن کے قریب آ گیا۔ قسمت اُسے دیکھ کر گھبرا گئی۔ ہاتھ رک گئے۔ اُس نے پیار بھرا ہاتھ اُس کے سر پر رکھا اور اُس کا ڈر رفع کیا۔ ہنس

نے کہا ''بابا! پوڈو کی فرینڈ آ گئی ہے۔''

بابا کے ہونٹ سختی سے بھنچ گئے۔ دونوں کے درمیاں پیروں کے بَل بیٹھتے ہوئے بولا ''قسمت بیٹا! پوڈو کی فرینڈ فینی ہے، ہیں ناں؟''

''جی انکل!''

''بابا! دیکھیں، یہ زخمی نہیں ہے مگر قسمت کہتی ہے کہ......''

''بیٹا! قسمت کی بات مان لیتے ہیں۔'' بابا نے گالوں پر چپت لگاتے ہوئے کہا تو ہنس بُرا سا منہ بنا کر خاموش ہو گیا ''ہاں تو قسمت بیٹا! یہ بتاؤ کہ فینی کب تک پوڈو کے پاس رہے گی؟''

''جب تک میں چاہوں گی۔'' اُس نے معصومیت سے جواب دیا تو ڈاکٹر اَشولال اُسے ایک ٹک دیکھے گیا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ معصوم لبوں پر اتنی بڑی حقیقت اَٹل حیثیت میں اُس کے سامنے آئی تھی۔ گلے سے لپٹے ہوئے مفلر کے نیچے پسینے کی کئی لکیریں رینگنے لگیں۔

''میری پیاری سی بیٹی کیا چاہتی ہے؟''

قسمت کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔ سپاٹ نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔ وہ بلا جواز کھسیا کر بولا ''چلو چھوڑو اِس بات کو، یہ بتاؤ کہ فینی کا کزن کس حال میں ہے؟''

ہنس بولا ''میں بتاؤں بابا؟''

اُس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔ ہنس نے جوش سے کہا ''وہ فینی کو تلاش کر رہا ہے۔''

''تمھیں مجھ سے زیادہ پتہ ہے؟'' قسمت کی پیشانی پر بَل پڑ گئے ''انکل! فینی کا کزن سارا دِن اکیلا بیٹھا روتا رہتا ہے۔ مدھو کو میں نے اپنے ٹوائے بیگ میں بند کر دیا ہے اور ہاں انکل! میرے پاپا کہتے ہیں کہ آپ اُس کوارٹر میں اکیلے بیٹھ کر گانا گاتے ہیں۔ ہیں؟''

اُس کے لبوں پر مسکراہٹ تیر گئی۔ منہ سے کچھ نہیں بولا مگر آنکھوں سے اثباتی تأثر چھوڑنے لگا۔ قسمت اور ہنس اُس سے چمٹ گئے اور گانا سننے کی فرمائش کرنے لگے۔ وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد اُنہیں بغلوں میں لئے اپنی سکون گاہ کی طرف بڑھ گیا۔ اُسے آج اپنی زندگی کے دو بہترین سامع میسر آ گئے تھے۔

مسلسل بند رہنے کی وجہ سے کوارٹر خاصا حبس زدہ تھا۔ اُس نے کھڑکیاں کھول دیں۔ پنکھا پوری رفتار سے چلا دیا۔ دَس پندرہ منٹ کے بعد کمرے کی فضا کچھ بہتر ہوئی تو اُس نے دونوں کو اپنے سامنے بیٹھایا۔ بیچ میں ہارمونیم رکھا اور آنکھیں موند کر لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ پھر خاموشی کے بطن سے ایک دردناک ساز نے جنم لیا جس نے چند ہی لمحوں میں دونوں سامعین کو اپنی ٹرانس میں جکڑ لیا۔ پانچ سُروں کے ایمن راگ کو چھیڑتے ہوئے اَشو کے لہجے کا دردساز کا حصہ بن گیا۔

بھاگ وَندلوک ہن

زاریاں منیندے

نئیں

(آقائی طبیعت رکھنے والے منت وسماجت پر کان نہیں دھرتے)

اُس نے دوسری مرتبہ اپنی آواز کو نسبتاً بلند کرلیا۔قسمت اُس کی بند آنکھوں اور لرزتے لبوں کو بڑے انہماک سے دیکھ رہی تھی، کچھ سوچ رہی تھی اور اُس کی آنکھوں میں عجیب بے نام سی اُداسی رَچ گئی تھی۔

باجھری چھٹیندے ہن

پکھیاں کوں ڈریندے

ہن

(باجرہ چھٹتے ہوئے پرندوں کو ڈرا کر اُڑا دیتے ہیں)

اُس کی آواز بتدریج گہرے دُکھ کی غماز ہوتی جاتی تھی۔ایسے میں قسمت کی ماما کھلی کھڑکی میں آن کھڑی ہوئی۔ وہ کسی کام سے اپنے کوارٹر سے برآمد ہوئی تھی اور قسمت اور ہنس کو نہ پا کر اِس طرف آنکلی تھی۔اُسے پہلے تو قسمت اور ہنس کا انہماک بڑا عجیب لگا مگر جب اُس نے ڈاکٹر اَشو لال کی کیفیت کو دیکھا تو ٹھٹک گئی۔اُس کے لب نیم وا ہو گئے۔

اَشو لال کے دونوں ہاتھ مخصوص مضطربانہ انداز میں حرکت کررہے تھے اور لبوں پر آشفتگی رقصاں تھی۔

پکھیاں دے پَر نیلڑے

سئیں مِلے کہیں حیلڑے

(پرندوں کے پر موت کی نیلاہٹ میں رنگ چکے ہیں، اَب تو مُرشد کو کسی نہ کسی بہانے آن ملنا چاہیے)

اُس کی آنکھوں سے دو ننھے ننھے قطرے ٹپک پڑے جنہوں نے کمرے میں پھیلے ہوئے سُروں کو نم کر دیا۔ وہ بار بار ''بھاگ وَندلوک ہِن'' کا وِرد کر رہا تھا اور ایسے میں یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بتدریج خِرد سے بیگانہ ہوتا جاتا تھا۔ دریائے سندھ کے پانی کی طرح لفظ آگے کی سمت بہہ رہے تھے اور قسمت کی ماما اُلٹے قدموں پیچھے ہٹ رہی تھی۔ بدقّت تمام کھڑکی سے ہٹ کر کمرے میں آئی۔ بے حد خاموشی کے ساتھ قسمت کو بانہوں میں بھر کر کمرے سے باہر لے گئی۔ ڈاکٹر اَشولال اور ہنس کو قسمت کے چلے جانے کی مطلق خبر نہیں ہوئی تھی۔

...⁂...

وجدان اور افتخار بیگ ضلع ناظم کی ایماء پر شہاب سے مل کر واپس آئے تو اُن کی مایوسی میں بے حد اضافہ ہو چکا تھا۔ شہاب نے محض اپنی صفائی پیش کی تھی اور مصباح کے وجود سے کامل لاعلمی کا یقین دلایا تھا۔ اُس کی حالتِ زار اور لہجے کے تیقن نے دونوں کے شکوک وشبہات کو ماند کر دیا تھا۔

وجدان کیلئے گھر اور گھر سے باہر کی فضائیں ایک جیسی ہی تھیں۔ گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا، گھر سے باہر کی دُنیا اُسے طعنہ بار نگاہوں سے چھلنی کر دیتی۔ ماما اور پاپا کی اُمید بھری نگاہیں ہر وقت ایک ہی سوال کرتی رہتی تھیں ''مصباح مل گئی؟''

مصباح کو زمین نگل گئی تھی یا آسمان نے اپنی آغوش میں لے لیا تھا؟ خبر نہیں تھی۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا تھا کہ وجدان کے پاپا سلطان علی کے درشت حکم کی اطاعت میں گھر کے کسی فرد نے بھی عمران کو اِس جانکاہ واقعے کی اطّلاع نہیں دی تھی۔ پکے ہوئے پھل کو کپڑے کی تھیلی چڑھا کر نوکیلی چونچوں سے بچانا بہتری حکمت عملی کہلاتا ہے۔ وہ کھوکھلی جڑوں کی بقاء میں سرگرداں رہتے ہوئے بھی اپنے

پھل کومحفوظ رکھنا چاہتے تھے۔

وجدان سے علیحدہ ہوکر افتخار بیگ پولیس اسٹیشن چلا گیا جہاں حوالات میں شہاب کے دونوں دوست بابر اقبال اور فرخ قید تھے۔ تھانے میں ہی دونوں کے والدین سے اُس کی ملاقات ہوئی جنہوں نے اپنے بیٹوں کی بے گناہی کا واویلا مچا رکھا تھا۔ وہ قفل پر نوٹوں کی چابی رکھ کر حوالات کی سلاخوں کے پار کھڑے فرخ اور بابر تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ اپنا تعارف کرانے کے بعد منت آمیز لہجے میں پوچھنے لگا ''پھیلا ہوُا دستِ سوال خالی لوٹاتے ہوئے یہ سوچنا کہ تم دونوں بھی بہنوں والے ہو۔''

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، فرخ نے حیرانی سے پوچھا ''میں کچھ نہیں سمجھا، تم کھل کر بات کرو۔''

افتخار بیگ نے دیکھا کہ دونوں کی حالت خاصی دگرگوں تھی۔ سرکاری مہمانوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک رَوا رکھا جاتا ہے، یہ سوچ کر سر جھٹکتے ہوئے آہستہ سے بولا ''اگر تم دونوں کو علم ہے کہ مصباح کہاں ہے تو خدارا مجھے بتا دیجئے۔ ہمارے خاندان کی عزت داؤ پر لگ چکی ہے، لٹی عزت ہاتھ نہیں آتی، ہاتھ تو واپس آ جائے، یہی سوچ کر تمہارے پاس آیا ہوں۔''

بابر نے جلدی سے کہا ''مگر ہم تو مصباح کو جانتے تک نہیں ہیں، تمہاری کیا مدد کر سکتے ہیں؟''

افتخار بیگ کے حلق میں گولی سی پھنس گئی، بدقّت تمام بولا ''تمہارا دوست شہاب اور میری کزن مصباح، دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ شاید دونوں شادی کا ارادہ بھی رکھتے تھے، کئی دِنوں سے مصباح غائب ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ تم دونوں بھی قتل کے کیس میں اندر پڑے ہو، شہاب بھی ایک حادثے میں ٹانگ تڑوا کر ملتان میں زیر علاج پڑا ہے، یہ سب کیا ہے؟''

دونوں الجھ گئے۔ واقعے کی تمام تر نوعیت سے آگاہ تھے۔ مخمصے میں پڑے ہوئے تھے کہ افتخار کو کیا بتائیں، کیا نہ بتائیں، کیا بتانا اُن کے اپنے فائدے میں جائے گیا اور کون سی خبر اُن کیلئے مزید آزار کا باعث بن جائے گی......شاید دونوں یا صرف فرخ اِس نکتے پر پہنچا کہ اُسے کچھ بھی نہیں بتانا چاہیے، پُر یقین لہجے میں بولا ''افتخار صاحب! ہم دونوں کو بے گناہ پولیس نے قتل کے الزام میں پھنسا دیا ہے۔

دیکھیں! ہمارا انجام کیا ہوتا ہے؟ اگر چھوٹ گئے تو آپ کے ساتھ مصباح کی تلاش کیلئے ضرور نکلیں گے اور کیس کے طول پکڑنے پر اگر ہم حوالات سے جیل بھجوا دیے گئے تو پھر دعا کرنے کے سوا کچھ نہیں کرسکیں گے۔''

افتخار بیگ کے ذہن میں بہت سارے الجھاوے تھے۔ایک ایک کر کے گتھیاں سامنے رکھ رہا تھا ''رضی الدین کی لاش کہاں سے ملی تھی؟''

بابر نے حویلی کا پتہ بتانے کیلئے منہ کھولا مگر فرخ نے تیز نظروں سے گھور کر خاموش کرا دیا اور جلدی سے بولا ''ہمیں تو یہ بھی پتہ نہیں ہے افتخار صاحب! میرا خیال ہے کہ اُس کی لاش اُس کے گھر سے ملی ہے۔''

افتخار کی آنکھیں سلگ اُٹھیں۔یہیں کہیں الجھے ہوئے دھاگے کا ایک سرا چھپا ہوُا تھا جسے پکڑ کر وہ دوسرے سرے تک پہنچ سکتا تھا۔فرخ کی گھورتی ہوئی آنکھوں نے اُسے شکوک وشبہات میں ڈال دیا۔وہ کافی دیر تک اُن کے ساتھ مغز ماری کرتا رہا مگر وہ دونوں محتاط ہوکر معصومیت اور لاعلمی کے خول میں بند ہو چکے تھے۔

تھانے سے نکلتے ہی اُس نے اپنے دوست مظہر عباس کو فون کر کے وجدان کے گھر پہنچنے کی استدعا کی۔گھر پہنچ کر آنٹی کو چائے بنانے کا کہا اور وجدان کے ساتھ ڈرائنگ میں آ کر مظہر کا انتظار کرنے لگا۔اُس کے پہنچنے پر اُس نے اَب تک درپیش آنے والے واقعات سے آگاہ کیا۔شہاب اور اُس کے دونوں دوستوں سے ملاقات کا احوال تفصیل کے ساتھ اُن کے گوش گزار کر کر تشویش زدہ لہجے میں بولا ''مظہر! میرا ذہن کہتا ہے کہ شہاب کی ٹانگ کا ٹوٹنا، رضی الدین کا قتل اور فرخ اور بابر پر اس کے قتل کا الزام آنا، ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں اور سردار اَرباب خان ہمیں الجھا کر مصباح سے دور کرتا جا رہا ہے۔تم اِس بارے میں کیا کہتے ہو؟''

ماما چائے دینے کیلئے ڈرائنگ روم میں آئی۔تینوں کے جُڑے ہوئے سروں کو دیکھ کر طنزیہ لہجے میں بولی ''اگر میرا عمران یہاں ہوتا تو ایک گھنٹے میں اپنی مصباح کو ڈھونڈ نکالتا خواہ اپنی جان گنوا بیٹھتا۔تم سوائے باتیں کرنے اور اندازے لگانے کے کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں ہو۔''

وجدان اور افتخار کا سر شرم سے جھک گیا۔ مظہر نے دھیمے لہجے میں کہا ''آنٹی! ہمیں عمران سمجھ کر دعا دیجئے، ہمیں بھی اپنی جان اتنی پیاری نہیں ہے جتنی آپ سمجھ رہی ہیں۔''

ماما نے ٹرے ٹیبل پر رکھی۔ وہیں قالین پر بیٹھ گئی، ٹیبل پر سر رکھ کر ہچکیاں لے لے کر رونے لگی ''ہائے میری مصباح! نہ جانے کن ظالموں نے اُسے مجھ سے دور کر رکھا ہے۔ سچے پروردگار! ماں کی خالی جھولی کی فریاد سُن لے اور اُن فرعونوں کو تباہ کر دے، برباد کر دے۔''

وجدان اُٹھ کر ماما کے پاس آیا۔ اُسے اُٹھا کر اندر کی طرف لے جاتے ہوئے بولا ''ماما! ہمارا حال آپ سے مختلف نہیں ہے، آپ رو کر دل کا غبار نکال لیتی ہیں اور ہم یہ بھی نہیں کر سکتے۔ بس اپنے آپ میں ہر وقت کڑھتے رہتے ہیں، خون جلاتے رہتے ہیں۔''

مظہر نے چائے کا کپ اُٹھایا، لبوں سے لگائے بغیر واپس رکھ دیا، بولا ''افتخار! ہمیں اُس جگہ پر پہنچنا چاہیے جہاں رضی الدین کی لاش کو پولیس نے اپنی تحویل میں لیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہیں سے مصباح کا سراغ ملے گا۔''

''مگر اُس جگہ کا پتہ کیسے چلے گا؟'' افتخار نے اپنی بڑھی ہوئی شیو پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بے بسی سے کہا۔

''تم نے مصباح کے اغوا کو اپنے اعصاب پر سوار کر لیا ہے تبھی تو تم لوگوں کو کوئی راستہ سجھائی نہیں دیتا۔ بھلے آدمی! اَبھی پولیس اسٹیشن چلتے ہیں، لاش اُٹھا کر لانے والوں میں سے کسی ایک کو علیحدگی میں لے جا کر پوچھتے ہیں، وہ بتا دے گا۔''

''اگر اُس نے نہ بتایا تو؟''

مظہر نے عجیب سی نگاہ اُس پر ڈالی، چائے کا گھونٹ حلق میں اُتارا اور انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے ایک مخصوص اشارہ کرتے ہوئے سمجھایا کہ پیسہ گونگے کو بھی زبان کھولنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

...❁...

پروفیسر وسیم کے سامنے گیس والے چولھے پر چائے کی کیتلی میں پانی کھول رہا تھا۔ کھولتے ہوئے

پانی میں کبھی اپنا عکس نظر نہیں آتا، دنیا کی بے ثباتی عیاں ہونے لگتی ہے۔ پانی میں بہہ کر آنے والی عورت پر توڑے جانے والے مظالم کو سوچ رہا تھا اور غم زدہ ہو رہا تھا۔ دُنیا ظالم ہے، وہ جانتا تھا مگر اُسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ اتنی ظالم بھی ہو سکتی ہے؟

افتخار بیگ نے بعد میں کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ اُس کی طرف دھیان گیا تو آپوں آپ ہی اُسے اَشو لال کا دعویٰ یاد آ گیا۔ اُس نے کہا تھا کہ مصباح کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آنے والا ہے یا پیش آ چکا ہے۔ اُس سے پہلے افتخار اُس کے پاس مصباح کے غیاب کی چوٹ پر ٹوٹا ہوُا دِل لئے آن پہنچا تھا۔ اُس کی آنکھوں کے گرد کی لکیروں میں اضافہ ہو گیا اور وہ سوچ میں پڑ گیا ''کیا اَشو لال کا مصباح سے رابطہ ہے؟ نہیں...... یہ ممکن نہیں ہے۔ تو کیا اُس کے مراقبوں نے عرفان کی چادر اوڑھ لی ہے؟ نہیں...... یقیناً نہیں...... یہ دُنیا کا سب سے بڑا فراڈ ہے مگر مجھے اِس فراڈ کی سمجھ کیوں نہیں آ رہی؟''

اُس نے اپنے طور پر اَشو لال کی بات مانتے ہوئے افتخار کو گھر بھیج دیا تھا اور گھما پھرا کر سمجھا بھی دیا تھا کہ مصباح کسی کے ساتھ گھر سے بھاگی نہیں، اغوا کی گئی ہے اور اُسے مدد کی ضرورت ہے مگر وہ خود اَشو لال کے دعوے سے اتفاق نہیں کر پایا تھا۔ میلوں دور دُنیا کے ہجوم میں پھنسا ہوُا شخص کیسے خبر رساں ذریعے کے بغیر کسی کے حالات سے آگاہ ہو سکتا ہے؟ اُس نے چینی اور پتی پانی میں ڈالتے ہوئے نفی میں سر ہلایا اور خود کلامی کرنے لگا ''اَشو لال! تو مجھے چکر دیتا ہے، چکروں میں ڈال کر جنت سے نکالنا چاہتا ہے تبھی تم نے سموں کو یہاں رکھنے کی سفارش کی تھی۔ اَب سمجھا، تمہیں یقین ہو گیا ہے کہ مجھ آدم کو کوئی حوا جنت سے نہیں نکال سکتی۔ تبھی روپ بدل کر وار کرنے لگے ہو۔ میرے سکون کو دیکھ کر جلنے لگے ہو مگر تمہیں ہر موڑ پر ناکامی ہو گی، ہر وار پر خفت ملے گی، دیکھ لینا۔ ہاں!''

بڑبڑانے کے دوران خود کار انداز میں اُس کے ہاتھ حرکت کرتے رہے۔ بریڈ کے کتلوں کو گرم کرنے کے بعد چھری کی مدد سے اُن پر مکھن کی تہہ جمائی اور چائے تھرماس میں انڈیل کر ٹرے میں رکھی۔ ٹرے اُٹھائے چھت پر آیا تو سانس کے رِدھم پر اوپر نیچے ہوتی چادر کو دیکھ کر اُس کا منہ بن گیا۔ وہ اتنی چمکدار دھوپ میں اَبھی تک سو رہی تھی۔ نہ جانے کیوں اُسے مریم یاد آ گئی۔ وہ ہر چھٹی کے دِن اِسی طرح دوپہر تک سوئی رہتی تھی اور پروفیسر کو ناشتہ تیار کر کے اُسے جگانا پڑتا۔

ٹرے چھت کے ایک گوشے میں فرش پر رکھ دی اور خود مچھر دانی کو سمیٹنے لگا۔ اُسے حیرانی ہوئی کہ اُس نے ٹیکے لگانے کے بعد اُسے جس طرح سلایا تھا، وہ اَبھی تک اُسی انداز میں پڑی ہوئی تھی۔ چادر کی ترتیب بھی بتائے دیتی تھی کہ اُس نے اَبھی تک کروٹ نہیں بدلی۔

رات میں بدصورت دکھائی دینے والی اپنی جون بدل چکی تھی۔ اُس کے چہرے پر جا بہ جا زلفیں چمٹی ہوئی تھیں اور چہرہ خاصی پیلاہٹ پکڑ چکا تھا۔ شاید رات کو بلبوں کی روشنی نے اُس کے چہرے کی اصل رنگت کو چھپالیا تھا۔ پروفیسر نے اُس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ چونک پڑا۔ وہ بخار میں پھنک رہی تھی۔ اتنی دھوپ میں اُسے اصولی طور پر پسینے میں شرابور ہوجانا چاہیے تھا مگر وہ بالکل خشک تھی۔ پروفیسر نے اُسے ہلایا جلایا، آوازیں دیں مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا ہوُا چھت سے نیچے اُترا اور فریج میں سے ٹھنڈا پانی اور رومال اُٹھالایا۔ رومال بھگو کر اُس کی پیشانی پر رکھا۔ وہ کسمسائی اور گردن ایک طرف ڈال کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ وہ رومال ٹھنڈے پانی میں بھگوتا رہا، پیشانی پر رکھتا رہا تاوقتیکہ اُس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ کئی منٹوں تک آنکھوں کو جھپکے بغیر اُسے دیکھتی رہی، پیشانی پر بار بار بھیگا رومال رکھنے والے ہاتھوں کی حرکات کو دیکھتی رہی پھر آنکھیں بند کرکے کراہنے لگی۔ پروفیسر نے کہا ''تم نے زندگی کی جنگ جیت لی ہے، اَب بیماری سے جیتنے کی کوشش کرو اور اُٹھ کر بیٹھ جاؤ۔''

وہ شاید سمجھی ہی نہیں تھی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے پھر اُسے دیکھنے لگی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اُس کا ذہن ہر احساس سے عاری ہوچکا ہو۔ یکبارگی سے اُس کی آنکھوں کے تاثرات بدلنے لگے۔ اُسے یاد آنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ دہشت سے تھرتھر کانپنے لگی۔ لکنت زدہ لہجے میں پوچھنے لگی ''میں کہاں ہوں؟''

''جہاں بھی ہو، خیریت سے ہو۔ چلو شاباش! اَب اٹھ کر بیٹھ جاؤ اور ناشتہ کرو۔ لگتا ہے تم کافی دیر سے بھوکی ہو۔'' پروفیسر نے پچکار کر کہا۔

وہ اردگرد دیکھنے لگی۔ جنت کی چھت پر لیٹ کر اطراف میں دیکھنے سے کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے انسان خلا میں چارپائی بچھائے لیٹا ہوُا ہے۔ وہ پریشانی سے بولی ''میں کہاں ہوں؟''

''تم محفوظ جگہ پر ہو۔''

''تم کون ہو؟'' اُس کی آنکھوں میں تشویش اور دہشت بھری ہوئی تھی۔

''تمہیں سب کچھ پتہ چل جائے گا۔ چلو اُٹھو!'' پروفیسر نے کہا اور چھت کے اُس گوشے کی طرف چل دیا جہاں اُس نے ناشتے کی ٹرے رکھ چھوڑی تھی۔ ٹرے اُٹھائی اور چار پائی کے قریب آ گیا۔ وہ وفورِ خوف سے اَبھی تک لرز رہی تھی اور چادر اُس کی کپکپاہٹ کو چھپانے میں ناکام ہو رہی تھی۔ پروفیسر نے ڈپٹ کر کہا ''اُٹھو اور ناشتہ کرو۔ میں تمہارے باپ کا نوکر نہیں ہوں کہ ٹرے اُٹھائے کھڑا رہوں۔''

اُس نے اُٹھنا چاہا مگر اُٹھ نہ پائی اور بے بسی اور خوف کے ملے جلے تاثرات لئے اُسے دیکھنے لگی۔ اُس نے ٹرے ایک ہاتھ میں پکڑی اور دوسرے ہاتھ کو گردن تلے رَکھ کر سہارا دیا۔ وہ بدقّت تمام اُٹھی۔ کراہتے ہوئے چار پائی کی بانہوں کو مضبوطی سے تھام کر بیٹھ گئی اور اُس سے نظریں چُرانے لگی۔ ایسے میں اچانک اُسے اپنی برہنگی کا احساس ہوگیا۔ اُس کے بدن نے ایک واضح جھٹکا لیا اور وہ سمٹ کر اپنی ننگی کمر کو چھپانے کی کوشش کرنے لگی۔ پروفیسر نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا ''تم فضول کوشش کر رہی ہو، میں نے تمہارے پورے بدن پر سکاٹرن پاؤڈر اور بام لگائی ہے۔ بینڈ یج کرنے کے بعد ہی یہ چادر اوڑھائی ہے۔ تمہارے پاس چھپانے کیلئے کچھ بھی نہیں ہے لڑکی! خاموشی سے ناشتہ کرو۔''

پروفیسر نے دانستہ اُس کی آنکھوں میں دیکھنے سے گریز کیا اور ٹرے اُس کے سامنے رکھ کر سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ رُک کر پلٹے بغیر بولا ''ناشتہ کرنے کے بعد یہی چادر لپیٹ کر نیچے اُتر آنا۔''

وہ نیچے اُتر آیا اور ناشتہ کرنے میں مشغول ہوگیا۔ اچانک اُس کے لبوں پر زہر خند مسکراہٹ رقصاں ہوگئی۔ اُس نے فون پر ڈاکٹر اَشولال سے رابطہ کیا اور مزاج پُرسی کے بعد دریافت کیا ''مُرشد! نئے کاروبار کی حالتِ زار کیسی ہے؟''

ڈاکٹر چونکا ''کیسا کاروبار؟''

پروفیسر وسیم کے حلق سے قہقہہ اُبل پڑا۔ خود پر قابو پا کر بولا ''وہی، لوگوں کو مستقبل کے بارے

میں آ گاہ کرنے والا دھندہ!''

اَشولال نے بُرا منایا۔طویل توقف کے بعد بولا''تم غلط سمجھے ہو پروفیسر! میں نے تمہیں کہا بھی تھا کہ مجھے کچھ دکھایا جارہا ہے، میں دیکھنے کا مشتاق ہرگز نہیں ہوں۔''

''چلو یونہی سہی، کچھ نیا دکھائی دیا؟'' پروفیسر کے لہجے میں فاتحانہ تاثر خاصا مستحکم تھا۔

''سئیں! میرا خیال ہے کہ میں نے تمہیں شریکِ راز ٹھہرا کر غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔معافی چاہتا ہوں۔'' اَشولال نے مایوسی اور تاسف سے بھرپور لہجے میں کہا''میں نے سوچا تھا کہ عین ممکن ہے میرے بتلانے سے تم لوگوں کا کچھ فائدہ ہوجائے گا،مگر دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ میری اپنی شخصیت تمہاری نظروں میں بے وقعت ہورہی ہے۔''

پروفیسر نے پوچھا''کیا میں آزمانے کا حق نہیں رکھتا مُرشد؟''

''مجھے جی بھر کر آزماؤ مگر اُس چیز کو مت آزماؤ جس کے بارے میں میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔'' اَشولال نے کہا۔اُس کے لہجے سے برہمی عیاں تھی۔

''یہ تو بتلا سکتے ہو کہ دیکھی اور سنی ہوئی میں کیا فرق ہوتا ہے؟''

''یہ تو تم بھی جانتے ہو، پھر پوچھتے کیوں ہو؟''

''تم کہتے ہو کہ تمہیں دکھایا جاتا ہے، میں پوچھتا ہوں کہ کون کس طریقے سے تمہیں دکھاتا ہے؟'' پروفیسر کے لہجے میں ضد کا عنصر شامل تھا۔

''مجھے قسمت دکھاتی ہے۔''

''کیا قسمت کوئی وجود رکھتی ہے؟''

اَشولال کے لب سِل گئے۔ پروفیسر نے دوتین مرتبہ اپنا سوال دہرایا مگر کوئی جواب نہ پا کر بولا ''چلو یہ بتلادو کہ اَب قسمت نے تمہیں کیا دکھایا ہے؟''

''تم مانو گے نہیں۔''

''سچ اپنے آپ کو منوانے کی قدرت رکھتا ہے مُرشد!''

''تو پھر سنو۔ مجھے قسمت نے دکھایا ہے کہ فینی تمہاری جنت میں قدم رنجہ فرما چکی ہے۔جانتے ہو

فینی کون ہے؟''

پروفیسر چائے کا کپ منہ سے لگائے سُن رہ گیا۔ ہاتھ ٹھہر گیا۔ چائے اُس کے لبوں کے گوشوں سے نکل کر دونوں طرف سے گردن تک پہنچ گئی۔ بہ دقّت تمام بولا ''کون ہے؟''

''فینی مصباح کا نام ہے۔'' اَشولال کا لہجہ سرسرانے لگا۔

''مم......مگر......'' پروفیسر ہکلا گیا ''مگر مصباح کا یہاں کیا کام؟''

''یہ تو قسمت کو معلوم ہوگا۔ تم بتاؤ، کیا وہ تمہارے پاس پہنچ چکی ہے؟''

''نن......نہیں مُرشد!'' اُس نے کہا۔ ساتھ ہی گزشتہ رات پانی میں بہہ کر آنے والی زندہ لاش کا پیلا چہرہ اُس کی آنکھوں کے سامنے لہرا گیا۔ دل نے چیخ کر کہا ''وہی اَشولال کی فینی ہے، وہی افتخار کی مصباح ہے۔''

دماغ نے فوراً سہارا دیا ''نہیں۔ اَبھی یہ طے نہیں ہوا۔ اُس نے اپنا نام نہیں بتایا۔ افتخار کہتا ہے کہ اُس کی مصباح بہت خوبصورت ہے، جو دیکھتا ہے، بے اختیار ٹھہر جاتا ہے۔ چھت پر لیٹی ہوئی کو ایک مرتبہ دیکھ لینے کے بعد دوسری مرتبہ دیکھنے کی خواہش نہیں رہتی۔ وہ مصباح نہیں ہوسکتی۔''

''تم گھبرا کیوں گئے ہو پروفیسر؟'' اَشولال کے لہجے میں گہرا طنز تھا ''اگر وہ اَب تک نہیں پہنچی تو انتظار کرو، پہنچنے والی ہے۔ اور ہاں! تمہارا لہجہ تمہاری اندرونی خلفشار کا مظہر بنا ہوا ہے، مجھے رَد کرتے ہوئے اپنی آواز پر قابو پالیا کرو۔''

''میرا خیال ہے تم ناسٹل جیا (Nostalgia) کا شکار ہو گئے ہو مُرشد! تم بے جوڑ کڑیاں ملاتے ہوئے دوسروں کو احمق خیال کرنے لگے ہو اور اُس ٹرانس کا شکار ہو رہے ہو جو ماؤں دادیوں نے ڈراؤنی کہانیوں کے ذریعے تمہارے لاشعور میں قائم کر رکھی ہے۔ یہی کہا جاسکتا ہے کہ نارن، سکنڈے نیویا کی دیوی تمہارے پاس آتی ہے، لوحِ تقدیر پر لکھی ہوئی باتیں بتلاتی ہے اور چلی جاتی ہے۔ ہاہ! یہ تصور کتنا مضحکہ خیز ہے۔ اکیلے بیٹھ کر سوچو تو ہنس ہنس کر پاگل ہو جاؤ مُرشد! میں تمہارے لئے دُعا ہی کرسکتا ہوں۔'' پروفیسر نے کہا۔

''بالکل غلط۔ میرے بچپن میں، میرے وطن میں جا بہ جا پھیلی ہوئی غربت اور بے حساب محبت

دکھائی دیتی ہے، تو ہمات یا اندیشے کہیں نظر نہیں آتے۔'' اُشولال نے اپنا دفاع کیا۔

پروفیسر نے ''خدا حافظ'' کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔

اُس کا رواں رواں انگشت بدنداں تھا۔ نہ یقین کرنے والی بات اپنی صداقت اُس پر عیاں کر رہی تھی۔ دو مہیب سوال اُس کی نگاہوں کے سامنے مشتق ناگ کی طرح پھن پھیلائے کھڑے تھے۔ کیا دریدہ بدن زندگی زندگی کا راگ الاپتے ہوئے آنے والی حرماں نصیب مصباح ہے؟ کیا اُشولال پر عرفان کی بَرکھا برسنے لگی ہے؟......

وہ بے سبب کافی دیر تک کچن میں ہی مصروف رہا۔ اچانک ایک نامانوس سی آواز سُن کر چونک گیا۔ یوں لگا جیسے چھت پر کوئی بھاری بھرکم شئے گری ہو۔ وہ سرعت سے چھت پر چڑھا۔ توقع کے عین مطابق اُس کی بن بلائی مہمان چارپائی سے چند قدموں کے فاصلے پر اوندھے منہ پڑی کراہ رہی تھی۔ وہ چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ اُس نے سہارا دے کر اُٹھایا۔ وہ ہونٹ بھینچ کر ہولے سے بولی ''میں کھڑی نہیں ہو سکتی۔''

وہ اُسے قدم قدم چلاتا ہوا سیڑھیوں تک لایا۔ کمر میں بازو حمائل کر کے ایک ایک سیڑھی اُتارتا گیا۔ بیڈ روم میں لا کر لٹانے کے بعد اُس نے پردے برابر کئے۔ دروازہ بند کیا اور فریج بند کر کے ائر کنڈیشنر آن کر دیا۔ اُس کے حلق سے نکلنے والی کراہیں سننا پروفیسر کی سماعت پر گراں گزر رہا تھا۔ وہ چھت پر سے برتن اُٹھا لایا۔ اپنی ڈسپنسری سے اَدویات نکال کر اُن کا عمیق نظروں سے جائزہ لینے لگا۔ ساتھ ساتھ تعین کرتا گیا کہ اُسے کون سی دوائیں کھلانی ہیں۔

میڈیکل کٹ اُٹھائے بیڈ روم میں آیا۔ اُس کے چہرے کی طرف دیکھے بغیر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ جسم پر چپکے ہوئے سکاٹرن پاؤڈر نے اپنا رَنگ بدل لیا تھا۔ وہ پاؤڈر کے کھرنڈ اکھاڑ کر بام لگانے لگا۔ گزشتہ رات بام لگانے کے دوران اُس کے جسم نے مہین سی حرکت بھی نہیں کی تھی، اَب تکلیف محسوس کرتے ہوئے ہل جل رہی تھی۔ پروفیسر نے جہاں تک ممکن تھی، ڈسپنسنگ کی، چہرے کے زخموں کا احاطہ کیا پھر بولا ''کوشش کرو کہ بقیہ زخموں پر خود دوا لگا لو۔ میں باہر جا رہا ہوں۔''

اُس کی آنکھوں میں پہلی مرتبہ تشکر کا احساس اُبھرا تھا۔ پروفیسر باہر آ کر حسبِ عادت اپنی جنت

کا جائزہ لینے لگا۔

نصف گھنٹے کے بعد وہ پانی کی ٹھنڈی بوتل اُٹھائے بیڈ روم میں داخل ہوا۔ وہ آنکھوں پر بازو رکھے لیٹی ہوئی تھی۔ پروفیسر نے دیکھا کہ اُس کے میلے وجود کے لمس سے بیڈ کی چادر خاصی میلی ہوگئی تھی۔ جی ہی جی میں پچھتایا مگر جو ہونا تھا، ہو چکا تھا۔ کندھے اُچکا کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ اُسے متوجہ کرنے کیلئے کھنکارا، بولا ''تمہارا نام کیا ہے؟''

اُس کا بازو نہائت آہستگی کے ساتھ آنکھوں پر سے ڈھلک گیا۔ پھیلی پھیلی نظریں اُس پر گاڑتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش کرنے لگی مگر لب محض کپکپا کر رہ گئے۔ پروفیسر نے دلاسہ دیا ''ڈرو مت، تم بالکل محفوظ ہو۔ یہاں تمہارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔''

اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ سسکنے لگی۔ پروفیسر نے اُسے رونے کا موقع دیا۔ غبارِ دل نکل رہا تھا، بھلا تھا۔ کچھ توقف کے بعد اُس نے پانی پلایا۔ سہارا دے کر اُٹھایا اور بیڈ میں بیٹھا دیا۔ وہ ممنونیت سے بولی ''مم......میرا......سر بہت درد......''

پروفیسر نے شکر کیا کہ وہ بولنے کے قابل تو ہوگئی ہے۔ بولا ''دوا کھاؤ گی تو بالکل ٹھیک ہوجاؤ گی۔''

وہ ایک بار پھر خاموش ہوگئی اور گھٹنوں پر سر رکھ کر رونے لگی۔ پروفیسر نے اُس کی کمر سے چپکے ہوئے بال علیحدہ کرنا شروع کردیے۔ جو بال کسی زخم کے کھرنڈ میں پھنسے ہوتے، اُنہیں کھینچنے پر اُس کے منہ سے سسکی نکل آتی۔ چند ہی منٹوں میں وہ اپنے کام سے فارغ ہوگیا اور اُسے آرام کرنے کا حکم دے کر بیڈ روم سے نکل آیا۔ اَبھی اُسے اپنے معمول کے بہت سے کام کرنا تھے جنہیں وہ بے حد ضروری خیال کرتا تھا۔ اُس نے گہری نظروں سے اطراف کا جائزہ لیا۔

اُسے چند لمحے پہلے یہ شبہ ہؤا تھا کہ کہیں اَشولال کسی مُہانے کے ذریعے اُس کی نگرانی نہ کروا رہا ہو۔ اُسے علم تھا کہ سندھو سائیں کی آغوش میں رہنے والے کنگر اور مور مُہانے اَشولال کے پیر دھو کر پیتے ہیں اور اُس کا حکم بجالانے کیلئے اپنی تمام تر مصروفیات کو بالائے طاق رکھ سکتے ہیں۔ کوئی دکھائی نہ دیا، پتن خالی تھا اور دور دور تک کوئی کشتی بھی سطح آب پر موجود نہیں تھی۔ اُس کا اندیشہ دَم توڑ گیا۔

اُس کی نگاہ مغربی جانب بیلے کی طرف اُٹھی۔ کوئی کھڑا دکھائی دیا۔ فوراً سٹور کی طرف لپکا اور دور

بین اُٹھالایا۔ دیکھنے پر پتہ چلا کہ شیرا گرمانی ملنے کیلئے آیا تھا۔ اُس نے فوراً فون پر رابطہ کیا ''کیا بات ہے شیرے؟''

''بیمار ہوں، دِل بوجھل ہے، ملنے کیلئے آیا ہوں۔ مجھے اپنی جنت میں بلا لیجئے پروفیسر صاحب!'' اُس کے لہجے میں التجا تھا۔

پروفیسر نے فون بند کیا۔ اُلٹے پیروں پھر سٹور میں گیا اور ریموٹ کنٹرولر نکال لایا۔ لاک ہٹایا اور بوٹ کو شیرے کی جانب روانہ کر دیا۔ کچھ دیر کے بعد شیرا اُس کے سامنے کرسی میں براجمان تھا۔ اُس کا چہرہ بجھا بجھا سا تھا۔ پروفیسر کے دریافت کرنے پر بولا ''میرا بہت قریبی دوست مولا داد سانپ کے ڈسنے سے مر گیا۔ مجھے بخار نے آن دبوچا اور آپ جانتے ہی ہیں کہ یہاں دوا دارو کا کوئی بندوبست نہیں ہے۔ کاڑھا بنا کر پیا مگر کوئی آفاقہ نہیں ہوا۔ ڈسپرین اور پیراسیٹامول کی گولیاں بھی اتفاق سے ختم ہو چکی ہیں۔ آپ کے پاس ہیں تو دو چار عنائت کر دیجئے۔''

پروفیسر نے اُسے پیراسیٹامول کا پتہ اور پانی کا گلاس لا تھمایا۔ وہ دو گولیاں حلق میں اُتارتے ہوئے بولا ''سارا بدن ٹوٹ رہا ہے پروفیسر صاحب! میرے تمام ساتھیوں کی لگ بھگ یہی کیفیت ہے۔''

''کوئی بڑی واردات کی ہے تم لوگوں نے؟'' پروفیسر نے مسکرا کر پوچھا۔

اُس کا سر جھک گیا۔ چہرے پر ندامت کے آثار اُبھر آئے۔ پروفیسر کو اُس کا ردِعمل عجیب سا لگا۔ کریدنے پر اُس نے تأسف آمیز لہجے میں کہا ''ہم پارسا لوگ نہیں، اَن گنت قتل اور ڈکیتیاں ہمارے نامہ اعمال کو پُر کرتی ہیں مگر ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔ اِدھر بندے کا دَم باہر، اُدھر بات آئی گئی مگر ایک کام ایسا کر بیٹھا ہوں جو رات بھر جگائے رکھتا ہے۔ بے چین کئے رکھتا ہے۔''

''ایسا کیا کام کر بیٹھے ہو جس نے تمہارے سنگی دِل کو دہلا دیا ہے؟'' پروفیسر نے حیرانی سے پوچھا۔

''ہمارے بھاگ وَند نے ہمیں ایک لڑکی کو اغوا کرنے کا حکم دیا تھا۔ لڑکی کو اغوا کرنے کے دوران ایک بندہ مولا داد کے ہاتھوں پھڑک گیا۔ یہاں تک تو خیر رہی، لڑکی کو اُٹھا کر اپنے ڈیرے پر بہ عافیت پہنچنے کے بعد جو کچھ ہوا، اُسے نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میرے سمیت تمام بندے سالوں سے

پیاسے تھے، ہم نے جی بھر کر پیاس بجھائی مگر اِس دوران لڑکی کی حالت بہت خراب ہوگئی۔''

پروفیسر حیرت سے گنگ اُس کی شکل دیکھے جا رہا تھا۔ وہ سانس لے کر بولا'' پروفیسر صاحب! ہم نے اُسے کاڑھا وغیرہ پلایا، گولیاں بھی کھلائیں مگر وہ ناز و نعم کی پلی لڑکی ہر آنے والے پَل میں موت کی جانب بڑھتی جاتی تھی۔ مجھ سے اُس کی حالت دیکھی نہیں گئی تو میں نے اُسے دریا میں پھینکنے کا حکم دے دیا۔''

پروفیسر کے ہونٹ بھنچ گئے۔ آنکھوں میں خشونت عود کر آئی مگر شیرے گرمانی کا سر جھکا ہوُا تھا اور وہ پروفیسر کے دِل کی دُنیا اُتھل پتھل ہوتی دیکھ نہیں پایا۔ بولا'' اور مولا داد اُسے دریا میں پھینکنے کیلئے گیا۔ میں نے جا کر کچے پتن کو غور سے دیکھا۔ یوں لگتا ہے جیسے مولا داد نے اُسے دریا میں پھینکنے سے قبل پھر اپنا منہ کالا کیا تھا۔ وہیں اُسے جال کے درخت کے نیچے کسی بہت زہریلے سانپ نے ڈس لیا اور وہ ڈیرے پر پہنچنے سے قبل ہی اللہ کو پیارا ہوگیا۔ ہائے! مولا داد بڑا دلیر سنگی تھا، موت کے منہ میں یوں ہاتھ ڈال دیتا تھا جیسے بکرا گندم کی بوری میں منہ ڈالتا ہے۔''

اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پروفیسر نے تیکھے لہجے میں کہا'' تم مولا داد کی موت پر غم زدہ ہو یا اُس لڑکی پر توڑے جانے والے ظلم پر شرمسار ہو؟''

شیرے نے چونک کر پروفیسر کو دیکھا۔ لہجہ عجیب سا لگا۔ بولا'' موت ہمارے ساتھ ساتھ چلتی ہے پروفیسر صاحب! مولا داد کی لکھی ایسے ہی تھی، مَر گیا، غم نہیں۔ ہم سب نے ایک نہ ایک دِن مر جانا ہے مگر اُس لڑکی کی شکل میری نگاہوں میں ثبت ہے۔ سونے کیلئے لیٹتا ہوں تو کانوں میں اُس کی چیخیں گونجنے لگتی ہیں۔ بیٹھتا ہوں تو آنکھوں کے سامنے ہر جانب اُس کا چہرہ لہرانے لگتا ہے۔ مجھ سے بہت بڑا ظلم سرزد ہوگیا۔ لگتا ہے کہ خدا بھی مجھ سے ناراض ہوگیا ہے پروفیسر صاحب!''

پروفیسر کو اُس کا رویہ بڑا غیر حقیقی سا محسوس ہو رہا تھا۔ شیرا اُس قبیل سے تعلق رکھتا تھا جہاں یہ معمول کی بات تھی۔ پوچھا'' شیرے! کیا تم نے پہلی مرتبہ کسی لڑکی کو اغوا کیا ہے؟''

اُس نے نفی میں سر ہلایا'' نہیں بلکہ اَن گنت لڑکیوں کو اپنے بڑوں کے حکم پر برباد کر چکا ہوں۔''

'' پھر اِس لڑکی نے تمہارے ضمیر کو کیوں کر جگا دیا ہے؟''

''یہی بات تو میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ کاش! میں نے اُسے اُٹھانے کے بعد اتنی پستی میں نہ پھینک دیا ہوتا، اُسے قید رکھتا، اُسے مارتا پیٹتا، کچھ بھی کرتا مگر جو میرے ساتھیوں نے کیا، وہ اُس سلوک کے لائق نہیں تھی۔ اوہ ہاں پروفیسر صاحب! کیا آپ نے اُس لڑکی کی نعش کو دریا میں بہتے ہوئے دیکھا ہے؟''

پروفیسر کے بولنے سے پہلے خود ہی بول پڑا''مگر آپ کیسے دیکھ سکتے ہیں۔ اُسے اَدھ رات کو مولا داد پھینکنے کیلئے گیا تھا۔ اُس وقت آپ یقینا گہری نیند سو رہے ہوں۔''

پروفیسر نے اثبات میں سر ہلایا۔ پوچھا''اُسے تم نے کہاں سے، کب اور کیوں اُٹھایا تھا؟ مجھے تفصیل کے ساتھ بتلاؤ۔''

''یہ لمبی کہانی ہے، آپ نہیں سمجھیں گے، بہرحال بتائے دیتا ہوں۔'' شیرے کا لہجہ خاصا شکست خوردہ تھا''ہماری پشت پناہی بڑے لوگ کرتے ہیں۔ ہم اُن کے اَٹکے ہوئے کام نکالتے ہیں۔ یہ بھی ایک بڑے کا اَٹکا ہوا کام تھا۔ اُس کا بیٹا لڑکی کو جھانسہ دے کر اپنی حویلی میں لایا تھا اور اُس سے شادی کر کے اپنے باپ کا شملہ زمین بوس کرنا چاہتا تھا۔ باپ بیٹے کو کسی ہم پلہ خاندان میں بیاہنا چاہتا تھا۔ ایسے میں ایک ہی حل سامنے آیا کہ فساد کو جڑ سے ہی اکھاڑ پھینکا جائے اور یہ کام ہم نے کر دیا۔''

بات خاصی لمبی تھی۔ شیرا گرمانی نہ جانے کس کیفیت سے گزر رہا تھا کہ اُس نے من وعن تمام واقعہ تفصیل کے ساتھ پروفیسر کے گوش گزار دیا۔ کچھ بھی نہیں چھپایا۔ بات ختم کرتے ہوئے بولا''میں چلتا ہوں پروفیسر صاحب! دل کا غبار کچھ ہلکا ہو گیا ہے۔ دعا کیجئے گا۔''

''اگر مانو تو مشورہ دیتا ہوں کہ آئندہ ایسا کام نہ کرنا جو تمہاری مردانگی کو داغدار کر دے۔ چلو، تمہیں پتّن پر پہنچائے دیتا ہوں۔'' پروفیسر نے اُٹھتے ہوئے کہا اور ریموٹ کنٹرولر اُٹھا کر بوٹ کی طرف بڑھ گیا۔ شیرے گرمانی نے کانوں کی لوؤں کو ہاتھ لگایا، سست رَوی سے پروفیسر کی تقلید میں چلتا ہوا بوٹ تک آیا اور گیراج سے نکل کر بیلے والے پتّن کی طرف عازمِ سفر ہو گیا۔

باتوں میں غائت درجہ انہماک کے سبب دونوں کو احساس تک نہیں ہوا تھا کہ بیڈ روم کی کھڑکی کو تھوڑا سا کھول کر مصباح اُن کے مابین ہونے والی گفتگو کا ایک ایک لفظ سُن چکی تھی۔ شہاب کی طرف

سے پہلے دِل بدگمان تھا، اَب شدید نوعیت کی نفرت رَگ و پےَ میں اُتر کر سب کچھ جلائے جا رہی تھی۔
اُس نے سُنی ہوئی باتوں سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا تھا کہ پروفیسر وسیم کی اُسی جنت میں پہنچ چکی ہے جس کی نزدیک سے ایک جھلک دیکھنے کیلئے وجدان افتخار بیگ کی منت سماجت کرتا رہتا تھا۔ وجدان یاد آیا تو پھر اُس کی آنکھوں میں کئی چہرے جھلملانے لگے، آنسوؤں کی نمی میں دھندلانے لگے لیکن اُن کے نقوش صاف دکھائی دیتے رہے۔
کہنے والے نے سچ کہا ہے کہ خونی رشتے حادثات کی گہری دُھند میں بھی دھندلا یا نہیں کرتے۔

...۞...

''شناں!''
''جی!''
''میں ہنس کی طرف سے بہت پریشان ہوں۔'' ڈاکٹر اَشولال کی پیشانی پر فکر و تردد کی غماز لکیروں کا جال تنا ہوا تھا'' ڈاکٹر عثمان نے اپنا ٹرانسفر کروا لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنی فیملی کو لے کر چند دنوں میں ہی یہاں سے چلا جائے گا۔ قسمت اِس حد تک ہنس کی شخصیت میں اِنوالو ہوگئی ہے کہ اُس کے جانے پر ہنس خاصا اَپ سیٹ ہو جائے گا۔''
''یہ تو ہے۔ پھر؟'' شناں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
''پھر کیا کیا جائے، یہی تو سمجھ میں نہیں آ رہا۔'' اس نے بے بسی سے کہا۔
''یہ سب آپ کا کیا دھرا ہے۔ نہ آپ کشتی بنوا کر دیتے، نہ مالی کو پانی بہائے رکھنے کی تاکید کرتے اور نہ ہی دونوں زیادہ وقت اکٹھا گزار پاتے۔ قسمت کے جانے پر ہنس کا ردِعمل کیا ہوگا، یہ سوچتی ہوں تو دِل بیٹھنے لگتا ہے۔'' وہ تفکر آمیز لہجے میں بولی'' میں نے سوچا ہے کہ ہمیں دس پندرہ دِن کیلئے شمالی علاقہ جات میں چلے جانا چاہیے۔ جب واپس آئیں گے تب تک ہنس اِس قابل ہو چکا ہوگا کہ قسمت کی جدائی کو فیس کر لے گا۔''
اَشولال نے مایوسی سے سر ہلایا'' مجھے اتنی لمبی چھٹی نہیں مل سکتی۔''
''کیوں؟'' شناں کو اچنبھا ہوا۔

''پولیو کی مہم سر پر ہے۔تم جانتی ہو کہ اِس مہم کے تین دِن کتنے اہم ہوتے ہیں۔''

''میں اور ہنس چلے جاتے ہیں۔''

ایسے میں ہنس نے آنکھ کھول کر دونوں کو باری باری دیکھا۔آنکھیں ملتے ہوئے بولا''میں کہیں نہیں جاؤں گا۔یہیں رہوں گا۔''

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ بیٹا چالاک نکلا تھا،سونے کی اداکاری کرتے ہوئے اُن کی باتیں سنتا رہا تھا۔اَشولال نے اُس کے رخسار پر ہلکی سی چپت لگائی اور گھسیٹ کر چھاتی سے لگالیا۔وہ خمار آلود لہجے میں بولا''بابا!قسمت کے پاپا سے کہیں کہ وہ یہاں سے نہ جائیں۔''

اُس کے پاس ہنس کو دینے کیلئے کوئی دلاسہ نہیں تھا۔ پہلے سوچا کرتا تھا کہ اچھا ہے،بچپن میں ہی جدائی کے دُکھ سے آشنا ہوجائے گا تو بڑا ہو کر اِس کرب کو زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیا کرے گا۔اَب سوچ رہا تھا''میں آج تک اِس کرب سے مفاہمت نہیں کرسکا،منافقت کا بوجھ ہمیشہ دل پر محسوس کرتا ہوں اور بے چین رہتا ہوں۔ یہ تو اَبھی معصوم اور کمسن ہے،کیسے اِس دُکھ کا سامنا کرے گا؟''

چھاتی سے لگا ہنس ہولے ہولے کہہ رہا تھا''بابا!قسمت مجھ سے بہت سی باتیں کرتی ہے،کھیلتی ہے اور میرے ساتھ کھانا کھاتی ہے۔وہ چلی گئی تو میرے ساتھ کون باتیں کرے گا؟''

ماما نے کمر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا''میرا پیارا بیٹا کسی اور کو اپنا دوست بنالے گا۔''

''ماما!اور کون؟''

''تمہاری کلاس میں بہت سی لڑکیاں پڑھتی ہیں بیٹا!تم کسی کو بھی اپنا دوست بنا سکتے ہو۔'' شناں نے پیار سے سمجھایا۔

''مگر اُن میں کوئی بھی اُس جیسی نہیں ہے۔''ہنس نے مایوسی سے کہا۔

ماما نے چِڑ کر کہا''کیا وہ اوپر سے اُتری ہے؟''

''ہاں ماما! اُس کی ماما کہتی ہے کہ میں اور قسمت دونوں ہی اوپر سے اُترے ہیں۔'' ہنس نے معصومیت سے جواب دیا اور اَشولال کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ رینگ گئی۔

...●...

تیز آندھی میں افتخار اور وجدان مظہر عباس کی گاڑی میں شہاب خان کے دوست کی حویلی میں پہنچے ۔ گاڑی سے اُترے تو مٹی آلود ہوا کے تھپیڑوں نے استقبال کیا اور آنکھیں مٹی سے بھر دیں۔ پھڑ پھڑاتے کپڑوں کے جلو میں حویلی میں داخل ہوئے۔ مزارعین نے اِستقبال کیا۔ مظہر نے اپنا تعارف کراتے ہوئے خود کو شہاب کا دوست ظاہر کیا۔ لسی کا ایک ایک گلاس پینے کے بعد اُنہوں نے اپنے کام کا آغاز کیا۔

اُنہیں وہ جگہ دکھائی گئی جہاں پر رضی الدین کی نعش پڑی ملی تھی۔ وہاں اَب کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک بوڑھے مزارع نے بتایا کہ اُس نے کسی کی مدد سے خون اُٹھا لیا تھا اور اُس جگہ پر نئی مٹی ڈال دی تھی۔ قسمت اُن کا ساتھ دے رہی تھی۔ جونہی کمروں کو بہ نظر غائر دیکھتے ہوئے وہ اُس کمرے میں پہنچے جہاں شہاب اور مصباح کو قید کیا گیا تھا، تو اُن کی نگاہ دیوار کے ساتھ پڑی چند ٹوٹی چوڑیوں پر پڑی۔ وجدان نے چونک کر چند ٹکڑے اُٹھا لئے اور افتخار سے مخاطب ہو کر کہا ''بھائی! یہ چوڑیاں یقینا مصباح کی ہیں۔ وہ اِس رنگ کی چوڑیاں بڑے شوق سے پہنتی تھی۔''

افتخار نے چوڑیوں کے چند ٹکڑے اُٹھا لئے۔ عجیب سی کیفیت ہونے لگی۔ پوری قوت سے مٹھی بھینچی تو کانچ کے ٹکڑے ہتھیلی میں چبھ گئے۔ وہ ہونٹ بھینچ کر بولا ''یہ کسی اور کی بھی ہو سکتی ہیں۔''

مظہر نے مزارع کو ہاتھ کے اشارے سے بلایا، پوچھا ''یہاں خواتین بھی رہتی ہیں؟''

اُس نے نفی میں سر ہلایا اور مقامی زبان میں بتلایا ''نہیں پتر! یہاں سب چھڑے چھانٹ رہتے ہیں۔''

وجدان نے چوڑیوں کے ٹکڑے اُس کو دکھائے ''یہ کس کی چوڑیاں ہیں؟''

اُس نے کندھے اُچکائے اور کہا ''مجھے علم نہیں۔''

مظہر نے بوڑھے کو کریدا۔ نصف گھنٹے کی محنت کا ثمر یہی رہا کہ اُسے اور اُس کے ساتھیوں کو کسی بات کی خبر نہیں تھی۔ جب رضی الدین کے قتل کا خونی واقعہ پیش آیا، وہ چند میل دور زمین پر کام کر رہے تھے۔

وہ حویلی سے نکل کر اطراف کے ڈیروں پر گئے۔ کوئی سراغ ہاتھ نہیں لگا۔ ایک آدمی نے اُنہیں بتایا کہ اِس علاقے میں شیرے گرمانی کی بدمعاشی چلتی ہے۔ وہ مویشی اُٹھانے سے لے کر قتل تک، ہر واردات کر سکتا ہے۔ مظہر کے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ شیرا اپنے گروہ کے ساتھ دریا کے پار بیلے میں سے نکلتا ہے اور تہس نہس کر کے پھر وہیں چھپ جاتا ہے۔ ایک اور آدمی نے اپنی ہواڑ نکالی ''او بھائی جی! کیا پوچھتے ہو؟ یہاں اندھیر نگری ہے اور سردار صاحب کا راج ہے جو صرف چوپٹ کرتا ہے۔''

افتخار نے چونک کر پوچھا ''کون سردار صاحب؟''

اُس نے سردار اَرباب خان کا نام لیا۔ تینوں نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور واپسی کا قصد کیا۔ کافی دیر تک تینوں نے درپیش صورتِ حال پر بحث کی اور اِس نکتے پر اتفاق کیا کہ رضی الدین کے قتل اور مصباح کے اغواء میں سردار اَرباب خان اور اُس کے رکھیل بدمعاشوں کا ہی ہاتھ ہے۔ اُنہوں نے شدّت سے محسوس کیا تھا کہ حویلی میں موجود تمام مزارعین بہت سی باتیں چھپا گئے تھے اور اُنہوں نے شہاب خان اور مصباح کی حویلی میں آمد کے موضوع پر یکسر لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ مظہر نے بالخصوص کسی کو مخاطب کئے بغیر کہا ''بڑی عجیب بات ہے۔ شہاب کے بغیر اُس کے تینوں دوستوں کا اِس حویلی میں آنا بے محل نظر آتا ہے۔ فرخ اور بابر دونوں تعلیم یافتہ ہیں۔ رضی کو کسی وجہ سے مارنا ہی اگر چاہتے تھے تو اِس بھونڈے انداز میں قتل نہ کرتے۔ اپنے نقش پا چھوڑتے ہوئے گولی ہی مارنی تھی تو اُسے شہر سے اتنی دور لانے کی کیا ضرورت تھی۔ شہاب نے تم دونوں کو بے وقوف بنایا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ مصباح کہاں ہے۔''

تینوں تھانے پہنچے۔ اپنے کیس کی پیش رفت نہ دیکھ کر برہم ہو گئے۔ تھانے کا انچارج کہیں گیا ہوا تھا، ایک سب انسپکٹر اُس کی نشست پر براجمان تھا۔ سمجھانے کے سے انداز میں بولا ''تم لوگ سمجھتے ہو کہ ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ پوری کوشش کے باوجود لڑکی کا کوئی سراغ نہیں مل رہا۔ ہمارے پاس اللہ دین کا چراغ نہیں کہ اُسے رگڑ کر پوچھ لیں کہ وہ کہاں ہے۔ جونہی کوئی پتہ خبر ملے گی، ہم کوئی وقت ضائع کئے بغیر ریڈ کر دیں گے۔''

مظہر نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں ''انور صاحب! کیا آپ کو یقین ہے کہ شہاب اور اُس کے دونوں گرفتار ساتھیوں کو مصباح کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں؟''

اُس نے پورے وثوق سے کہا ''اُن کا اِس اغوا سے کوئی تعلق نہیں۔''

''یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟''

''میں نے اِن دونوں کو بتلایا تھا، پھر بتائے دیتا ہوں کہ جس دِن آپ کی بچی گھر سے غائب ہوئی اُس سے دو دِن پہلے شہاب صاحب حادثے کا شکار ہو کر ہوسپٹلائز ہو چکے تھے۔ میں نے آپ کے دونوں ساتھیوں کو ہسپتال کی رپورٹیں بھی دکھائی تھیں۔ اگلے دِن رضی الدین کو فرخ اور بابر نے قتل کر دیا۔ وہ تب سے حوالات میں پڑے ہیں۔ اَب آپ ہی بتائیں کہ اُن تینوں کا اِس واقعے سے کوئی تعلق بنتا ہے؟'' سب انسپکٹر نے مظہر کو مخاطب کر کے تفصیل سے بتلایا۔

مظہر نے فائل میں رکھے مختلف کاغذات دیکھے۔ ہسپتال کی جملہ رپورٹس اور قتل کی ایف آئی آر سب انسپکٹر کے بیان کی تصدیق کر رہی تھیں۔ اُسے دِل ہی دِل میں تسلیم کرنا پڑا کہ سردار اَرباب خان نے اپنے بیٹے کو صاف بچانے کیلئے کاغذات کی لاٹھی سے عدالتی جنگ، چھڑنے سے قبل ہی، جیت لی تھی۔ اُس نے کہا ''آپ بطورِ احتیاط تینوں کو زیرِ تفتیش رکھ لیں تو ممکن ہے......''

سب انسپکٹر نے نیم درشتی سے مظہر کی بات کاٹ دی ''قانون ثبوت دیکھتا ہے۔ ثبوت دکھاتے ہیں کہ تینوں کا لڑکی کے اغوا میں کوئی کردار نہیں ہے۔ پھر وہ کوئی معمولی ہستی والے لوگ نہیں ہیں، اُن پر کچا ہاتھ ڈالیں گے تو ہاتھ سلامت نہیں رہے گا۔ آپ اُسے تلاش کرنے کی کوشش کریں، ہم بھی کر رہے ہیں۔ اللہ چنگی کرے گا۔''

مظہر علی نے چوڑیوں کی طرف اُس کی توجہ مبذول کرائی تو اُس نے ذرہ بھر بھی اہمیت نہیں دی بلکہ صاف جھٹلا دیا کہ چوڑیاں کسی کی بھی ہو سکتی ہیں، اِن پر مصباح کا نام لکھا ہوا نہیں ہے۔

تینوں گھر پہنچے تو اُن کے چہروں سے ہی مایوسی جھلک رہی تھی۔ سلطان علی اور اُس کی بیوی نے اُنہیں دیکھا اور کچھ پوچھے بغیر منہ پھیر لیا۔ وجدان نے صوفے میں گرتے ہوئے کہا ''ماما! نہ جانے اُسے زمین نگل گئی یا آسمان......''

ماما نے ہاتھ اُٹھا کر روک دیا، بولی ''چپ رہو وجدان! میرا دِل اَبھی تک دھڑک رہا ہے تو اِس کا مطلب ہے کہ میری بیٹی زندہ ہے۔ تم اپنے بھائی کو فون کرو اور اُسے فوری طور پر یہاں پہنچنے کی تاکید کرو۔ مجھے یقین ہے کہ اُس کے آنے پر میری مصباح مجھے مل جائے گی۔ اُٹھو شاباش!''

سلطان علی نے خالی خالی نگاہوں سے اپنی بیوی اور جوان بیٹے کو دیکھا اور اُٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

''ماما! بھائی کا مستقبل تباہ ہو جائے گا۔''

''کیا اُس کا مستقبل میری بیٹی کی عزت اور جان سے زیادہ قیمتی ہے؟'' ماما نے چیخ کر کہا اور پھر اُس کے منہ میں جو آیا، مظہر کی موجودگی کا خیال کئے بغیر تند آواز میں کہتی چلی گئی۔

...⁂...

شام تک مصباح کی حالت خاصی بہتر ہو چکی تھی۔ بخار کی شدّت میں بھی کمی واقع ہو گئی تھی۔ وہ پروفیسر کے سہارے کے بغیر آہستہ آہستہ چلنے کے قابل ہو گئی تو پروفیسر نے اُسے وارڈروب سے اپنا ایک لباس نکال کر دیا اور باتھ روم کا راستہ دکھاتے ہوئے کہا ''خیال کرنا، پانی بہت ٹھنڈا ہے۔ پہلے بازوؤں اور ٹانگوں پر پانی ڈالنا پھر سر پر ڈالنا ورنہ بخار دماغ اور حرام مغز کو متاثر کرے گا۔''

وہ اُسے تشکر بھری نگاہوں سے دیکھتی ہوئی باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔ پروفیسر اُسے قدم قدم چلتے ہوئے دیکھتا رہا اور جب باتھ روم کا دروازہ بند ہو گیا تو پلٹ کر کچن میں آ گیا۔ اُس نے دوپہر میں کانٹے کی مدد سے ڈیڑھ دو کلو وزنی ڈنبھرا پکڑی تھی جو اُس کی اشتہا کو تسلسل کے ساتھ مہمیز کر رہی تھی۔

مصباح، باتھ روم سے نکل کر، کچن کی المونیم کی چوڑی پٹی والی دہلیز کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر کھڑی ہوئی تو پروفیسر کو اُس کی موجودگی کا احساس ہوا۔ پلٹ کر دیکھا، دیکھتا ہی رہ گیا۔ دُنیا کو بدلتے دیکھا تھا مگر کسی دُنیا والے کو یوں چند منٹوں میں اُس نے بدلتے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ وہ نقاہت کے مارے دروازے میں چپکی کھڑی تھی۔ وہ فرطِ استعجاب سے اُسے مردانہ سوٹ میں ملبوس ایک ٹک دیکھے جا رہا تھا۔ وہ خفت زدہ ہو کر کچن کے دروازے سے ہٹ گئی۔ قدموں کی چاپ سے پروفیسر نے

اندازہ لگایا کہ وہ بیڈ روم میں گھس گئی تھی۔ اُسے اپنی نگاہ کی بے حجابی اور دیدہ دلیری پر ندامت سی ہونے لگی۔ اپنا ندیدہ پن اُسے بُری طرح کھلنے لگا۔ خود کو کھانا تیار کرنے میں مشغول کرتے ہوئے کچن کے دروازے میں ٹھہرے ہوئے عکس کو محو کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ ناکام ہوُا تو سر جھٹکتے ہوئے سوچنے لگا ''سموں کے آتش فشاں وجود کو دیکھ کر میں اپنی نظر پر اختیار رکھتا تھا، اَب اتنا بے اختیار کیوں ہو رہا ہوں؟''

فرائنگ پین میں چمچ ہلاتے ہوئے بڑبڑانے لگا ''مصباح کے برہنہ وجود کی ایک ایک جولانی کو دیکھتے وقت احساسات میرے قابو میں تھے پھر یہ کیا ہوُا کہ اُس کے چھپنے پر دل کی دنیا زیروزبر ہونے لگی ہے۔ سموں میرے جذبات میں یہ ہلچل نہیں مچا سکی تھی حالانکہ اُس سے ایک کٹے ہوئے ربط کا ناتا قائم تھا۔ یہ اجنبی ہے۔ اپنا آپ گنوا کر آئی ہے۔''

اچانک جیسے ہوا کے کسی سرپھرے جھونکے نے ذہن کی تختی صاف کردی ہو۔ وہ خود کو ملامت کرنے لگا۔ سمجھانے لگا کہ اُس کی نظر اُسے شکست دلانے کا اہتمام کر رہی ہے، اِسے انتشار سے بچانا ہوگا۔ سمجھ میں آنے لگا کہ کیسے عورت کا وجود دُنیا فتح کرنے کی ترغیب دیتا ہے؟

جب وہ بڑی سی ٹرے میں کھانے کے تمام تر لوازمات سجائے بیڈ روم میں داخل ہوُا تو اُسے صوفے پر براجمان پایا۔ بولا ''کیا تم خود کو بہتر محسوس کر رہی ہو؟''

اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ پروفیسر نے کہا ''اِدھر آ جاوٗ، کھانا کھاوٗ، جسم میں توانائی بھرے گی تو مزید بہتر محسوس کرنے لگوگی۔''

وہ اُٹھ کر بیڈ پر آ گئی۔ پروفیسر نے ریگزین کا دسترخوان بیڈ پر بچھایا اور کھانا چننے کے بعد خود سرہانے کی جانب آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ وہ سمٹ کر سامنے بیٹھ گئی۔ پروفیسر نے اُسے ناقدانہ نگاہوں سے دیکھا۔ چہرہ چھوٹے چھوٹے اَن گنت سیاہ کھرنڈوں سے بھرا ہوُا تھا۔ میل، خون اور پاوٗڈر اُتر چکا تھا اور نیچے سے ملیح جلد نکل آئی تھی۔ ڈھیلی ڈھالی شلوار قمیص بھی اُس کے تن پر سج رہی تھی۔ مصباح نے اُس کے انہماک کو تاڑ لیا اور جھینپ گئی۔ سر جھکا کر نوالہ توڑنے لگی۔ مچھلی دیکھ کر ڈر گئی۔ بولی ''اِس میں کانٹے ہوں گے۔''

پروفیسر نے کندھے اُچکا کر کہا ''وہ تو ہوں گے ہی!''

وہ بڑی آہستگی سے ایک ٹکڑا اُٹھا کر کانٹے چننے لگی۔ پروفیسر نے پوچھا ''تمہارا نام کیا ہے؟''

اُس نے چونک کر سر اوپر اُٹھایا پھر جھک گئی۔ بولی ''آپ جانتے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' پروفیسر بھونچکا رہ گیا۔

لہجہ مزید دھیما ہو گیا ''آپ ڈاکو کے منہ سے پوری تفصیل سن چکے ہیں۔ میں مصباح ہی ہوں۔ افتخار بیگ کی کزن، وجدان کی بہن۔''

پروفیسر کے منہ سے ''اوہ'' کی لمبی سی آواز نکلی، بولا ''تو تم نے ساری باتیں سن لی تھیں؟''

''جی ......'' مصباح نے کہا اور کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا ''اُس نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ میرے ساتھ بہت بُرا ہوا ہے اور شاید میں ہی قصوروار ٹھہرتی ہوں۔ اِس سے کہیں بہتر تھا کہ مجھے موت آ جاتی مگر میں اتنی خوش بخت واقع نہیں ہوئی۔''

''کھانے سے ہاتھ مت روکو، ہم یہ باتیں کسی اور وقت پر ٹال دیتے ہیں۔'' پروفیسر نے جلدی سے کہا اور اپنی پسندیدہ مچھلی کا ایک تلا ہوا پارچہ چبانے لگا۔

مصباح نے کھانا کم کھایا۔ وہ کم کھانے کی عادی تھی۔ نیپکن سے ہاتھ پونچھتے ہوئے بولی ''کیا یہاں ٹیلی فون موجود ہے؟''

پروفیسر نے استفہامیہ نگاہوں سے دیکھا۔ پوچھا ''کہاں فون کرنا چاہتی ہو؟''

''اپنے گھر والوں کو یہاں کا پتہ دینا چاہتی ہوں تاکہ وہ آ کر مجھے لے جائیں۔'' مصباح نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''کیوں؟ کیا میں تجھے گھر پہنچانے کی طاقت نہیں رکھتا؟''

''نن......نہیں سر! ایسی بات نہیں ہے۔ آپ کو تکلیف ہو گی۔'' وہ سہم گئی۔

''کیا اَب تک تم مجھے راحت دیتی رہی ہو؟'' پروفیسر کے لہجے میں تلخی گھل گئی ''جب سے آئی ہو، تم نے مجھے ایک پَل کو چین نہیں لینے دیا۔ اَب اگر باتیں کرنے کے قابل ہو ہی گئی ہو تو جانے کی فکر میں ہلکان ہو رہی ہو۔ انسان کو اتنا بھی خودغرض نہیں ہونا چاہیے۔ اگر مر جاتیں تو کیا تمہارے گھر والے

تمہاری لاش اُٹھانے یہاں آتے؟''

وہ سہمی سہمی نگاہوں سے پروفیسر کو دیکھنے لگی۔ اُس کے پاس ضد کا اختیار نہیں تھا۔ سمجھ گئی کہ پروفیسر کو اُس کی بات بے محل اور ناگوار لگی ہے۔ بولی ''میں معافی چاہتی ہوں سر! دراصل...... وہ...... میرے لئے بہت پریشان ہوں گے۔ مجھے کافی دِن ہو گئے......''

''تم فکر نہ کرو۔ آرام سے رہو، جب مناسب سمجھوں گا، تمہیں گھر پہنچا دوں گا۔'' پروفیسر نے کھانا سمیٹتے ہوئے حتمی انداز میں کہا ''ویسے میرے پاس سیلولر فون موجود ہے، جب چاہو رابطہ کر کے اپنی خیریت کی خبر دے سکتی ہو۔ یہ مت بتلانا کہ تم پروفیسر وسیم کی جنت میں موجود ہو۔''

اُس کا ذہن پروفیسر کے اِس رویے کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ بڑے دِنوں کے بعد پیٹ بھر کر اچھا کھانا کھایا تھا۔ ہضم نہیں ہو پا رہا تھا۔ پروفیسر سے معدے اور سینے میں جلن کی شکایت کی تو اُس نے کہا ''بیڈ روم سے نکل کر عرشے پر گھومو پھرو، اپنے جسم کو حرکت دو، نظامِ ہضم درست ہو جائے گا۔ میرے ساتھ آؤ، تمہیں جڑی بوٹیوں کی بنی پھکی دیتا ہوں، گیس اور سینے کی جلن کو فوراً ٹھیک کر دیتی ہے۔''

وہ پروفیسر کے پیچھے چلتی ہوئی ڈسپنسری تک آئی۔ پروفیسر نے پھکی کی بھری ہوئی چمچ اُس کی کھلی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے پانی کے ساتھ نگل لینے کا مشورہ دیا۔ وہ پلٹ کر بیڈ روم میں آ گئی اور پانی کے بھرے جگ کی طرف بڑھ گئی۔ ایسے میں سوچ رہی تھی کہ وہ سونے سے پہلے وجدان کو فون کر کے اپنے محفوظ ہونے کی خبر سنا دے گی۔ ایسے میں اچانک دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ حلق میں اُترتا پانی تھم گیا۔ بڑبڑائی ''مگر میرے پاس تو کسی کا نمبر ہی موجود نہیں ہے، فون کس کو کروں گی؟''

اُسے سوائے اپنے نمبر کے کوئی نمبر یاد نہیں رہتا تھا، اِس لئے اُس نے تمام فون نمبر اپنے موبائل فون میں فیڈ کر رکھے تھے۔ فون گم ہونے کے ساتھ ساتھ سبھی رابطے گم ہو گئے۔ عرشے پر آئی، پروفیسر کے قریب ہو کر بولی ''سر! ایک پرابلم ہو گئی۔ میرے پاس کسی کا نمبر موجود نہیں ہے۔''

پروفیسر نے مسکراتی نظروں سے اُسے دیکھا، دل میں عافیت جاگ پڑی، بولا ''پھر کیا ہوا؟ تم بالکل تندرست ہو جاؤ، تمہیں گھر پہنچا دوں گا۔''

اُسے یقین نہیں آیا۔ تشکیک آنکھوں سے جھلکنے لگی۔ پروفیسر نے گھور کر دیکھا ''کیا تمہیں میری بات پر یقین نہیں آ رہا ہے؟''

وہ گومگو کی حالت میں تھم گئی۔ آنکھیں بولنے لگیں ''شہاب کے بعد مجھے کسی پر یقین نہیں رہا، وہ بُرا ہے، دُنیا اُس سے بھی زیادہ بُری ہے۔''

پروفیسر نے اُس کے گال پر چپت لگائی ''تمہارے ساتھ جو کچھ بھی ہوا، اُسے بھول جانے میں ہی عافیت ہے۔ کم آن! تمہیں جنت کی سیر کراؤں، عام حالات میں شاید تمہیں یہاں قدم رکھنے کی بھی اجازت نہ ملتی۔''

وہ پروفیسر کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ اُس سَمے کو جی ہی جی میں کوسنے لگی جب وہ شہاب کی گاڑی میں بیٹھ کر اُس کی ماں سے ملنے کیلئے چل پڑی تھی۔ کاش! گزرا ہوُا وقت لوٹ کر آتا ہو۔ سامنے کی تمام لائٹس پر پروانوں کی یلغار ہوگئی تھی۔ عقبی حصے کی روشنیاں گل تھیں۔ پروفیسر اُسی سمت کی سیڑھیوں پر پانی میں پیر ڈال کر بیٹھ گیا۔ وہ ریلنگ کو تھام کر کھڑی رہی۔ سوچنے لگی ''اتنے گہرے پانی میں گرنے کے بعد میں زندہ کیسے بچ گئی؟''

بے دھیانی میں پوچھ بیٹھی ''سر! پانی کتنا گہرا ہے؟''

''یہی کوئی دَس بارہ فٹ......کیا نہانے کا ارادہ ہے؟'' پروفیسر کے لہجہ غیر متوقع طور پر شگفتہ ہوگیا تھا۔

اُس نے خوف کے مارے جھرجھری لی۔ بولی ''ڈوب جاؤں گی۔''

''دو اڑھائی کلومیٹر دور سے بہتی آئی ہو، ڈوب مرنے سے بچ گئی ہو، اَب مرنے والی نہیں ہو۔'' پروفیسر نے کہا اور اپنی عادت کے مطابق دونوں ہاتھوں کی کھلی ہتھیلیاں زور سے پانی کی سطح پر ماریں۔ ''چھپاک'' کی زوردار آواز پیدا ہوئی۔ پھر یہ آواز مسلسل پیدا ہونے لگی۔

وہ شام کو چائے پینے کی عادی تھی۔ ماما بغیر تقاضے کے چائے کا کپ اُس کے کمرے میں پہنچا دیتی تھی۔ اَب دل چاہ رہا تھا مگر کہنے سے ہچکچا رہی تھی۔ ڈرتے ڈرتے بولی ''سر! کیا آپ کیلئے چائے بنا لاؤں؟''

پروفیسر نے چونک کر اُسے دیکھا اور کندھے اُچکا کر بولا ''اگر تم خود کو بالکل فٹ محسوس کرتی ہو تو کچن سنبھال سکتی ہو۔''

اُسے اجازت درکار تھی۔ فوراً کچن کی طرف بڑھ گئی۔ دس پندرہ منٹ کے بعد چائے کے دو کپ چھوٹی سی ٹرے میں رکھے عقبی سیڑھیوں پر آ گئی۔ پروفیسر کو چائے پیش کرنے کے بعد ریلنگ کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور چائے پینے لگی۔ پروفیسر کی آواز کانوں میں پڑی ''مصباح! تم اپنے دوست شہاب کے بارے میں کیا کہتی ہو؟''

اُس کے ہونٹ نفرت سے بھینچ گئے۔ بولی ''وہ بہت بُرا نکلا۔''

''اور اُس کا باپ؟''

''اُس سے بھی کہیں زیادہ بُرا۔''

''افتخار کو سوچتی ہو؟''

''نہیں۔ میں اُس کے قابل نہیں رہی۔'' مصباح کے لہجے میں یاس عود کر آئی۔

''کیا کھو گیا ہے تمہارا جو اِس انداز سے سوچنے لگی ہو؟''

''بچا ہی کیا ہے جس کے برتے پر افتخار کے سامنے جاؤں گی۔''

''کیا یہ حادثہ تمہاری مرضی سے پیش آیا ہے؟''

''نہیں تو......کون قیامت کو گلے لگاتا ہے۔'' وہ چائے کا کپ ٹرے میں رکھتے ہوئے مایوسی سے بولی۔

''روڈ ایکسیڈنٹ انسان کی مرضی کے بغیر ہوجاتا ہے، بالکل ایسے ہی تمہارے ساتھ بھی حادثہ پیش آ گیا۔ تم مجرم نہیں، بدقسمت ہو۔'' پروفیسر نے چائے کا کپ پانی میں دھونے کے بعد اُسے تھما دیا۔

''عورت کے پاس کچھ نہ ہونے کے باوجود بہت کچھ ہوتا ہے، وہ بھی نہ رہے تو اُس کی قیمت دو ٹکے بھی نہیں رہتی۔''

''کیا بکنے والی چیز اپنا مول آپ طے کرتی ہے؟''

''طے یقیناً نہیں کرتی مگر بتلاتی ضرور ہے۔'' مصباح نے دھیمے لہجے میں کہا ''میں بدنام ہوچکی

ہوں اور ہر کسی کو میرا روندا ہوا جسم دکھائی دینے لگے گا۔''

''میرا خیال ہے افتخار تمہیں اُسی محبت کے ساتھ قبول کرلے گا، جس محبت کی تم حقدار ہو۔'' پروفیسر نے پُریقین لہجے میں کہا۔

''یہ اُس کے ظرف پر منحصر ہوگا مگر میں شرم سے نظریں جھکا کر زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکوں گی۔ میں محبت کے تمام تر حقوق گنوا بیٹھی ہوں۔''

''یعنی تم اُس سے شادی نہیں کرو گی؟''

''یقیناً نہیں۔'' اُس کے لہجے میں قطعیت تھی۔

''اوکے!'' پروفیسر نے پانی کے ساتھ کھیلتے ہوئے کہا ''شیرے نے تمہیں اغوا کیا، مجھے تفصیل بتلا دی۔ اُس سے پہلے کیا ہوا تھا؟ صرف تم ہی جانتی ہو، اگر بتلا دو تو میری بے چینی دور ہو جائے گی۔''

دونوں اس انداز سے بیٹھے تھے کہ باتیں کرتے ہوئے آنکھیں چار نہیں کر سکتے تھے۔ اندھیرا ابھی طاری تھا۔ تبھی مصباح بہ آسانی بولے جا رہی تھی۔ اپنے پیروں کے ناخنوں سے کھیلتے ہوئے بتلانے لگی کہ کیسے وہ شہاب کی ماں سے ملنے کیلئے شہاب کے ساتھ شہر سے نکلی اور کیسے پولیس والوں نے اُنہیں گرفتار کر کے اُس حویلی میں پہنچایا جہاں سے شیرے گرمانی نے اُسے اُٹھا لیا۔ بتاتے بتاتے اُس کی اپنی سمجھ میں آنے لگا کہ پولیس والے جعلی تھے، ساری کارروائی شہاب کا ترتیب دیا ہوا منصوبہ تھا اور نکاح اِس تمام تر ڈرامے کا ڈراپ سین تھا۔

پروفیسر کو جمائیاں آنے لگیں۔ مسلسل بے آرامی کے باعث مضمحل دکھائی دے رہا تھا۔ سٹور سے فولڈنگ چارپائی اٹھا کر چھت پر آیا۔ مچھر دانی بڑے سائز کی تھی مگر دو چارپائیوں پر اِس صورت میں پوری ہو سکتی تھی کہ دونوں چارپائیوں کے مابین فاصلہ نہ رکھا جاتا۔ پروفیسر کے ذہن پر غنودگی سوار ہو ہی رہی تھی کہ موبائل فون پر پہلے افتخار بیگ کی کال آئی، پھر ڈاکٹر اَشولال کی۔ اُس نے یکے بعد دیگرے دونوں کینسل کر دیں اور پھر فون کو بند کر کے سرہانے کے نیچے کھسکا دیا۔

...❁...

سردار اَرباب خان کی کھوپڑی میں ابلیس کا ذہن پرورش پا چکا تھا۔ ایک کڑی کو دوسری کڑی سے اِس طرح سے ملاتا تھا کہ انسانی ہاتھوں سے کبھی نہ ٹوٹ پانے والی زنجیر بن جاتی تھی۔ اُس نے اپنی بڑی چالاکی سے نہ صرف مصباح سے جان چھڑا لی تھی بلکہ اپنا اور شہاب خان کا لباس بھی چھینٹوں سے بچا لیا تھا۔ ایسے میں بھول گیا کہ ہر زنجیر کا دوسرا سرا قسمت اپنی گرفت میں سنبھالے رکھتی ہے۔ ہاتھ کی خفیف سی حرکت قیامت بَرپا کر دیتی ہے۔

ہر صبح کا سورج ڈوبنے کیلئے اُبھرتا ہے۔ ڈوب کر پھر اُبھرتا ہے۔ ایسے ہی سیاست کا سورج کبھی ٹھہرا نہیں، جلتے پیروں چلتا رہتا ہے۔ سردار اَرباب خان فتوحات کے نشے میں سرپٹ دوڑتا ہوا ٹھٹک کر رُک گیا۔ وہ عوام کا منتخب نمائندہ ہوتا تو کوئی اُس کے پایہ اقتدار کو جھنجوڑنے کی جرأت نہ کرتا مگر وہ شارٹ کٹ اختیار کر کے نظامت کی مسند پر بیٹھا تھا۔ بیٹھانے والوں کو اُس کی کوئی اَدا ناگوار گزری تو اُس سے استعفیٰ طلب کر لیا گیا۔ مہلت بہت کم دی گئی تھی۔ اُس کا دَم رُکنے لگا۔ جانتا تھا کہ اُس نے ضلعی بساط پر اپنے مہروں کو اتنا پھیلا رکھا تھا کہ اُنہیں سمیٹتے سمیٹتے دو تین مہینوں کی مہلت درکار تھی۔ اپنے آقاؤں کے در پر سجدہ ریز ہوا مگر قبولیت کی گھڑی اُس کی جھولی میں نہ گری اور اقتدار کا ہُما اُس کے سر سے اُڑ کر مخالف سیاستدان کے سر پر جا بیٹھا۔ اپنی محل نما کوٹھی میں پہنچنے سے پہلے پورے ضلع کی عوام تک اُس کی بے دست و پائی کی خبر پہنچ گئی۔ مبارک باد دینے کیلئے اِس محل کے دروازے پر ہر کوئی آیا تھا، افسوس کرنے کیلئے وہی چند لوگ پہنچے تھے جو سیاست کے پَل پَل بدلتے موسموں سے بہ خوبی آگاہ تھے۔ جانتے تھے کہ آج دارالحکومت سے چہرے پر شکستگی کی تحریر سجا کر آنے والا کل ڈھول کی تاپ پر شہر میں داخل ہوگا۔

مخالف دھڑا شاید اِسی تاک میں بیٹھا تھا۔ کرسی نشین بدلنے کے ساتھ ہی گلی کوچوں میں اَن گنت کھمبیاں اُگ آئیں۔ ایسے میں نئے ناظم چوہدری امتیاز رفیق کی نظرِ التفاف مصباح کے غیاب پر جا ٹکی۔ سردار اَرباب خان کے حلق میں ہڈی پھنس گئی۔ سوچتا تھا کہ جونہی مصباح کا معاملہ سرد پڑا، کیس کی ریڑھ کو کمزور کروا کر بیٹے کے دوستوں کو باہر نکلوا لے گا مگر ایس ایچ او نے فوراً آنکھیں پھیرتے ہوئے کہا "سردار صاحب! چوہدری صاحب اِس کیس پر خصوصی توجہ دے رہے ہیں، میں

اُن کی مرضی کے بغیر کوئی قدم اُٹھاؤں گا تو میرا انجام بہت بُرا ہوگا۔''

''تم میرا کام کرو، میں تم پر کوئی آنچ نہیں آنے دوں گا۔'' سردار اَرباب خان نے کڑک دار لہجے میں کہا۔

ایس ایچ او نے ''میں کوشش کروں گا'' کہہ کر ٹال دیا۔ اُس نے یقیناً دل میں کہا ہوگا ''خود پر آنے والی آنچ کو ٹال نہیں پائے، میری کیا مدد کرو گے؟''

ایسی باتیں کہنے کیلئے نہیں ہوتی، خاموش رہ کر سمجھانے والی ہوتی ہیں۔ جو سمجھ جاتا ہے، وہ بچ جاتا ہے اور جو آنکھوں کے ساتھ ذہن کے دریچے بند کر لیتا ہے وہ تباہی سے دوچار ہو جاتا ہے۔ ارباب خان سمجھانے سے بھی سمجھ نہیں پایا تھا۔ دل کو گوناں گوں تسلی تھی کہ اُس نے مصباح کے کیس کو بے جان کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا۔ چوہدری امتیاز رفیق لاکھ کوشش کرے، کچھ بگاڑ نہیں سکتا تھا۔

اُس کے گلے میں اٹکنے کیلئے وین ژو سے ہڈی سر کے بل دوڑتی ہوئی آ چکی تھی۔ عمران نے آرام کئے بغیر مصباح کی تلاش شروع کر دی۔ چوہدری امتیاز رفیق کا بیٹا اعجاز رفیق اُس کا کلاس فیلو تھا۔ دونوں تیسری جماعت سے ایف ایس سی تک اکٹھے پڑھتے رہے تھے۔ اُن کی دوستی کو دیکھ کر سبھی رشک کرتے تھے۔ اعجاز اُسے لے کر اپنے باپ کے کمرے میں پہنچ گیا۔ چوہدری امتیاز نے بڑی توجہ سے اُسے سنا۔ سر ہلاتے ہوئے گہری سوچ میں پڑ گیا۔ خود کلامی کے سے انداز میں بولا ''سردار اَرباب کی کوئی کل سیدھی نہیں ہے۔ سدھانے کے چکر میں پڑنے والے کو سو سو بل پڑ جاتے ہیں۔ بہر حال! تم اعجاز کے دوست ہو، میرے بیٹے ہو، تمہاری مدد ضرور کروں گا۔''

اُس نے متعلقہ تھانے میں فون کیا۔ ایس ایچ او سے مصباح کے کیس کی تفصیل طلب کی۔ ایس ایچ او نے اُسے کافی دیر تک نہ جانے کیا کچھ کہا، سُن کر چوہدری امتیاز کے لبوں پر زہرخند مسکراہٹ تیرنے لگی۔ بولا ''جو کچھ کر چکے ہو، ٹھیک کر چکے ہو۔ اَب مزید ٹھیک کرنے کی تدبیر سوچو۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ مصباح کے ملنے پر تمہارا منہ موتیوں سے بھر دوں گا۔''

ٹیلی فونک گفتگو خاصی طویل رہی۔ رابطہ منقطع ہونے پر چوہدری امتیاز نے اپنی سفید داڑھی میں

خلال کرتے ہوئے کہا ''عمران پتر! کام اَوکھ میں پڑ گیا ہے۔تمہاری بہن سردار اَرباب کے پالتو کتوں کے نرغے میں قید ہے۔رَب جانے، زندہ ہے، مرگئی ہے......''

عمران کے بدن کو جھٹکا سا لگا۔فرطِ غیض سے منہ سِل گیا۔اعجاز نے کندھے پر ہاتھ مار کر دلاسہ دیا ''عمران! فکر نہ کرو۔پاپا نے کہا ہے کہ وہ تمہاری مدد کریں گے۔مجھے یقین ہے کہ پاپا مصباح کو ڈھونڈ نکالیں گے۔''

چوہدری امتیاز نے کن اکھیوں سے سینہ پھلا کر بڑ ہانکتے بیٹے کو دیکھا اور کہا ''اعجاز کو شاید اِس معاملے کی سنگینی کا احساس نہیں ہے۔دریائی بیلے کے خونی درندوں کے پنجوں سے اُسے نکال لانا آسان نہیں ہے مگر اِس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔''

چوہدری کو بات کرنے کے دوران میں کچھ یاد آ گیا۔فون اُٹھا کر کسی کا نمبر ملانے لگا۔رابطہ ہونے پر بولا ''چوہدری! شیرے گرمانی سے تم رابطے میں رہتے ہو، کیا اُس سے کچھ منوا سکتے ہو؟''

دوسری جانب کی بات سُن کر بولا ''ہاں یار! میں جانتا ہوں کہ اُس پر میرا عہدہ بالکل بے اثر ہے۔وہ جو بھی مانگے گا، اُسے مل جائے گا۔''

عمران ایک ٹک اُس کے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات کو دیکھ رہا تھا۔وہ فون میں کہہ رہا تھا ''لڑکی ہے۔نام مصباح ہے۔اُسے سردار اَرباب کے کہنے پر شیرے گرمانی نے کچے کی ایک حویلی سے اُٹھایا تھا۔تم اُس سے رابطہ کرواور لڑکی کی رہائی کے عوض جو بھی مانگے، مجھے آگاہ کرو۔''

فون بند ہو گیا۔لمبی آہ بھر کر چوہدری نے کہا ''دعا کرو کہ تمہاری بہن زندہ ہو۔'' اُس کا کہنے کا انداز یوں تھا جیسے کہہ رہا ہوں کہ ''سلامت تو خیر اُس نے کیا رہنا ہے، خدا کرے کہ زندہ ہو۔''

اعجاز نے پوچھا ''پاپا! آپ نے کس کو فون کیا ہے؟''

''تمہارے چچا، چوہدری عنائت اللہ کو۔شیرا گرمانی اُس کا پرانا یار ہے۔بہت مانتا ہے اُس کی۔'' چوہدری امتیاز رفیق نے کہا۔اعجاز نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔جانتا تھا کہ چوہدری عنائت اللہ رشتے میں اُس کے باپ کا دور پار کا کزن ہے۔سیاسی بساط پر چوہدری امتیاز رفیق کو فتح یاب کرنے میں کلیدی کردار ادا کرتا تھا۔

پون گھنٹے کے بعد فون کا بزر بجا۔ سکرین پر نمبر دیکھ کر چوہدری نے کہا ''لو! تمہارے چچا کا فون آ بھی گیا۔''

فون آن کیا، کان سے لگایا اور بولا ''ہاں بھئی چوہدری! کیا رہا؟''

دوسری طرف کی بات سننے کے بعد اُس کے چہرے پر اندھیرا چھا گیا۔ آنکھیں موند کر دُکھ زدہ لہجے میں بولا ''تمہیں یقین ہے کہ اُس نے جھوٹ نہیں بولا؟''

دوسری طرف کی بات سُن کر بولا ''کب اور کیوں؟''

چوہدری عنائت اللہ کی آواز بھنبھناہٹ بن کر فون کے سپیکر سے نکل کر اعجاز اور عمران کے کانوں تک پہنچ رہی تھی مگر بات کی سمجھ بالکل نہیں آ رہی تھی۔ دونوں اُمید بھری نگاہوں سے فون سننے میں منہمک چوہدری امتیاز رفیق کو دیکھتے رہے۔ رابطہ منقطع ہونے پر اُس نے دونوں کو باری باری دیکھا، سر جھکا لیا اور ڈوبے ڈوبے لہجے میں بولا ''آہ! تمہاری بہن اَب اِس دُنیا میں نہیں رہی۔ اُن کم بختوں نے اُسے دریائے سندھ میں پھینک دیا ہے۔ چوہدری عنائت اللہ نے کہا ہے کہ اگر وہ دریا میں نہ بھی پھینکتے تو بھی وہ مر چکی ہوتی۔''

عمران کا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ آنکھوں کی پتلیاں ٹھہر گئیں اور چند ہی لمحوں میں چہرہ لال بھبوکا ہو گیا۔ اعجاز فوری طور پر اُس کی بدلتی ہوئی کیفیت کو بھانپ گیا اور پانی کا گلاس اُس کے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے بولا ''صبر کرو میرے دوست! ہماری بہن دُنیا میں نہیں رہی، شاید ہم بھی دُنیا میں نہیں رہے......''

عمران نے پانی نہیں پیا۔ نچلے ہونٹ کو دانتوں میں اِس زور سے بھینچا کہ دانت ہونٹوں میں کھب گئے۔ اعجاز کا رَنگ اُڑ گیا، پھٹی پھٹی نگاہوں سے اُس کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ اُسے یوں لگا جیسے کمرے کی ہر چیز عمران کے لب و لہجے میں بول اُٹھی ہو ''ہائے میری مصباح! میری بہن! تمہیں اِس بے بسی کی موت سے دوچار کرنے والوں کو چُن چُن کر قتل کروں گا۔ اُن کے ناپاک لہو کو نالیوں میں بہاؤں گا، تم نہیں تو دُنیا میں کوئی نہیں...... میں کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا......''

دریا میں پھینکے جانے سے پہلے جو کچھ مصباح کے ساتھ ہوا تھا، اُس کے بھائی کو بتلانے کی چنداں

ضرورت نہیں تھی، وہ سمجھ گیا تھا۔

...(✿)...

ہنس بڑے انہماک سے قسمت کے ہاتھوں کی حرکات کو دیکھ رہا تھا۔کبھی کبھی آنکھیں گھما کر مستقل رفتار کے ساتھ بہتے ہوئے شفاف پانی کو دیکھ لیتا۔قسمت نے فینی کا میک اَپ کیا، نیا لباس پہنایا اور جھوٹا زیور پہنایا۔اُس کی چمکیلی کاکلوں کو سنوارتے ہوئے پچکارا پھر پوڈو کے ساتھ ٹکا کر بیٹھا دیا۔ پوڈو کی آرائش کو بھی ضروری خیال کیا۔جب اُسے کشتی میں رکھنے لگی تو بازو کا کف کشتی کی ایک باہر کو نکلی ہوئی نوک سے الجھ گیا۔کشتی ڈول گئی۔فینی پہلو کے بَل گری اور لڑھک کر پانی میں جا پڑی۔وہ چلا اُٹھی ''بدتمیز فینی! سارا میک اَپ خراب کر دیا تم نے!''

ہنس چیخا ''دیکھو! اِس کا لباس بھی بھیگ گیا ہے۔''

''مجھے مت دکھاؤ، اُسے باہر نکالو۔'' قسمت کا موڈ سخت خراب ہو گیا تھا۔ہنس نے جلدی سے پانی میں بہتی ہوئی فینی کو باہر نکال لیا۔قسمت کے کہنے پر دھوپ میں سوکھنے کیلئے رَکھ دیا۔دھوپ خاصی تیز تھی۔دس پندرہ منٹ میں ہی پوری طرح سوکھ گئی تو قسمت نے اُسے دوبارہ کشتی میں براجمان کر دیا۔ کافی دیر تک بیٹھی پوڈو اور فینی کو دیکھتی رہی۔خود کلامی کرتی رہی۔کبھی فینی بن کر بات کرتی، کبھی پوڈو بن کر جھگڑنے لگتی۔ہنس اپنی سوچوں میں گم تھا۔اُس کی لاتعلقی کو بھانپ کر قسمت نے پسلیوں میں کہنی چبھوئی ''اے! تم کیوں چپ بیٹھے ہو؟''

''تم کب یہاں سے جا رہی ہو؟'' ہنس نے دفعتاً کہا۔

قسمت نے انگوٹھا ہتھیلی سے چپکا کر انگلیاں کھول دکھائیں ''پورے چار دِن باقی ہیں۔''

''تمہارے جانے کے بعد میں کیا کروں گا؟'' بچپنے کی معصومیت میں دُکھ کی آمیزش ہو گئی۔

قسمت بولی ''تم پوڈو کے ساتھ کھیلا کرنا۔''

''اکیلے ہی؟''

''تو کیا ہوا؟ پوڈو بھی تو اکیلا ہو گا۔تم بھی اکیلے ہو گے۔دونوں ایک دوسرے سے باتیں کرنا۔''

قسمت نے آنکھیں نچائیں۔

وہ منہ بنا کر بولا ''مجھے پوڈوا چھا نہیں لگتا۔''

''تو روز یہاں کیا کرنے آتے ہو؟'' قسمت نے سوال کیا۔

''میں تو بس تمہاری وجہ سے آجاتا ہوں۔'' ہنس نے لاپرواہی سے کہا۔

''تو ٹھیک ہے، میں چلی گئی تو جو تمہارے جی میں آئے، کرنا۔ اَبھی اپنا موڈ ٹھیک کر کے دریا دریا کھیلو۔'' وہ منہ بنا کر بولی۔ پھر یک لخت لہجہ بدل کر بولی ''اے ہنس! تمہارے بابا دکھائی نہیں دیتے، کہاں گئے؟''

''بابا غازی گھاٹ گئے ہوئے ہیں، آج آجائیں گے۔''

''یہ غازی گھاٹ کیا ہے؟'' قسمت نے تعجب سے کہا۔

''پتہ نہیں!'' ہنس نے ڈفلی بجانے کے سے انداز میں کھلی ہتھیلی کو دائیں بائیں حرکت دی ''وہاں بہت سارے لوگ ہیں۔ بابا نے کہا تھا کہ مُہانوں کی ترقی کیلئے بہت بڑا سے می نار (سیمینار) منعقد ہو رہا ہے۔ قسمت! یہ سیمینار کیا ہوتا ہے؟ بابا اکثر سیمیناروں میں جاتے رہتے ہیں۔''

قسمت نے اُسی کے انداز میں ہتھیلی کو دائیں بائیں حرکت دی ''پتہ نہیں!''

ہنس کو غصہ آیا مگر خود پر قابو پا کر پوچھنے لگا ''قسمت! وہ تمہارا مدھو کہاں گیا؟''

''اُس کا نام نہ لو، وہ گندا بچہ ہے۔'' قسمت نے مصنوعی اُبکائی لی۔

ایسے ہی وقت میں ہنس کے ''ڈوگی'' نے کشتی کے قریب ہی پانی میں زور سے پنجہ مارا۔ کشتی زور سے لہرائی۔ فینی اور پوڈو عرشے پر گر گئے۔ پوڈو کے سینے پر عین دِل کے مقام پر فینی کا ہاتھ ٹک گیا۔ وہ آدھی پوڈو کے اوپر تھی، آدھی عرشے پر...... قسمت نے دیکھا تو بے ساختگی سے ہنسنے لگی۔ ہنستے ہوئے دوہری ہوگئی۔ آنکھوں میں نمی تیر گئی ''اے...... اے ہنس! دیکھو تو ذرا کتنی فری ہوئی جا رہی ہے پوڈو کے ساتھ۔ واہ فینی واہ! تم نے تو کمال کر دیا۔ دیکھو دیکھو ہنس! پوڈو کو دیکھو۔ نیچے پڑا ہنس رہا ہے۔ کمینہ کہیں کا......''

ہنس منہ میں ہوا بھرے بیٹھا تھا۔ پوڈوا اور فینی کو دیکھ کر ہنسی نہ روک سکا اور ''پھاہ'' کی آواز کے

ساتھ اُس کے منہ میں جمع شدہ ہوا خارج ہوگئی۔ قسمت ہونٹوں پر ہاتھ رکھے کھی کھی کر رہی تھی۔

...⁂...

دوپہر خاصی برہم تھی۔ وہ پروفیسر کا حکم مان کر سونے کیلئے لیٹی تو بہ صد کوشش نیند نہ آئی۔ بیڈ پر کروٹ بدلی۔ پروفیسر عین آنکھوں کے سامنے چوبی فرش پر بچھے نرم قالین پر تکیہ سر تلے دَبائے پہلو کے بَل لیٹا ہوُا تھا۔ اُس کے نتھنوں سے خراٹوں کی مدھم مدھم آوازیں خارج ہو رہی تھیں۔ وہ کافی دیر تک اُسے پلکیں جھپکائے بغیر دیکھتی رہی۔ اُس کے خال وخد کو اَزبر کرتی رہی۔ سوچتی رہی ''دُنیا کتنی مختلف ہے۔ ایک ہی وقت میں مَرد درندہ دکھائی دیتا ہے، مَرد ہی محافظ دکھائی دیتا ہے۔ مجھے چیر نے پھاڑنے والوں نے کتنا بڑا خطرہ مول لے کر مجھے اُٹھایا تھا۔ جس کے ہاتھ میں مفت کا مال بن کر لگی ہوں، وہ میری طرف آنکھیں بھر کر دیکھنے کا روادار بھی نہیں ہے۔ وائے حیرت! یہ کیا ماجرا ہے، وہ ہونٹ کیا تھے جن کی تشنگی سیراب ہونے کا نام ہی نہیں لیتی تھی، یہ ہونٹ کیا ہوئے جن پر تشنہ مسکراہٹ دیکھنے کو بھی ترس گئی ہوں؟''

بنیان اور ٹراؤزر سے جھانکتا ہوُا پروفیسر کا گٹھا ہوُا مضبوط وجود بڑا پُرکشش دکھائی دے رہا تھا۔ بالوں کی قدرتی چمک اور عین سر پر لگے ائر کنڈیشنر کی ہوا میں بالوں کی فطری لرزش اُسے بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ جب سے آئی تھی، یہ پہلا موقع تھا جب وہ اپنے اور اپنے خاندان کے بارے میں نہیں سوچ رہی تھی بلکہ سامنے لیٹے ہوئے اَدھیڑ عمر مَرد کی شخصیت میں اُلجھ رہی تھی۔ اچانک دماغ پلٹ گیا۔ آنکھوں میں لاج بھر گئی۔ جسے انہماک سے دیکھ رہی تھی، اُس نے اُس کے پورے بدن کی عمارت کو نہ صرف دیکھا تھا بلکہ اس کی مرمت بھی کی تھی۔ یوں لگا جیسے اَبھی بھی اُس کے ہاتھوں کی انگلیاں اُس کے جسم پر تھرک رہی ہوں۔ چہرہ گل نار ہوگیا اور آنکھوں پر بازو نے چھایا کر دی۔

وہ اُٹھ کر بیڈ میں بیٹھ گئی۔ پردہ سرکا کر عرشے پر دیکھا۔ چمکتی دھوپ میں کسی شئے پر بھی نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔ آہستہ سے بیڈ سے اُتری، دَبے پاؤں کمرے سے نکلی اور عرشے پر آ گئی۔ سائے سے نکل کر دھوپ میں آئی تو پیر جلنے لگے۔ فرش خاصا گرم تھا۔ وہ تیز قدموں سے چلتی ہوئی سیڑھیاں

اُتری اور بھاگتی ہوئی ستون پر چڑھ گئی۔ ستون کی ریلنگ کو تھام کر نیچے کی طرف دیکھا تو دِل دھک سے رہ گیا۔ ستون کے عین وسط میں بنے ہوئے بڑے سوراخ کو دیکھا تو اُس کی ضرورت کے بارے میں سوچنے لگی۔

جنت پر ہچکولے محسوس ہوتے تھے۔ ستون ساکت تھا۔ وہ کئی منٹوں تک وہیں کھڑی رہی پھر یکا یک اُس کے دل کی کیفیت میں عجیب سا تغیر پیدا ہو گیا۔ اُس نے دونوں بانہیں پوری وسعت میں کھول دیں۔ چہرہ سوئے فلک اُٹھا لیا۔ ٹھنڈی آبی ہوا بدن میں سکون بھرنے لگی، سر پر قہر برساتا سورج اپنی ہویت کا احساس دلانے لگا۔ کافی دیر گزر گئی۔ خالی الذہنی کی کیفیت میں اطراف میں کسی انسان کی موجودگی کو کھوجتی رہی۔ کوئی دکھائی نہیں دیا تو سوچ میں پڑ گئی ''یہ میں کس جگہ آ گئی ہوں جہاں پروفیسر کے علاوہ کوئی انسان دکھائی نہیں دیتا۔''

دِل نے کسمسا کر دَبے لفظوں میں سمجھایا ''اے پگلی! جنت میں کوئی کوئی ہوتا ہے، ہر کوئی نہیں ہوتا۔ پروفیسر جہاں موجود ہو، وہاں کسی اور کی ضرورت بھی نہیں رہتی۔''

وہ ستون سے اُتر کر عرشے پر آ گئی اور ریلنگ کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پانی میں ڈوبتی ابھرتی سیڑھیوں پر پروفیسر کے سے انداز میں بیٹھ گئی۔ شلوار کے پائینچے اوپر کئے کافی دیر تک پانی میں بیٹھی رہی۔ نہ جانے کیا ہوا تھا کہ جلد از جلد گھر پہنچنے کی فکر کو نیند سی آ گئی تھی، شاید دِل کو قرار سا آ گیا تھا۔ وہ جانا چاہتی تھی مگر اَب اُسے پہلے جتنی جلدی نہیں رہی تھی۔

پھر اُسے اپنے تن پر اجنبی لباس کا خیال آ گیا۔ وہ کسی کی اُترن پہننے کی عادی نہیں تھی۔ ماما نے اُسے کبھی اپنا لباس بھی نہیں پہنایا تھا۔ قسمت پر شاکی ہونے لگی۔ اچھی خاصی مطمئن اور آسودہ زندگی میں یہ چند دِن نہ آتے تو کتنا اچھا تھا۔ اِن چند دِنوں میں اُس نے کیا کچھ نہیں دیکھا تھا۔ سوچ سوچ کر دِل پر بوجھ پڑنے لگا۔ ریلنگ پر بازو رکھا، بازو پر پیشانی ٹکائی اور رونے بیٹھ گئی۔ رونا عمر کا تھا۔ گھنٹوں یا دِنوں میں رونے سے پورا ہونے والا نہیں تھا۔

وہ پروفیسر کو سوتا چھوڑ کر آئی تھی۔ اُسے یہ گمان تک نہیں ہوا تھا کہ پروفیسر اُسے سلانے کیلئے سونے کی اداکاری کر رہا تھا۔ اُس نے کن اکھیوں سے اُسے باہر جاتے دیکھا۔ دِل میں اندیشہ

سر سرایا، کہیں وہ بوٹ میں بیٹھ کر بھاگنے کی کوشش نہ کرے، کہیں وہ کسی کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی غلطی نہ کر بیٹھے، پھر کروٹ بدل کر لیٹ گیا اور ذہن کو توجیہہ پیش کرنے لگا ''کوئی جیسے آتا ہے، ویسے ہی اُسے جانا پڑتا ہے۔ وہ میری مرضی کے بغیر جنت میں داخل ہوئی، میری مرضی کے بغیر یہاں سے چلی گئی تو کیا ہوگا؟ کچھ بھی تو نہیں۔ ویسے بھی وہ ٹھیک ہو چکی ہے، اُسے جانا چاہیے۔''

اِس بہلاوے نے زیادہ تقویت نہیں دی تو پریشان ہو گیا۔ سموں کی موجودگی اُس پر گراں گزر رہی تھی، یہ الگ بات تھی کہ اُس نے ظاہر نہیں ہونے دی تھی۔ مصباح کی موجودگی اُسے ناگوار نہیں گزر رہی تھی۔ یہ بہت غلط بات تھی۔ اُس نے سوچا ''میں بدل رہا ہوں، میرا دِل بدل رہا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ مجھ پر عورت ذات کا تشخص اپنا حصار باندھنے لگا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ میں اپنے ارادوں کی پختگی کو اپنے ہاتھوں تاراج کرنے جا رہا ہوں؟......''

اِنہی سوچوں نے اُسے ڈھیلے ڈھالے لباس میں چھپے بدن کی قیامتوں کی طرف دھکیل دیا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ایسے میں چشمِ تصور میں وہی کٹا پھٹا بدن لہرانے لگا۔ ڈنبھرا کا وجود کیا چمکدار ہوگا، ہٹی کے بدن میں کیا لچک ہوگی، ملہی کے ماس میں کیا گداز ہوگا، سب کچھ تو اُسی بدن نے اپنے پاس رکھ چھوڑا تھا جو اپنی توانائیاں کہیں گنوا کر اُس کی پناہ میں آیا تھا۔ جب چھور رہا تھا، تب کچھ بھی نہیں تھا۔ اَب سوچ رہا تھا تو پورا بدن پسینے میں شرابور ہوا جا رہا تھا۔ ائر کنڈیشنر کی غیر معمولی ٹھنڈک بھی رائیگاں جاتی دکھائی دی تو قالین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ دفعتاً یوں لگا جیسے مصباح کی موجودگی اُس کیلئے ناگزیر ہو گئی ہے۔ اُس نے دانت بھینچ کر پوری سختی سے سر کو دائیں بائیں نفی کے سے انداز میں حرکت دی جیسے وہ اپنی تمام تر توانائیوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اِس خیال کو جھٹلا رہا ہو۔

ڈاکٹر اَشولال نے کہا تھا ''دُنیا بہت خوبصورت ہے مگر عورت دُنیا سے کہیں زیادہ خوبصورت واقع ہوئی ہے۔''

پروفیسر نے اُس کی بات سُن کر قہقہہ لگایا تھا، استہزائیہ انداز میں جھٹلایا تھا اور کہا تھا ''مریم اور رُباب کو یکے بعد دیگرے میں نے بھی خوبصورت قرار دیا تھا۔ دونوں نے اپنے حسن میں چھپے زہر کو

مجھ پر انڈیلتے ہوئے ثابت کیا تھا کہ حسن موت کا دوسرا نام ہے، موت عورت کا کریہہ روپ ہے......''

اپنا کہا نا معتبر نہیں ہوتا مگر اُسے اپنے شبدوں پر بھی شاید اعتبار نہیں رہا تھا۔ سر تھام کر بیٹھ گیا۔ دل نے سمجھایا ''کب تک خود کو جھٹلاتے رہو گے، انسان بنو اور انسانی فطری حسن پرستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی جنت کو حور کے وجود سے پُر کر دو۔ اَشو یہی چاہتا ہے، مزار خان یہی چاہتا ہے۔ اور تو اور افتخار بیگ جیسے تکنیکی ذہن والے جوان کا کہنا بھی یہی ہے۔''

''افتخار بیگ!'' اُس نے زیرلب کہا۔ یوں لگا جیسے کسی نے کھوپڑی کے عقب میں پوری قوت سے ہتھوڑا دے مارا ہو۔ مچھلی کے حلق میں کانٹے چبھونے والے کے حلق میں بھی کچھ پھنس گیا تھا۔ وہ مصباح کو چاہتا تھا۔ چاہت بھی ایسی جس پر قربان جانے کو جی چاہتا تھا۔ ضمیر نے کچوکہ دیا ''پروفیسر وسیم! تم کیسے احسان فراموش انسان ثابت ہو رہے ہو؟ افتخار بیگ نے تم پر کیا کیا احسانات نہیں کئے، تمہارے خواب کو تمہاری ہتھیلی پر سجا کر رکھتے ہوئے اُس نے کوئی معاوضہ طلب نہیں کیا تھا۔ مہینوں سر کھپانے اور مصروف رہنے کی کوئی اجرت نہیں مانگی تھی۔ اُس نے تمہیں اپنی محبت سے آگاہ بھی کر دیا ہے، پھر تم اتنے گھٹیا کیوں نکلے، اپنے محسن پر شب خون مارتے ہوئے تمہارے خون تک نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ تم دُنیا کو ترک کرنے کے بنیادی سبب کو گنوا چکے ہو، دُنیا اور جنت کے مابین حائل عظیم فرق کو ملیامیٹ کر چکے ہو، آہ! لعنت ہے تم پر!''

اُس کا سر دُکھنے لگا۔ اُٹھا اور بے اختیار مصباح کے تعاقب میں بیڈروم سے نکلنے لگا۔ اَدھ کھلے دروازے کو تھام کر تھم گیا۔ مصباح کے پیچھے لپکنا معیوب لگا۔ وہ جوانی کی سرحد عبور کر چکا تھا۔ جوانی کے تقاضوں کو بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ دروازہ بند کر کے بیڈ پر آ کر بیٹھ گیا۔ سر جھکا ہوا تھا اور پیشانی سے پسینے کے ننھے ننھے قطرے ٹپک رہے تھے جو اُس کے جذباتی خلفشار کو عیاں کر رہے تھے۔ ایسے میں اُسے مریم یاد آ گئی۔ اُس کی نظروں میں رُباب لہرا گئی۔ جنہیں دِل بھولنا چاہے، وہ بے اختیار یاد آنے لگیں۔ خود کو یادوں کے عذاب سے بچانے کیلئے اُس نے ایف ایم ریڈیو آن کر دیا۔ سرائیکی گیتوں کا فرمائشی پروگرام چل رہا تھا۔ میزبان کی باتوں نے اُس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرتے

ہوئے اُسے سابقہ کیفیت سے نکال لیا۔ چونک پڑا۔ میز بان مقامی زبان میں کئی فرمائش کرنے والوں کے نام گنواتے ہوئے اپنی آواز میں زبردست صوتی تغیر پیدا کرتے ہوئے بتلایا کہ اَب آپ کی خدمت میں سئیں اَشولال فقیر کا کلام پیش کیا جارہا ہے۔

پھر سازوں کے ہم قدم اَشولال کے لکھے شبد پھسلتے ہوئے اُس کی سماعت میں اُترنے لگے ''توں اوڈ میں تیڈی اوڈنی......''

پروفیسر نے بارہا مرتبہ یہ گیت سن رکھا تھا۔ ہر مرتبہ سننے پر نیا لگتا تھا۔ آج نیا نہیں لگ رہا تھا بلکہ لفظ لفظ طنز کرتا محسوس ہورہا تھا۔ اُس کا پارہ چڑھ گیا۔ اِس پروگرام کے میز بان الٰہی بخش سے اُس کی شناسائی تھی۔ اُس کا فون نمبر بھی میموری میں فیڈ تھا۔ نمبر ملایا اور سرائیکی زبان میں مخاطب ہوا ''الٰہی بخشا! تجھے اَشولال فقیر کے علاوہ کوئی شاعر نہیں ملتا؟''

''خیر تو ہے سئیں؟ خواجہ فریدؒ، میاں محمدؒ اور بلھے شاہؒ کے بعد یہی فقیر ہی تو ہماری ثقافت کا سرمایہ ہے۔ سرائیکی بیلٹ میں کون ایسا ہے جو اُسے سننا نہیں چاہتا، کون ایسا ہے جو اُس سے محبت نہیں کرتا؟'' الٰہی بخش نے تعجب سے کہا ''آپ بھی بارہا مرتبہ فرمائش کر چکے ہیں۔ اَشولال کی 'اوڈنی' کیلئے دَمان کے لوگ گھنٹوں ریڈیو سے کان لگائے بیٹھے رہتے ہیں اور ہمیں فون پر فون کرتے رہتے ہیں۔''

پروفیسر مزید مشتعل ہوگیا۔ کال منقطع کر کے زیرلب الٰہی بخش کو بے نقط سنانے لگا۔ گلوکار منصور ملنگی کی راگوں میں لپٹی آواز بغیر کسی تعطل کے اُس کے ذہن میں ہتھوڑے برسا رہی تھی اور وہ خود کو بے دست و پا محسوس کرنے لگا تھا۔ اتنا کہ ہاتھ بڑھا کر ریڈیو بند کرنے کی ہمت بھی نہیں کر سکا۔ کوئی بتلائے کیا کہ کیوں ائر کنڈیشنر کی بھل بھل کرتی ہوا بے اثر جاتی ہے، کوئی سمجھائے کیا کہ دریا کے ٹھنڈے پانی میں آدھا بھیگا ہوا وجود کیونکر آگ کی سی تپش پکڑنے لگتا ہے۔

مصباح نے بیڈروم میں جھانکا۔ اُسے گہری نیند میں مستغرق دیکھ کر دروازہ بند کر دیا اور کچن کا رُخ کیا۔ پروفیسر کے جاگنے سے پہلے ہی اُس نے شام کا کھانا تیار کرلیا۔ وہ پکانے میں اِتنی ماہر نہیں تھی۔ ماما کی نصیحتوں کو ایک کان سے سُن کر دوسرے سے نکالتی رہتی تھی۔ پاپا اُس کی حمایت میں کہہ دیتے ''اگلے گھر جائے گی تو یہ مصیبتیں خود بخود گلے پڑ جائیں گی، اَبھی تو اِس کے ہاتھ خراب نہ کرو۔''

پاپا کی شہہ پر دلیر ہوجاتی اور کچن سے دور ہی رہتی۔ ماما کو پکاتے دیکھتی رہتی۔ وہی دیکھا کام آ رہا تھا۔ پروفیسر نے اپنے کچن میں غیر معمولی انتظامات کر رکھے تھے۔ اُسے کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

پروفیسر جب آنکھیں ملتے ہوئے بیڈ روم سے نکلا تو جنت کی تمام لائٹس کو روشن پا کر تعجب سے ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ وہ مصباح کو تلاش کر رہا تھا۔ برتنوں کی کھنک نے مصباح کا سراغ دیا۔ وہ سگریٹ کیس اور لائٹر ہاتھ میں پکڑے کچن میں گھس گیا۔ اُسے پسینے میں شرابور دیکھا۔ پوچھا ''کیا کر رہی ہو؟''

''آپ سو رہے تھے، جگانا مناسب نہیں سمجھا اور خود کو مصروف رکھنے کیلئے کچن میں آ گئی۔ میں نے کھانا تیار کر دیا ہے۔'' مصباح نے بتایا۔

''لائٹس تم نے روشن کی ہیں؟''

''جی!''

پروفیسر کی حیرت دیدنی تھی۔ وہ اُس کے ردِعمل کو بھانپ کر بولی ''میں نے کنٹرول روم میں آپ کو بٹن دباتے ہوئے دیکھا تھا۔''

اُس نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ وہ اُس کی اجازت کے بغیر ہی جنت کے معاملات میں انوالو ہو چکی تھی۔ اچنبھا ہوا۔ بولا ''یوں لگتا ہے جیسے تم جنت کو ٹھونک بجا کر دیکھ چکی ہو۔''

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پروفیسر پلٹ کر باتھ روم میں گھس گیا۔ غسل کر کے باہر آیا اور حسبِ عادت جنت کا چکر کاٹ کر عرشے پر آ گیا۔ اِسی دوران میں مصباح نے ٹیبل پر کھانا چن دیا تھا۔ دورانِ طعام دونوں ایک دوسرے سے لاتعلق سے رہے۔ چائے پیتے ہوئے مصباح نے کہا ''سر! میرے لئے کیا حکم ہے؟''

پروفیسر کو اُس کا مؤدبانہ اور ملتجیانہ لہجہ بہت اچھا لگا، بولا ''تم کیا چاہتی ہو؟''

''میں گھر جانا چاہتی ہوں۔'' مصباح نے نظریں جھکا لیں۔

''وہاں جا کر کیا کرو گی؟''

''گھر میں کیا کیا جاتا ہے؟'' وہ پُراستعجاب انداز میں دیکھنے لگی۔

پروفیسر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خود ہی بول پڑی ''میں جانتی ہوں کہ وہاں میرا استقبال کس انداز میں ہوگا مگر جانا تو ہے ناں! آپ پر کب تک بوجھ بنی رہوں گی۔''

پروفیسر کے حلق سے کراہ نکلی ''تم مجھ پر بوجھ نہیں ہو مصباح!''

اُس نے چونک کر پروفیسر کو دیکھا۔ تبدیلی کا احساس ہؤا مگر سمجھ نہ پائی۔ بولی ''پھر بھی سر! مجھے جانا ہوگا۔''

''کس کیلئے؟ شہاب یا افتخار بیگ کیلئے جانا چاہتی ہو؟''

''نہیں...... اپنے ماما پاپا کیلئے، اپنے بھائیوں کیلئے۔''

''ہوں!'' پروفیسر کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ سوچ میں پڑ گیا۔ حقیقت کو تہہ دل سے قبول کرلیا کرتا تھا۔ جانے والی کو جانا ہی تھا مگر نہ جانے دِل کیوں قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ بولا ''ٹھیک ہے مصباح! میں کل کسی سے رابطہ کرنے کی کوشش کروں گا۔ اپنے کسی دوست کو تکلیف دوں گا، وہ میرا نمبر تمہارے گھر پہنچا دے گا۔ تمہاری بات کروا دوں گا۔ پھر اُن پر منحصر ہوگا کہ وہ کب رابطہ کریں گے۔''

اُس نے شکریہ ادا کیا۔ کچھ یاد آنے پر چونک کر بولی ''سر! آپ سو رہے تھے، میں سیڑھیوں پر آ کر بیٹھ گئی تھی۔ ایک کشتی میں سوار کچھ لوگ یہاں سے گزرے تھے۔ اُنہوں نے مجھے دیکھا تھا اور مجھ سے کچھ پوچھا تھا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ اُٹھ کر اندر چلی گئی تھی۔''

پروفیسر نے اُس سے کشتی کی گزرگاہ کے بارے میں چند سوالات کئے پھر مطمئن ہوکر بولا ''مُہانے کسی کام سے نکلے ہوں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مچھلیاں پکڑنے والے ٹھیکدار مال کا جائزہ لے رہے ہوں۔ بہ ہر حال! تمہیں فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

آٹھ بجے کے قریب مصباح کی فرمائش پر اُس نے سیر کرانے کی غرض سے اُسے بوٹ میں بیٹھایا اور کھلے پانی میں آ گیا۔ چھوٹی سی بوٹ مصباح کے ہلنے پر ہچکولے لیتی تو یوں لگتا جیسے وہ بچپن کی طرف پلٹ گئی ہو جہاں لوری سناتی ماما اُسے گود میں بھر کر گھٹنوں سے جھلا رہی ہو۔ پروفیسر زیادہ دور نہیں گیا بلکہ جہاں تک جنت کی روشنیوں کا عمل دخل تھا، وہیں تک محدود رہا۔ دو تین چکر کاٹنے کے بعد

واپس آ گیا۔مصباح نے کہا ''سر! میرے کزن نے ٹھیک ہی کہا تھا۔''

''کیا کہا تھا اُس نے؟'' پروفیسر نے جھٹ سے پوچھا۔

''اُس نے مجھے اور میرے بھائی وجدان کو بتلایا تھا کہ پروفیسر کی جنت میں جانے والا دُنیا کو بھول جاتا ہے۔ یہ کہنے کو کشتی ہے، رہنے کو مکمل گھر ہے۔ وجدان کہتا تھا کہ جتنی رقم اِس پر خرچ ہوئی ہے، اتنی رقم میں کسی اچھے علاقے میں بہترین مکان بنایا جاسکتا ہے۔ میں کہتی ہوں کہ مکان جتنا بھی خوبصورت ہو، اِس سے بہتر اور آرام دہ نہیں ہوسکتا۔''

پروفیسر کو ماننا پڑا کہ وہ بہت روانی سے گفتگو کرنے پر ملکہ رکھتی تھی۔ اُسے بڑی لگن سے دیکھے گیا۔

ہوا خاصی تیز ہوگئی تھی۔ ہوا میں خنکی بھی غیر معمولی حد تک متجاوز ہوچکی تھی۔ دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے۔مصباح دریا کی طرف پشت کرکے ریلنگ کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر کھڑی باتیں کررہی تھی۔ اُس کے تن پر سجا ڈھیلا ڈھالا لباس تیز ہوا سے پھڑ پھڑا رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر ستون پر لگے بڑے مرکری بلب کی تیز روشنی پڑ رہی تھی جب کہ پروفیسر کا چہرہ اندھیرے میں ڈوبا ہوُا تھا۔ پیچھے سے پڑتی ہوئی روشنی میں اُس کے بال چمک رہے تھے۔مصباح بولی ''سر! ایک بات پوچھوں؟''

''پوچھو!'' پروفیسر نے سگرٹ سلگاتے ہوئے فراخدلی سے کہا۔

''آپ کی بیوی بچے کہاں ہیں؟''

پروفیسر کا دَم گھٹنے لگا۔ بولا ''میرا کوئی نہیں ہے۔''

''یہ کیسے ممکن ہے؟'' وہ بھونچکی رہ گئی۔

''جیسے تم اِس وقت لاوارث ہو،تمہارا یہاں کوئی بھی نہیں ہے، ایسے ہی میرا دُنیا میں کوئی نہیں ہے۔''

مصباح کے دِل پر گھونسہ پڑا۔تڑپ کر بولی ''میرے تو سبھی ہیں، ماما، پاپا، بھائی......''

''یہاں تمہارا کوئی بھی نہیں ہے مصباح!'' پروفیسر نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

''یہاں آپ ہیں، آپ بھی میرے ہیں۔'' وہ روانی میں کہہ گئی۔ پھر چونک کر اُسے دیکھنے لگی مگر

سیگرٹ کے ننھے سے انگارے کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیا تو جھجک کر مرکری بلب کی طرف دیکھنے لگی۔ستون پر چڑھے سورج نے اُس کے چہرہ کو جگمگاتا ہوُا چاند بنا ڈالا تھا۔ پروفیسر کا رواں رواں بے اختیار ہونے لگا۔

''میں تمہارا کچھ بھی نہیں ہوں۔''

وہ محض کندھے اُچکا کر رہ گئی۔ پروفیسر نے ایک لمبا کش پھیپھڑوں میں اُتارا اور نسبتاً بلند آواز میں بولا''میں پروفیسر وسیم بُزدار......اصلاً سیمو مُہانہ......گھر سے نکلا اور محبت کی لال بتی کے پیچھے بھاگتے بھاگتے اِس جنت تک آن پہنچا۔ زوال سے شروع ہونے والی کہانی کو عروج پر منتج ہونا تھا، ہوگئی۔ میں نے دو شادیاں کیں۔ مریم مجھے بہت پیاری تھی۔ رُباب مجھے بہت پیار کرتی تھی۔ دونوں جیسے میری زندگی میں داخل ہوئی تھیں، ویسے ہی رخصت ہوگئیں۔ گھاؤ دے گئیں جو کبھی بھی بھرنے والا نہیں ہے۔تمہارا جسم زخم زخم ہوُا ہے جو دِنوں میں بھر گیا ہے۔ میری روح زخمی ہے جو عمر بھر آسودہ نہیں ہو سکے گی۔تم کیا پوچھتی ہو،تم کیا کہتی ہو، یہ سب افسانوی اور کتابی باتیں ہیں۔تم نے پڑھا ہے، میں نے دیکھا ہے۔ دُنیا اَشو لال کی ہے، دُنیا مزار خان کی ہے، دُنیا شہاب خان کی ہے......میری نہیں ہے، میرے جیسے کسی بھی کمین کی نہیں، کسی کنگر، مُہانے، گھاڑو یا لوری کی نہیں...... یہ محض سرداروں، جاگیرداروں اور فرعونوں کی ہوس کا پیٹ بھرنے کیلئے بنائی گئی ہے۔''

وہ ایک ٹک پروفیسر کو دیکھ رہی تھی،توجہ سے سُن رہی تھی مگر کچھ پلے نہیں پڑ رہا تھا۔مزاحمتی لہجے میں بولی''لوگ آپ سے محبت کرتے ہیں، آپ کا احترام کرتے ہیں، پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں یہ دُنیا آپ کی نہیں ہے؟''

''کوئی محبت نہیں کرتا، سب دکھاوا کرتے ہیں۔ مجھے بہلاتے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ میں بھی اُن کی طرح اِس جہنم کا ایندھن بنا سلگتا رہوں۔ یہ مجھ سے نہیں ہوسکتا۔'' پروفیسر کی آواز مزید بلند ہوگئی ''دیکھو مصباح! تم کیا ہو؟ تمہارے پاس کیا بچا ہے؟ کچھ بھی تو نہیں......دُنیا کہتی ہے کہ عورت کا دِل عزت وعفت کی پسلیوں میں زندہ رہتا ہے۔تمہاری پسلیاں ٹوٹی ہوئی ہیں مگر تمہارا دِل دھڑک رہا ہے۔ یہاں سے جاؤ گی تو کچھ عرصہ تک تمہارے دماغ میں اِن ایام کا دُکھ احساسِ کمتری بن کر جاگتا

رہے گا پھر کبھی نہ ٹوٹنے والی نیند بن جائے گا۔ تمہیں یاد بھی نہیں رہے گا کہ شیرے گرمانی کے گرگوں نے تمہارے ساتھ کیا کیا تھا۔ تمہاری نظروں سے شہاب خان کا چہرہ تک محو ہو جائے گا۔ تمہیں پروفیسر وسیم بزدار بھول جائے گا۔ تم پھر کسی سے محبت کرنے کیلئے نکل کھڑی ہوگی۔ یہی ناانصافی ہے۔ یہی انیائے ہے۔ تمہارا بدن کچا ہے، ہر تحریر ایک مخصوص وقت کے گزرنے پر مٹ جاتی ہے۔ تمہاری روح مچھلی کی طرح پھسلواں ہے۔ ہر شئے پانی کی طرح پھسل جاتی ہے۔ مَرد ایسا نہیں ہوتا۔ مَرد بھولنے والا نہیں ہوتا۔ مَردوں کا معاشرہ عورتوں کا طرف دار ہے، عورت کو باوفا کہتا ہے، خود کو بے وفا کہتا ہے۔ عورت چالاک ہے، خود کو وفا کی دیوی قرار دیتی ہے، مرد کو بے وفا اور ظالم کہہ کر اپنی مظلومیت کی جھوٹی داستان کو معاشرتی دستاویز بنا کر رکھ دیتی ہے۔ ہمدردیاں سمیٹنے کیلئے آنسو بن جاتی ہے۔ میں اِس معاشرے کو جھٹلا چکا ہوں۔ اِس طرزِ معاشرت پر چار حرف بھیج چکا ہوں۔ تم بھی اُنہی میں سے ہو، آئی ڈِس لائک دَیم......آئی ہیٹ یو......''

پروفیسر کے حلق سے اُبلتا لاوہ اُس کی سماعت میں اُتر رہا تھا اور وہ ہونق بنی اُسے ایک ٹک دیکھے جارہی تھی۔ پروفیسر کی کیفیت اُسے دہلا رہی تھی۔ بدن غیر محسوس انداز میں لرزنے لگا۔

چند لمبے لمبے سانس لینے کے بعد پروفیسر نے چیختے ہوئے کہا ''اے کم ذات لوگو! میں مُہانہ ہوں، تمہاری نظر میں کمین ہوں، تحریر کر کے اپنے گریبان میں لٹکا لو کہ تمہارے نچلے پَن کو سنبھالے بیٹھا ہوں۔ تمہیں آئینہ دکھا رہا ہوں۔ تم عورت کو رنگ برنگے ملبوسات میں سجا کر کہتے ہو کہ عورت نمائش کی دلدادہ ہے، زیورات سے لاد کر کہتے ہو کہ زیور عورت کی کمزوری ہے، اِس کے ناپختہ اور بچوں جیسے نازک بدن کو اِس کی عصمت گاہ قرار دے کر درندوں کی طرح نوچتے ہو، اِسے مامتائی جذبے سونپ کر بلیک میل کرتے ہو اور تماشہ بنا کے ایک طرف رکھ دیتے ہو۔ یہی تمہاری بڑائی ہے۔ یہی تمہارا ظرف ہے۔ تم سے اچھا میں، ایک مُہانہ، ایک کمین کہ تمہارے ہاتھوں لٹی پٹی لڑکی کو پناہ دیے بیٹھا ہوں۔ اپنے ظلم کی واسوختگی ملاحظہ کرنے کیلئے آ سکتے ہو تو آ جاؤ، دیکھو کہ تم نے اِس کے عقائد اتنے راسخ کر دیے ہیں کہ یہ اپنے پناہ گیر سے بھاگ کر پھر تمہارے چنگل میں پھنسنے کیلئے بے چین ہے۔ آ......او......آ ؤ......اِس کی بے قراری کو سمیٹنے کیلئے آ جاؤ۔ جو مرنا چاہے، اُس کا مر جانا ہی عافیت قرار

پاتا ہے۔''

وہ یقیناً اپنے اختیار میں نہیں رہا تھا۔ مصباح نے ڈر کر پیچھے ہٹنا چاہا تو کمر سے نچلا حصہ ریکنگ سے ٹکرا گیا۔ تھم گئی اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے پروفیسر کو دیکھنے لگی۔ پروفیسر نے یکبارگی سگرٹ کا اَدھ جلا ٹکڑا پانی میں اچھالتے ہوئے اُسے شانوں سے پکڑ لیا۔ اُس کی گرفت اتنی سخت تھی انگلیاں ماس میں پیوست ہوتی محسوس ہونے لگیں۔ پروفیسر چند لمحوں تک اُس کے چہرے پر نظریں گاڑے کھڑا رہا، پھر اُس کے لبوں پر جھک گیا۔ چند ہی لمحوں میں اُس کی جنونی کیفیت نے دونوں کو توڑ موڑ کر رکھ دیا۔ اُس نے مصباح کے بازو چھوڑ کر اُسے چھاتی سے لگا کر اتنی زور سے بھینچا کہ اُس کی پسلیاں کڑ کڑا کر رہ گئیں اور حلق سے چیخ نما عجیب سی آواز برآمد ہوئی۔ وہ بے دَم ہو کر پروفیسر کے قدموں میں گر کر ہانپنے لگی۔

پروفیسر یک دَم سنبھل گیا۔ تیز قدموں سے چلتا ہوا ٹیبل تک آیا۔ موبائل فون اور سگرٹ کیس وغیرہ ٹیبل پر رکھ دیے اور پلٹ کر ریکنگ کی طرف بھاگا۔ قریب پہنچ کر وہ دونوں پیروں پر اُچھلا اور قلابازی لگا کر پانی میں کود گیا۔ جنت کو ایک جھٹکا سا لگا۔ مصباح کھلی بے نظر آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی مگر سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ پروفیسر کیا کر رہا ہے۔ اُس کا سینہ دھونکنی بنا ہوا تھا۔ کوشش کے باوجود تنفس معتدل نہیں ہوا۔

پروفیسر پانی میں بہت دُور تک چلا گیا۔ بازو تھک گئے۔ جنوں ٹھہر گیا تو پلٹا اور عقبی سیڑھیوں کی طرف تیرنے لگا۔ سیڑھیوں پر بیٹھ کر اپنی کیفیت کو سوچنے لگا۔ وہ ایسا تو کبھی بھی نہیں رہا تھا۔ عورت اُس کیلئے اَن دیکھا کھلونا نہیں تھا۔ مریم اور رُباب کے بدن کی حشر سامانیوں کی ملاحظگی میں کئی برس گزرے تھے۔ اُسے یہ بھی اعتراف تھا کہ دونوں مصباح سے کہیں زیادہ خوبصورت تھیں۔ شاید اُنہیں دیکھنے والی آنکھوں میں جوانی بھری ہوئی تھی۔ مصباح کو دیکھنے والی آنکھ اَدھیڑ عمری کی بازگشت بنی ہوئی تھی۔ اُس نے دائیں ہاتھ کا مکا بنایا اور پوری قوت سے ریکنگ پر دے مارا۔ تکلیف سے بلبلا اُٹھا۔ پھر مُکا مارا۔ پھر منہ سے سسکی نکلی۔ اِس عمل میں روانی آ گئی۔ وہ خود کو ایذا پہنچاتا ہوا نارمل بالکل دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اُسے تو یہ بھی احساس نہیں ہوا تھا کہ عین سر کے اوپر ریکنگ کو

مضبوطی سے تھامے کھڑی مصباح اُس کے جنوں کو ملاحظہ کر رہی ہے۔

شاید ایک گھنٹہ گزر گیا تھا جب پروفیسر ریکنگ کا سہارا لے کر کھڑا ہوا۔ گیلے ہاتھوں کو آنکھوں پر پھیرتے ہوئے عرشے پر آیا۔ مصباح کو دیکھا اور نظر چراتا ہوا بیڈ روم کی طرف بڑھ گیا۔ اُس نے مصباح کو ساتھ لینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ائر کنڈیشنر آن کرنے لگا تو مصباح کا خیال آیا۔ جلدی سے باہر نکلا۔ مصباح تک پہنچا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ رُک گیا اور نرم لہجے میں بولا ''کیا تم بالکل فٹ ہو؟''

اُس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے سر جھکا لیا۔

پروفیسر بولا ''وہ زخم جو مجھے دکھائی نہیں دیتے، ٹھیک ہو گئے ہیں؟''

وہ بولی ''جی سر!''

''کیا اپنے گھر تک جا سکتی ہو؟''

اُس نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔

پروفیسر چند لمحوں تک کھڑا اُسے دیکھتا رہا، پھر بولا ''تم دُنیا کو جنت پر ترجیح دے رہی ہو، کیا ایسا ہی ہے؟''

وہ اپنا دفاع کرنے لگی ''نہیں سر! جنت جیسی پُرسکون جگہ کہیں بھی نہیں ہے۔''

''پھر گھر کیوں جانا چاہتی ہو؟''

وہ کوئی جواب نہ دے پائی۔ پروفیسر نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا، دونوں ہاتھ آگے بڑھائے اور اُس کے سینے پر رکھ کر بولا ''تم بیمار اور بے ہوش تھیں جب میرے پاس پہنچی تھیں۔ اَب تم بالکل فِٹ ہو، مجھے یقین ہے کہ اپنے گھر بہ آسانی پہنچ جاؤ گی۔ میرا کردار تمام ہوا۔ اَب میں تمہارا سفر کھوٹا نہیں کروں گا۔ خدا حافظ میری جان!''

اُس نے مصباح کے سینے پر دھرے ہاتھوں کو حرکت دی، زوردار دھکا دے کر اُسے سر کے بَل پانی میں گرا دیا۔ ایک بھیانک چیخ پھر چھپاک کی تیز آواز رات کے سناٹے میں بہت دُور تک گئی۔ پسینے سے شرابور پروفیسر ریکنگ کو تھام کر جھکا اور ڈوب کر اُبھرتی مصباح کو دیکھنے لگا۔ اُس نے جنت

کی فاؤنڈیشن پر ہاتھ جمانے کی کوشش کی مگر جنت کے نیچے سے نکلتے ہوئے تیز پانی کے دھارے نے اُسے کئی گز پرے دھکیل دیا۔ وہ ہاتھ پیر مارتے ہوئے پروفیسر کو مدد کیلئے پکار رہی تھی۔

انسان ایسا ہی ہوتا ہے۔ عورت ایسی ہی ہوتی ہے۔ جو دُکھ دیتا ہے، اُسے ہی مسیحا سمجھ کر پکارنے لگتی ہے۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ جس سے ڈوبتے میں زندگی کا سہارا طلب کر رہی ہے، وہ اپنی پسلیوں میں موجود دھڑکتے ہوئے لوتھڑے کو پتھرا چکا ہے۔

پروفیسر کے دیکھتے دیکھتے وہ ہاتھ پاؤں مارتی ہوئی اندھیرے اور گہرے پانی میں چھپ کر نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔ اندھیرا اور پانی پروفیسر کی آنکھوں میں بھی رَچ گیا۔ اُس نے دایاں ہاتھ اُٹھایا، دائیں بائیں لہراتے ہوئے رُندھی ہوئی آواز میں بولا ''تم ہی میری مریم ہو، میری رُباب ہو مگر دُنیا نے تمہیں مصباح کا لباس پہنا کر مجھے دھوکہ دینے کی کوشش کی ہے۔ تم نے گھر جانے کی ضد کی، میں نے پہچان لیا۔ خدا حافظ میری جان!''

...۞...

سبھی بضد تھے کہ مصباح مر چکی ہے اور اُس کی نعش کو تلاش کرنا چاہیے۔ ماما دِل پر ہاتھ رکھ کر کہہ رہی تھی ''نہیں۔ میری مصباح مر نہیں سکتی۔ جب تک میرا دِل دھڑکنا بند نہیں کرتا، مجھے یقین رہے گا کہ وہ زندہ ہے۔ تم سب لوگ ناکارہ ہو۔ ایک ماں کی جھولی کو آباد کرنے کے قابل بھی نہیں ہو۔ دو پہاڑ جیسے بیٹے جن کر بھی میں اکیلی ہوں۔ کوئی میرا نہیں ہے۔ ہائے! کوئی تو ہو جو میرا دَرد سمجھے، کوئی ہو تو ہو جو میری خاطر آسمان سے تارا توڑ لائے، کوئی تو ہو جو میری مصباح کی خاطر زمین کی گہرائی میں اُتر کر اُسے تلاش کرے۔''

عمران کا سر جھک گیا۔ آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ ماما نے طنزیہ لہجے میں کہا ''تمہارا پَل پَل گن کر انتظار کیا۔ سوچا، آؤ گے تو میری مصباح کو ڈھونڈ کر میری جھولی میں لا پھینکو گے۔ غلط سوچا تھا۔ تم بھی اپنے باپ اور بھائی کی طرح بُزدل انسان ہو۔''

اُس کا سر مزید جھک گیا۔ شرمساری کا بوجھ کندھے اُٹھانے سے انکاری ہو گئے تھے۔ اُٹھ گیا۔

بیرونی دروازے میں آ کر ٹھہر گیا۔ پلٹ کر نہ دکھائی دینے والی ماما سے مخاطب ہوکر بڑبڑایا ''ماما! آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ میں بُزدِل ہوں۔ میں کسی کام کا نہیں ہوں۔ میرا جینا اور مرجانا ایک برابر ہے۔ گھر سے نکلتے وقت عہد کرتا ہوں کہ مصباح کو، وہ جس حال میں بھی ہے، لے کر ہی پلٹوں گا وگرنہ اپنی شکل دُنیا کے ہجوم میں گم کردوں گا۔''

دور تک پیدل چلتا گیا۔ ذہن میں جھکڑ چل رہے تھے۔ نظر کسی شئے پر ٹھہرنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ وہ سارا دِن چلتا رہا۔ دفتر دفتر چھانتا رہا۔ کسی نے اُس کی مشکل سنی ہی نہیں، کسی نے سنی مگر کان نہیں دھرے۔ مصباح کی لاش کو تلاش کرنے کیلئے کوئی بھی اُس کے ساتھ دریائے سندھ پر جانے کو تیار نہیں تھا۔ کوئی محکمہ بھی ایسا نہیں تھا جو اُس کی معاونت کرتا۔ پولیس والوں نے بھی ٹکا سا جواب دے دیا۔ ایس ایچ او نے سمجھایا ''تمہارے بقول اُس کو کئی دِن گزر گئے ڈوبے ہوئے، کیا اَب وہ ہمیں مل سکے گی؟ نہیں...... اول تو اُسے مچھلیاں کھا چکی ہوں گی، مچھلیوں سے بچ گئی تو ملاحوں کے ہاتھ لگ گئی ہوگی جنہوں نے لاوارث خیال کر کے اُسے دفنا دیا ہوگا۔ ہیڈ ورکس کے عملے کے ہاتھ لگی ہوتی تو ہمیں اطّلاع ضرور دی جاتی۔''

وہ تھانے سے باہر نکلا۔ ایک اجنبی نے روک لیا۔ بولا ''تمہارے مسئلے کا حل حکومت کے پاس نہیں ہے دوست! تم کسی این جی او سے رابطہ کرو۔''

وہ چونک کر رُک گیا۔ بولا ''میں کسی این جی او سے واقف نہیں ہوں، راہ نمائی کر کے احسان کردو۔ کبھی نہیں بھولوں گا۔''

وہ نہ جانے کون تھا۔ دل میں انسانی دَرد سنبھال کر رکھتا تھا۔ اُسے لے کر ایک این جی او کے دفتر میں پہنچ گیا۔ اُس کا مسئلہ بیان کرنے کے بعد این جی او کے سوشل آرگنائزر سے مخاطب ہوا ''دوست! میں اِسے نہیں جانتا۔ ڈوبنے والی کو نہیں جانتا۔ یہ جانتا ہوں کہ جب میری بیٹی ڈوب کر میری نگاہوں سے اوجھل ہوگئی تھی اور مجھے پتہ چل گیا تھا کہ اَب وہ دُنیا میں نہیں رہی تو میرے دِل پر کیا گزری تھی۔ مجھے اپنی بیٹی کی گم شدہ لاش نے آج تک چین سے سونے نہیں دیا۔ کئی سال گزرنے پر بھی میں اُس کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہوں۔''

عمران پھٹی پھٹی نگاہوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

وہ دل گیر لہجے میں کہہ رہا تھا ''دوست! تم 'ساگر فاؤنڈیشن' کے آرگنائزر ہو۔ سینکڑوں سیلاب زدگان کی مدد کر چکے ہو۔ لاکھوں کروڑوں کے فنڈ اپنے غیر ملکی ڈونرز سے لے کر خرچ کر چکے ہو۔ اِس بے چارے کی غم گساری پر کچھ خرچ کر دو گے تو پوری انسانیت پر احسان ہوگا۔''

عمران نے جلدی سے کہا ''میں اِس کام پر اُٹھنے والے اخراجات خود ادا کروں گا۔''

ساگر فاؤنڈیشن بنیادی طور پر دریائے سندھ سے منسلک لوگوں کو سیلاب سے بچاؤ کے طریقے بتلانے، فصلوں کا انتخاب کرنے اور دورانِ سیلاب امداد بہم پہنچانے کیلئے بہت فعال مانی جاتی تھی۔ کچھ پیش و پس کے بعد این جی او نے عمران کے دُکھ کو اپنانے کا فیصلہ کرتے ہوئے کمر باندھ لی اور اُسی شام کو ہی گاڑیوں میں بیٹھ کر نکل کھڑے ہوئے۔ عمران کے راہ نما نے اُس پر ترحم آمیز نگاہ ڈالی اور آہ بھر کر رخصت ہو گیا۔ اُس نے کوئی دعا، کوئی دلاسہ، کوئی امید...... کچھ بھی تو نہیں دیا تھا۔

عمران نے افتخار بیگ اور مظہر عباس کو بھی اپنے ساتھ لے لیا۔ مشاورت کے بعد یہ طے پایا کہ کھوج کا آغاز دریا کے اُس پتن سے کیا جانا چاہیے جو بیلے کے قریب واقع ہے۔ جب گاڑیوں میں بیٹھ پر این جی او کی ٹیم کے ہمراہ وہ پتن پر پہنچے، رات کا اندھیرا ہر سو پھیل چکا تھا۔ ساگر فاؤنڈیشن کے ماہر جوانوں نے نصف گھنٹے میں ہی دریا سے کچھ فاصلے پر خیمے نصب کئے اور صبح کے انتظار میں شب بسری کا اہتمام کرنے لگے۔ چندلڑ کے مُہانوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ اُنہیں ملاحوں سمیت دو عدد کشتیاں درکار تھیں جو دریا کے دونوں کناروں کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ہیڈ ورکس تک کا سفر کر سکیں۔ وہ جب رات کو اپنے تمام ضروری امور نبٹا کر خیموں میں آئے تو عمران اور افتخار بیگ کو بیدار پایا۔

......

قسمت کی ماما کو پیکنگ کرتے دیکھ کر ہنس دِل مسوس کر رہ گیا۔ قسمت کو ہاتھ کے اشارے سے باہر چلنے کا کہہ کر ماما کو سلام کئے بغیر باہر آ گیا۔ وہ پیچھے پیچھے دوڑی آئی ''کیا بات ہے ہنس؟''

''تو کیا تم جا رہی ہو؟''

''جانا تو ہے۔''

''مجھے بھی ساتھ لے جاؤ۔'' ہنس کا لہجہ گلوگیر تھا۔

''یہ کیسے ممکن ہے؟''

''کیوں؟ میں تمہارے ساتھ کیوں نہیں جا سکتا؟''

''تم بھی یہاں سے چلے گئے تو پوڈو کا کیا بنے گا؟'' قسمت نے کہا۔

''مجھے کیا؟'' ہنس نے کندھے اُچکائے اور منہ بنا کر کہا۔

وہ چپ رہی اور جوتا اُتار کر انگوٹھے کے ناخن سے فرش کی اینٹ کو کھرچنے لگی۔

''چلو! دریا دریا کھیلیں۔'' ہنس نے ترغیب دی۔

وہ بولی ''نہیں۔ اَبھی دھوپ بہت تیز ہے۔''

''تم دوپٹہ اوڑھ لو، میں بابا کی چادر اُٹھالاتا ہوں۔''

وہ نہیں مانی۔ ہنس مایوس ہو کر اپنے گھر لوٹ آیا۔ اپنی ماما کی جھولی میں سر رکھ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ ماما نے پوچھا ''قسمت کب جا رہی ہے بیٹا؟''

وہ بولا ''کل نہیں پرسوں نہیں بلکہ اُس سے اگلے دِن۔''

''یعنی تمہیں پتہ ہی نہیں کہ تمہاری دوست کب جائے گی؟''

وہ کچھ نہیں بولا۔ منہ چھپا کر خاموش ہو گیا۔ ماما اُس کی کمر پر سے قمیص ہٹا کر سہلانے لگی، سُلانے لگی۔ کچھ ہی دیر میں وہ سو گیا تو ماما نے اُسے بڑی احتیاط سے بیڈ پر لٹا دیا اور خود اپنے شوہر کے پاس آ گئی۔ دھیمے لہجے میں بولی ''ہنس نے کھانا پینا کم کر دیا ہے۔''

''موسی گار سیرپ کی ڈوز دینا شروع کر دو۔ ٹھیک ہو جائے گا۔'' ڈاکٹر اَشولال نے بے توجہی سے کہا۔ وہ کسی ضخیم کتاب کے مطالعے میں مصروف تھا۔

''میری بات پر توجہ تو دیجئے ناں!'' اس نے احتجاج کیا۔

ڈاکٹر نے کتاب بند کر کے ایک طرف رکھ دی اور استفہامیہ نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگا۔

وہ بولی ''ہنس کا موڈ بے حد خراب ہے۔ وہ شاید آسانی سے قسمت کی جدائی کو برداشت نہیں کر پائے گا۔ ہمیں اُس کی مدد کرنا ہوگی۔''

''مگر کیسے؟'' اَشولال نے عینک کے اوپر سے گھورا۔

''آپ ہنس پر زیادہ توجہ دیا کریں۔''

''دیتا تو ہوں۔''

''اُسے پہلے سے زیادہ وقت دیا کریں۔ شام کو اپنے ساتھ بازار لے جایا کریں بالخصوص اُس وقت جب وہ قسمت کے ساتھ کھیلتا ہے۔ اِس طرح اُس کا ذہن بٹ جائے گا اور وہ اُسے زیادہ مِس نہیں کرے گا۔''

''میرا خیال ہے کہ اُسے تنہا ہی اِس کیفیت سے نبرد آزما ہونا چاہیے۔''

''نہیں۔'' شناں نے تشویش آمیز لہجے میں کہا ''میں اِس معاملے میں کوئی بھی رِسک لینے کو تیار نہیں ہوں۔''

''وہ کب جا رہے ہیں؟''

''پرسوں یا شاید اُس سے اگلے دِن چلے جائیں، میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔''

''یہ بھی اچھا ہی ہوا ورنہ بہت مشکل بن جاتی۔ میں مزار خان کے ہمراہ دریا پر جانے کا پروگرام ترتیب دیے بیٹھا ہوں۔'' اُس نے کہا۔

''خیر تو ہے؟''

''خیر ہی ہے۔'' وہ بولا '' کافی دِن ہوئے، پروفیسر وسیم سے رابطہ نہیں ہوا۔ بھلا بندہ، زندہ بھی ہے یا مر گیا ہے، خبر لینا چاہتا ہوں۔''

''فون پر رابطہ کر لیجئے۔''

''وہ کال اٹینڈ نہیں کرتا۔ ناراض ہے، منانا ضروری خیال کرتا ہوں۔'' ڈاکٹر اَشولال نے مسکرا کر کہا ''شناں! وہ بہت اچھا انسان ہے۔ بس مسلسل ٹھکرائے جانے کے باعث بہت ٹچی ہو گیا ہے۔ مجھ پر خفا ہے۔ مزار خان کو لے کر جاؤں گا تو وہ لحاظ کرتے ہوئے مان جائے گا۔ ورنہ اُس سے کوئی بعید

نہیں کہ مجھے پتن سے ہی واپس لوٹا دے۔"

وہ اپنی بیوی کو وہ سب کچھ نہ بتلا سکا جو اُس کے من میں تھا۔ پروفیسر نے مصباح کی بابت اُسے ٹرخا دیا تھا۔ وہ اپنا یقین اور پروفیسر کا بیان پَرکھنا چاہتا تھا۔ سموں کی طرح مصباح کو بھی واپس لانا چاہتا تھا۔

"آپ بہت عظیم انسان ہیں۔" شاں نے توصیفی نگاہوں سے دیکھا اور اپنا سر ڈاکٹر کے بازو پر ٹکا دیا۔

ڈاکٹر نے مسکرا کر تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور کتاب اٹھا کر کھول لی۔ شاں سمجھ گئی کہ اُس کا شوہر اِس موضوع پر مزید کچھ سننا نہیں چاہتا۔

......

وہ شب بھر سو نہیں سکا تھا۔ مصباح کو دریا میں پھینک دینے کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ بالکل شانت ہو جاتا جیسے سموں کے چلے جانے پر اُسے سکون میسر آیا تھا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ اُسے کسی پل قرار نہیں آیا تھا۔ جانے والی اُس کے چین کو پلو میں باندھ کر لے گئی تھی۔

وہ ٹہلتا رہا۔ آنکھیں ملتا رہا۔ شب گزر گئی مگر داستان تمام نہیں ہوئی۔ اُس نے اَن گنت مرتبہ چائے بنائی۔ پیتے ہوئے مصباح کی کمی کو شدّت سے محسوس کیا۔ بے اختیار جنت کے عقبی گوشے میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ نظریں اُسی سمت میں گڑی ہوئی تھیں جس سمت میں مصباح کو بہتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ سندھو سئیں نے اَن گنت بستیاں اپنے معدے میں ہضم کر ڈالی تھیں۔ وہ دھان پان سی لڑکی سندھو کی غضبناک لہروں کے آگے کیا وجود رکھتی تھی۔

اُسے بیلے والے پتن پر نقل و حرکت کا شبہ ہوا۔ بھاگ کر سٹور میں گیا اور اپنی طاقت ور دوربین اُٹھا لایا۔ دیکھنے پر پتہ چلا کہ شیرا اگرمانی بڑے مضطرب انداز میں اُس کی سمت ہاتھ لہراتے ہوئے بھاگا آ رہا تھا۔ وہ بار بار پیچھے مُڑ کر بھی دیکھ رہا تھا۔ پروفیسر کو شک گزرا کہ اُس کے پیچھے پولیس لگی ہے یا کوئی مخالف گروہ اُس کی جان کے درپَے ہے۔ اُس نے جلدی سے فون پر اُس کا نمبر ملایا۔ بیل پاس ہوئی

مگر کسی نے آن نہیں کیا۔ اُس نے ایک مرتبہ پھر دوربین آنکھوں سے لگائی۔ وہ کنارے پر کھڑا ہو کر ہاتھ ہلا رہا تھا اور چیخ رہا تھا۔ اُس کی آواز سنائی دیتی تھی مگر الفاظ کی سمجھ نہیں آتی تھی۔ پروفیسر نے کوئی وقت ضائع کئے بغیر بوٹ پتن کی طرف بھیج دی۔ ریموٹ کنٹرولر ہاتھ میں لے کر شیرے کو دیکھنے لگا۔ بوٹ کو آتا دیکھ کر وہ الٹے قدموں جنگل کی طرف بھاگا۔ نظروں سے چند لمحوں کیلئے اوجھل ہوا۔ لوٹا تو اُس کے کندھوں پر کوئی لدا ہوا تھا۔ پروفیسر کو اَچنبھا ہوا۔ وہ کسے اُٹھائے بھاگا آ رہا تھا؟ اچانک آنکھوں کے سامنے برق کوند گئی۔ اُس نے اپنے لباس کو دیکھ کر پہچان لیا تھا کہ شیرے گرمانی کے کندھے پر مصباح لدی ہوئی تھی۔

شیرے گرمانی نے بوٹ کے پہنچنے پر اُسے بوٹ میں ڈھیر کر دیا اور ہاتھ لہراتا ہوا بیلے کی طرف بگٹٹ بھاگ کھڑا ہوا۔ اُس کا بھاگنے کا انداز خاصا مضحکانہ تھا۔ چند ہی لمحوں میں وہ درختوں کی اوٹ میں چلا گیا۔ پروفیسر نے بوٹ کو جنت کی طرف موڑ دیا۔ پانچ سات منٹوں کے بعد وہ اُس کی نظروں کے سامنے بیڈ پر پڑی ہوئی لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔ پروفیسر نے فوری طور پر اُسے بخوبی ٹٹول کر اندازہ کر لیا کہ اُس کے جسم پر کوئی گھاؤ نہیں تھا۔ وہ دہشت اور خوف کی وجہ سے بے ہوش تھی۔ اُس نے اُس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ جھنجوڑا۔ وہ ہوش میں آتے ہی چلانے لگی۔ پروفیسر نے بھانپ لیا کہ وہ ڈاکوؤں کے خوف سے بے ہوش ہوئی تھی تبھی ہوش میں آتے ہی ڈر کے مارے چیخنے چلانے لگی تھی۔ جب اُس نے چلانا بند کیا، اردگرد دیکھا تو فرطِ استعجاب سے گنگ ہوگئی۔ پروفیسر پر نظر پڑی تو آنکھیں پھیل سی گئیں۔ ہونٹ یکبارگی سے کانپے ''سس......سر! وہ......وہ ڈاکو......ظالم......''

پروفیسر نے بڑی آہستگی سے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ''فکر نہ کرو۔ وہ تمہارا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتے۔''

دل میں بولا ''اُن کا سردار تمہیں یہاں چھوڑ گیا ہے، پھر کس کی مجال ہے کہ وہ تمہارے تعاقب میں یہاں تک پہنچے۔''

پروفیسر نے اُسے پانی کا گلاس تھمایا۔ وہ ایک ہی سانس میں حلق سے اُتار گئی۔ پروفیسر نے اُس

کے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر اندازہ کیا کہ کہیں اُس کا پیٹ پانی سے بھرا ہوُا نہ ہو۔ وہ تڑپ کر اُٹھ بیٹھی۔ اُس کا ردِعمل پروفیسر کو بڑا عجیب اور غیر فطری لگا۔ بولا ''کیا بات ہے؟ کس بات کا ڈر ہے تمہیں؟''

وہ کچھ نہیں بولی بلکہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رونے کے درمیان خود کو بدقسمت قرار دیتے ہوئے قسمت بنانے والے کو کوسنے لگی۔ ایسے ہی وقت میں پروفیسر کے فون پر شیرا گرمانی مخاطب ہوگیا ''پروفیسر صاحب! میرے پاس مہلت بہت کم ہے، میرے ساتھی میرے دُشمن بن گئے ہیں۔ جتنا جلد ہو، اِسے اس کے گھر پہنچا دیجئے۔''

اُس نے پوچھا ''یہ پھر تم لوگوں کے ہاتھ کیسے لگ گئی؟''

''ایک واردات سے واپسی پر میرے ساتھیوں کی نظروں میں آ گئی۔ یہ ساگر کنارے جال کے بڑے رُکھ کے ساتھ اُٹکی ہوئی تھی۔ وہ اُٹھا کر یہاں لے آئے۔ میں نے اُنہیں اُن کے ارادے سے باز رکھنے کی بہتیری کوشش کی مگر وہ بغاوت پر اُتر آئے۔ اس لئے میں اِسے چوری اُٹھا کر آپ کے پاس چھوڑ آیا ہوں۔ اَب اُن کے تیور مجھے ٹھیک نہیں لگ رہے، سن رہے ہیں ناں آپ؟'' شیرے گرمانی کی آواز اُس کے اضطراب اور خوف کی عکاس بنی ہوئی تھی۔

پروفیسر نے اُسے یقین دلایا کہ مصباح بہ خیر و عافیت اپنے گھر پہنچ جائے گی۔ رابطہ منقطع ہونے پر اُس نے مصباح کو دیکھا جو فرطِ دہشت سے پیلی پڑ گئی تھی۔ پروفیسر اسٹول کھینچ کر اُس کے پاس بیٹھ گیا۔ اُس کا ہاتھ تھام کر سہلانے لگا۔ بازو پر ہاتھ پھیرتے ہوئے خوف کی کیفیت سے باہر کھینچنے لگا۔ وہ عجیب سی نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ بولی ''میرا قصور کیا ہے سر!''

پروفیسر نے الجھی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ پوچھا ''کیا مطلب؟''

اُس نے نقاہت سے آنکھیں بند کر لیں۔ دو ننھی ننھی لکیریں اُس کی آنکھوں کے گوشوں سے برآمد ہوگئیں۔ ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی ''مجھے دریا میں دھکا دے کر آپ نے بڑی بہادری کا مظاہرہ کیا تھا ناں! ایک بے بس لڑکی کو اپنی تشدد پسندی پر قربان کر کے بڑے مطمئن ہوگئے ہوں گے۔ کیا اِس سے بہتر یہ نہیں تھا کہ مجھے گلا گھونٹ کر مار دیتے، پھر پانی میں بہا دیتے۔ کون پوچھنے والا تھا؟ کس کا ڈر تھا؟''

پروفیسر کے پاس کوئی جواز موجود نہیں تھا۔ خاموشی سے اپنا کام کرنے لگا۔ وہ بول رہی تھی ''دُنیا والوں نے چیر پھاڑ کر جنت میں بھیج دیا۔ جنت والے نے دھکا دے کر پھر درندوں کے حوالے کر دیا۔ آہ! میں پیدا ہی کیوں ہوئی تھی۔ میں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے جو ہر کوئی مجھ پر چاقو تانے کھڑا ہے؟''

وہ نڈھال سی ہوگئی۔ ہونٹ بھینچ کر سسکنے لگی۔ پروفیسر نے پوچھا ''تم کب بے ہوش ہوئیں؟''

وہ خالی خالی نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔ آہستہ سے بولی ''آپ نے دھکا دیا، مجھے ہوش تھا۔ پانی کے نیچے گئی، ہوش نہیں تھا۔ پھر جب آنکھ کھلی تو وہی بھیڑیے دکھائی دیے۔ میرے حلق سے ایک چیخ نکلی اور پھر مجھے کچھ یاد نہیں۔ ایک مرتبہ پھر آنکھ کھلی، میں کسی آدمی کے کندھوں پر سوار تھی اور وہ بھاگ رہا تھا۔ وہ ٹھوکر کھا کر گرا، میرے سر میں کوئی پتھر یا اینٹ لگی، میں بے ہوش ہوگئی۔ پھر ہوش آیا تو آپ دکھائی دیے۔''

پروفیسر نے بے ساختگی سے اُس کا سر ٹٹول ٹٹول کر دیکھا۔ ماتھے سے کچھ اوپر بڑا سا گومڑ محسوس ہوا۔ بالوں کو ہٹا کر دیکھا۔ زخم نہیں تھا۔ پیار سے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ بولنے لگا ''تمہیں پانی میں پھینکنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کا ارتکاب کر بیٹھا ہوں۔ نہ جانے کیوں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے تمہارے وجود کے بغیر جنت بے معانی ہو کر رہ گئی ہے۔ شاید میں تمہارے وجود میں اپنی مریم کو دیکھنے لگا تھا۔ شاید تمہاری صورت میں مجھے اپنی رُباب کی صورت دکھائی دینے لگی تھی۔ بہ ہر حال! تجھے قسمت پھر میرے پاس کھینچ لائی ہے۔ اَب تمہیں کوئی دُکھ نہیں دُوں گا۔ مجھے معاف کر دو۔''

اُسے یقین نہیں آیا۔ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ پروفیسر کا ہاتھ پکڑ کر دیوانہ وار چومنے لگی۔ آنسوؤں کی نمی سے تر کرنے لگی۔ پروفیسر نے اُس کا سر اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ بولا ''میں ٹوٹ پھوٹ گیا ہوں۔ میں وہ نہیں رہا، جو تھا اور اَب جو کچھ ہوں، ایسا زندگی میں کبھی بھی نہیں رہا۔ میں نے دُنیا کو ترک کیا، تمہیں دُنیا نے ٹھکرا دیا، ہم دونوں ایک دوسرے کے دُکھ کو سمجھ سکتے ہیں۔ ایک دوسرے کو اَپنا سکتے ہیں۔ کیا تم میری محبت کو قبول کرنے کا حوصلہ رکھتی ہو؟''

وہ گم صم بیٹھی اُسے ایک ٹک دیکھے جا رہی تھی۔ وہ کرب اور مسلسل جنگ کی اس کیفیت میں تھی کہ کوئی بھی صحت مند فیصلہ نہیں کر سکتی تھی۔ سوچ میں پڑ گئی۔ انکار کر دے؟ پروفیسر بُرا منائے گا اور پھر اُسے دریا میں پھینک دے گا۔ اقرار کر لے؟...... اپنے دیے ہوئے قول پر قائم رہتے ہوئے کیا وہ دُنیا کو چھوڑ دے گی اور جیتے جی جنت کی حور بن کر سندھوسئیں کا حصہ بن جائے گی۔ اُس کے تذبذب کو دیکھ کر مایوسی کا سایہ پروفیسر کے چہرے پر لہرایا اور وہ اُسے چھوڑ کر چند قدم دور جا کھڑا ہوا۔ تھکے تھکے لہجے میں بولا ''شاید میں اپنی سطح سے نیچے گر چکا ہوں۔ مجھے اپنی بے بسی اور تھکاوٹ کا اظہار تمہارے سامنے نہیں کرنا چاہیے تھا۔ تم دُنیا دار ہو۔ تمہارے دِل میں انہی لوگوں کی محبت کا بیج نمو پا رہا ہے جن لوگوں نے تمہیں اِس حال تک پہنچایا ہے۔ ویری ساری مصباح! شاید میں نارمل نہیں رہا۔''

اُسے پروفیسر کی مایوسی کو دیکھ کر ملال ہوا۔ اُٹھ کر قریب آ گئی۔ بازو سے چمٹ کر بولی ''ایسی بات نہیں ہے سر! آپ بہت عظیم انسان ہیں۔''

پروفیسر کے دِل پر بوجھ سوا ہو گیا تو وہ اُس کی کمر میں بازو حمائل کئے بیڈ روم سے نکل کر عرشے پر آ گیا۔ اُسے چھوڑ کر ہاتھ کمر پر باندھ کر ٹہلنے لگا۔ پیتل کا سورج مشرقی سمت میں کنی نکالے کھڑا تھا۔ ریلنگ کے ساتھ آ کر کھڑا ہو گیا اور جھک کر جنریٹر کے پَروں کی مسلسل حرکت کو دیکھنے لگا۔ اچانک مُڑا اور قریب کھڑی مصباح کو شانوں سے پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے بولا ''کیا تم خود کو بالکل فٹ محسوس کرتی ہو؟''

اُس کا رنگ اُڑ گیا۔ چہرہ فرطِ خوف سے پیلا پڑ گیا۔ جواب دینے کے بجائے پوری قوت سے پروفیسر کے ہاتھوں کو جھٹک کر اُس کے پیروں میں بیٹھ گئی۔ مضبوطی سے پیر تھام لئے اور سسکنے لگی ''میں بالکل ٹھیک نہیں ہوں مجھے دریا میں مت پھینکیں۔ میں مزید مصیبتیں جھیلنے کے قابل نہیں ہوں سر! مجھے مت دھکا دیجئے...... آپ جو کہیں گے، میں مان لوں گی۔ میں آپ سے محبت کرتی ہوں، آپ کی جنت میں اپنی عمر پوری کر دوں گی مگر خدارا! مجھے دریا میں نہ پھینکیں۔''

وہ گڑگڑا رہی تھی۔ زندگی کی بھیک مانگتے ہوئے اُس کے کھلے کشکول میں محبت کی شراب انڈیل رہی تھی۔ وہ آہستہ سے نیچے بیٹھ گیا۔ اُس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنی آنکھوں سے لگاتے ہوئے بولا

’’تم شاید موت کے خوف سے محبت کا اظہار کر رہی ہو؟‘‘

وہ جلدی سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی ’’نہیں۔ مجھے موت کا کوئی خوف نہیں۔ گزشتہ کئی دِنوں سے زندگی اور موت کے کھیل کا حصہ بنی ہوئی اِدھر اُدھر لڑھک رہی ہوں۔ کیا زندگی، کیا موت؟ میں آپ سے محبت کرتی ہوں، میں آپ کی ہوں...... جو چاہے، میرے ساتھ کیجئے مگر مجھے درندوں کے حوالے نہ کیجئے۔ وہ بہت ظالم ہیں۔‘‘

پروفیسر کی آنکھوں میں وحشت بھر گئی۔ مٹھیاں بھنچ گئیں۔ دِل کے اضطراب نے پہلو بدل کر نئی صورت اختیار کر لی تھی۔ پہلی مرتبہ اُسے اپنی شکست پر تاؤ آنے لگا تھا۔ وہ، عورت کو وجہِ فساد قرار دے کر زلفوں کے پیچ وخم سے ہمیشہ کیلئے نکل آنے والا، اُسی وجود کے حصار میں پور پور محصور ہو چکا تھا۔ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا ٹیبل تک آیا۔ ٹیبل پر دونوں ہاتھ رکھے کافی دیر تک سورج بینی کرتا رہا پھر مصباح کو بیڈ روم میں بھیج کر کچن کی طرف بڑھ گیا۔ اُسے اپنے اور مصباح کیلئے ناشتہ تیار کرنا تھا۔

اُس نے الماری کی طرف کچھ نکالنے کیلئے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ بیلے کی طرف سے فائر کی آواز سنائی دی۔ وہ جلدی سے باہر آ گیا۔ سوائے درختوں کی ہریالی کے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر اچانک جیسے کئی گنوں کی نالیاں اُبل پڑی ہوں۔ چند ہی لمحوں میں بیلا شدید نوعیت کی فائرنگ کی لپیٹ میں آ گیا۔ مختلف قسم کی گنیں چل رہی تھیں۔ پروفیسر کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ شیرے گرمانے کے گروپ میں پھوٹ پڑ چکی ہے اور خون کا بازار گرم ہو گیا ہے۔ اُسے اپنی پشت پر مصباح کے لمس کا احساس ہوا۔ گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ ڈر کے مارے کمرے سے نکل کر اُس سے چمٹی کھڑی تھی۔ پروفیسر نے کہا ’’گھبراؤ مت، ڈاکوؤں کا گروہ آپس میں لڑ رہا ہے۔ کچھ مر جائیں گے۔ کچھ بچ جائیں گے۔ ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔‘‘

’’وہ یہاں آ گئے تو کیا ہوگا؟‘‘

پروفیسر نے عام سے لہجے میں کہا ’’تو یہاں بھی گولیاں چلنے لگیں گی اور خون خرابہ شروع ہو جائے گا، پہلے معرکے میں بچ جانے والے دوسرے حملے میں مارے جائیں گے۔‘‘

وہ مزید ڈر گئی۔ پروفیسر نے اُسے بیڈ روم میں دھکیلا اور سٹور میں چلا گیا۔ اگر شیرے گرمانی کا

باغی گروپ فتح یاب ہو گیا تو وہ لازمی طور پر مصباح کی تلاش میں جنت کا رُخ کرے گا۔ پروفیسر نے ان کے استقبال کیلئے خود کو چند منٹوں میں ہی پوری طرح تیار کرلیا۔ دونوں گنیں اور اچھی خاصی مقدار میں گولیاں ستون والے بینکر میں پہنچا دیں۔ پستول ہاتھ میں پکڑ لیا۔ جونہی فائرنگ رُکی، وہ مصباح کو کھینچتا ہوُا ستون پر چڑھ گیا۔ اُسے بینکر میں کھڑا کرنے کے بعد خود بھی سمٹ کر بینکر میں کھڑا ہو گیا۔ جگہ تنگ تھی۔ دونوں ایک دوسرے میں کھب سے گئے تھے۔ پروفیسر نے کہا ''اگر وہ اِس طرف آئے تو اُن میں سے ایک بھی زندہ واپس نہیں جائے گا۔''

اُس نے زیرلب کہا ''اللہ کرے!''

پروفیسر کو بخوبی اندازہ تھا کہ اُس کا مقابلہ عام لوگوں سے نہیں، نہائت تربیت یافتہ اور مار دھاڑ کے شوقین لوگوں سے پڑنے والا ہے۔ اچانک اُس کے اعصاب تن گئے۔ شمالی جانب سے دریا کے دونوں کناروں کے ساتھ ساتھ آتی ہوئی دو کشتیاں دیکھ کر اُس کے لبوں پر سفاک مسکراہٹ تیر گئی۔ باغی گروپ بجائے خشکی کے راستے حملہ کرنے کے، کشتیوں کے ذریعے اپنی طاقت کے زعم پر آن دھمکا تھا۔ اُس نے گن اُٹھائی۔ بیلٹ چڑھایا۔ دوسری گن میں میگزین فٹ کیا۔ پستول پہلے ہی لوڈ ڈ تھا۔ مطمئن ہو کر کشتیوں کے رینج میں آنے کا انتظار کرنے لگا۔ مصباح کو اُس نے مزید نیچے کر دیا تھا۔ ایسے میں اچانک اُس کی نگاہ بیلے کی طرف اُٹھی۔ جنگل سے نکل کر چند آدمی دیوانہ وار دریا کے کنارے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اُنہوں نے بندوقیں اُٹھا رکھی تھیں۔ پروفیسر اُن پر گولی چلانے ہی لگا تھا کہ اچانک خیال آ گیا، کہیں یہ شیرا گرمانی ہی نہ ہو جو اپنے باقی ماندہ بندوں کے ہمراہ پناہ ڈھونڈتا اِدھر آن نکلا ہو۔ اُسے افسوس ہوُا کہ اُس نے بینکر میں آتے ہوئے موبائل فون اور دوربین کمرے میں ہی رکھ چھوڑی تھی۔

مصباح ایک سوراخ سے نظریں ٹکائے پروفیسر کی مخالف سمت میں دیکھ رہی تھی۔ اچانک پلٹ کر بول پڑی ''سر! اُدھر پتن پر کوئی ہے جو ہاتھ لہرا رہا ہے۔''

پروفیسر نے فوراً پہلو بدلا۔ دونوں ایک ہی وقت میں رُخ بدل کر آمنے سامنے ہوئے تھے۔ غلطی کا احساس ہوُا مگر یہ وقت اِن نزاکتوں کو ملحوظ رکھنے کا نہیں تھا۔ براہِ راست سینے سے لگی مصباح کے

ہونٹوں کو مسکرا کر چوما اور اُس کا سرا ایک جانب ہٹا کر سوراخ سے جھانکا۔ دو آدمی پتن پر کھڑے دکھائی دیے۔ وہ ہاتھوں میں پکڑے ہوئے صافوں کو ہوا میں لہرا کر متوجہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دوری کے باعث پروفیسر بہ وجود سعی اُن کو پہچان نہیں پایا۔

خاموشی طوفان کا پیش خیمہ تھی۔ پروفیسر نے اُنہیں بے ضرر قرار دے کر اپنی توجہ کشتیوں اور کنارے پر کھڑے گن برداروں کی طرف مبذول کر لی۔ وہ اُنہیں اُس وقت تک چھیڑنا نہیں چاہتا تھا جب تک وہ دریا میں نہیں اُترتے تھے۔ کشتیوں میں سوار ہو کر آنے والوں سے پہلے نبٹنا ضروری تھا کیونکہ اُن کی پوزیشن گن برداروں سے کہیں زیادہ مضبوط دکھائی دیتی تھی۔

پھر دریا کے مغربی کنارے والی کشتی گن کی رینج میں آ گئی۔ اُس میں بیٹھے ہوئے افراد بھی دکھائی دینے لگے۔ اُس نے گن کی نال کا رُخ اُس سمت میں کیا۔ نشانہ باندھ کر ٹریگر پر انگلی کا دباؤ بڑھا دیا۔ جو انگلیاں تمام عمر لفظوں سے کھیلتی آئی تھیں، وہ آگ برسانے میں بھی خاصی طاق ہو چکی تھیں۔

...❁...

دونوں کار سے اُترے۔ دیکھا، کیچڑ کی وجہ سے کار آگے نہیں جا سکتی تھی۔ پیدل ہی پتن کی طرف چل پڑے۔ ڈاکٹر اَشو لال بتا رہا تھا ”مجھے شاید آج یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ ڈاکٹر عثمان اپنی فیملی کے ساتھ یہاں سے جا رہا ہے۔ پہلے اُس کا ارادہ کل یا پرسوں جانے کا تھا، جب میں ہسپتال سے نکل رہا تھا تو وہ مجھے گیٹ پر ملا، کہہ رہا تھا کہ سامان کیلئے ٹرک کا بندوبست کرنے جا رہا ہوں، وہ شاید اَب تَب میں جانے والا ہوگا۔“

مزار خان نے سرائیکی زبان میں پوچھا ”اسے الوداع کہنے کیلئے وہاں رُکنا چاہتے تھے تو رُک جاتے، یہاں کل یا پرسوں آ جاتے۔“

”کسی کو الوداع کہنا میرے لئے دُنیا کا مشکل ترین کام ہے مزار خان! بات کچھ اَور ہے۔ ہنس دُنیا کا مشکل کام کرنے جا رہا ہے۔ وہ اپنی دوست کے جانے پر بہت پریشان ہوگا۔ اُس کی ماں اُس سے بھی زیادہ پریشان ہوگی۔“

''میرا خیال ہے پریشانی فقط تمہارے حصے میں آئی ہے۔''

ڈاکٹر کے لبوں پر بے تاثر سی مسکراہٹ تیر گئی۔

دونوں آگے پیچھے چلتے ، باتیں کرتے پتن پر پہنچے۔ ڈاکٹر تھک کر بیٹھ گیا۔ مزار خان نے طنز کیا ''بڑھاپا عود کر آیا مُرشد؟''

''یہ بدبخت کہاں جان چھوڑتا ہے، بن بلائے آجاتا ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ مزار خان سے موبائل فون مانگا۔ پروفیسر کے نمبر کو بار بار ٹرائی کرنے لگا۔ وہ کال اٹینڈ نہیں کر رہا تھا۔ جنت کی طرف دیکھا۔ دو آدمی عرشے پر دکھائی دیے۔ ایک یقیناً پروفیسر وسیم تھا، دوسرا شناخت میں نہیں آ رہا تھا۔ دونوں کبھی اندر جاتے، کبھی عرشے پر نکل آتے۔ اچانک کچھ اُٹھائے ستون کی طرف بھاگتے ہوئے گئے تو وہ دونوں چونک کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ مزار خان نے کہا ''کوئی گڑبڑ لگتی ہے مُرشد!''

''ہوں......'' ڈاکٹر نے کہا۔ ایسے میں اُس کے اپنے فون کا بزر بجنے لگا۔ سکرین پر شناں کا نام پڑھا اور کال ریسیو کی ''کیا بات ہے شناں؟''

وہ گھبرائی ہوئی تھی ''وہ قسمت ...... سبھی جا رہے ہیں۔ ہنس ٹرک سے چمٹا کھڑا ہے۔ پلیز! لوٹ آئیں اور......''

وہ جلدی سے بولا ''میں یہاں سے واپس آنا بھی چاہوں تو ڈیڑھ دو گھنٹے سے پہلے نہیں پہنچ سکتا۔ اپنی مامتا کو امتحان میں ڈالو۔ دیکھوں، کتنا دَم ہے اِس جذبے میں۔''

شناں بولی ''میں دروازے میں کھڑی ہوں، قسمت اور ہنس دونوں پلاٹ کی طرف جا رہے ہیں، بغیر پانی والے دریا کے ساتھ کھیلنا چاہتے ہیں۔ دونوں رو رہے ہیں۔ آپ کچھ کیجئے!''

''تم اُن کے پاس چلی جاؤ۔ دونوں کو سنبھال لو۔ او کے!''

''جی......''

رابطہ منقطع ہو گیا۔ ڈاکٹر اَشولال نے مزار خان کی طرف دیکھا، آہ بھر کر کہا ''وہی مسئلہ ہے جو تمہارے ساتھ شیئر کر رہا تھا۔''

مزار خان نے اِس مسئلے کو سطحی لیا تھا۔ بولا ''بچے ایک دوسرے میں خاصے انوالو ہو جاتے ہیں، جدا

ہونے پر بہت جلد بھول بھی جاتے ہیں۔زیادہ فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے مُرشد!''

ڈاکٹر کو اُس سے اتفاق نہیں تھا کیونکہ وہ ہنس اور قسمت کے رویے کو بہ خوبی دیکھ چکا تھا۔

دونوں پھر جنت کی طرف متوجہ ہوئے۔پروفیسر اور اُس کا ساتھی دونوں غائب تھے۔بہ غور دیکھنے پر بھی نظر نہیں آئے تو ڈاکٹر نے اپنا صافہ گلے سے نکالا اور زور زور سے ہلانا شروع کر دیا۔اُس کی تقلید میں مزار خان بھی ایسا ہی کرنے لگا مگر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہو رہا تھا۔

''وہ دیکھو مُرشد! وہ کشتی جنت کی طرف آ رہی ہے۔'' مزار خان نے چیختی ہوئی آواز میں کہا۔

ڈاکٹر نے دیکھا۔مسکرا کر کہا'' ایک کشتی اِدھر بھی دکھائی دے رہی ہے۔شاید پروفیسر نے کشتیوں کو اپنی جنت کیلئے خطرہ قرار دیا ہے اِس لئے مورچہ زن ہو گیا ہے۔''

مزار خان آنکھوں پر ہاتھ کا چھجا بنا کر بڑی احتیاط سے کچھ دیکھ رہا تھا۔بولا'' مجھے بھی خطرے کی بو آ رہی ہے مُرشد!''

اچانک ٹھائیں کی زوردار آواز نے ماحول میں دہشت طاری کر دی۔پھر فائرنگ کا نہ رُکنے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔مزار خان نے ڈاکٹر کا ہاتھ پکڑا اور جھک کر سرکنڈوں کی طرف دوڑ لگا دی۔کیچڑ سے لتھڑے گڑھے میں دُبک کر مزار خان نے پھولی ہوئی سانسوں میں کہا''سئیں میڈا! گولی اندھی ہوتی ہے، دُشمن سجن کی پہچان نہیں رکھتی۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر یہ ہو کیا رہا ہے؟'' ڈاکٹر اَشولال نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔

مزار خان کیا کہہ سکتا تھا، خاموش رہا۔ڈاکٹر نے کلید پر ہاتھ رکھا۔فون کیا۔شناں نے اٹینڈ کیا۔بولا ''شناں! دیکھو تو بھلا دونوں کیا کر رہے ہیں؟''

وہ بولی''میں اُن کے پاس ہی کھڑی ہوں۔دونوں اپنے خشک دریا کے پاس بیٹھے گھٹنوں میں سر دے کر رو رہے ہیں۔میں اُنہیں چپ کرانے کی کوشش کر رہی ہوں۔''

''کشتی کو غور سے دیکھو۔اُس میں کیا کچھ پڑا ہوُا ہے؟'' ڈاکٹر کے لہجے میں اضطراب نمایاں تھا۔

''کچھ بھی نہیں۔وہی پوڈوا اور فینی بیٹھے ہوئے ہیں۔''

''اردگرد کچھ پڑا ہوُا ہے؟''

’’ہاں……مگر آپ ایسے کیوں پوچھ رہے ہیں؟‘‘

’’جو میں پوچھتا ہوں، وہ بتاؤ پلیز!‘‘ اَشولال کا لہجہ تیز ہو گیا۔

’’قسمت اپنے سارے کھلونے اُٹھا لائی ہے۔ باری باری نکال کر چومتی جاتی ہے، روتی جاتی ہے۔‘‘

’’تم یہیں رہو۔فون اپنے ہاتھ میں رکھو۔ میں پھر رابطہ کرتا ہوں۔‘‘ ڈاکٹر نے زور سے کہا کیونکہ فائرنگ میں شدّت آ گئی تھی اور کانوں پڑی آواز بھی بدقّت سنائی دیتی تھی۔

مزار خان سرکنڈوں کو ہاتھ سے ہٹا کر ایک روزن بنائے جنت کو دیکھ رہا تھا۔ڈاکٹر اَشولال نے بھی اپنا چہرہ اُسی روزن میں گھسا دیا۔ جنت پر کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔روزن میں سے کوئی بھی کشتی دکھائی نہیں دے رہی تھی بلکہ جنت کے علاوہ کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔کون حملہ آور تھا،کون اپنے دفاع میں بارود پھونک رہا تھا، پتہ نہیں چل رہا تھا۔

…❀…

پروفیسر کی چلائی ہوئی گولی نے کشتی کی پیش قدمی کو روک دیا۔ پروفیسر نے دیکھا کہ کشتی پر بیٹھے افراد میں ہڑبونگ مچ گئی تھی۔اچانک اُس کے فائر کا جواب فضا میں گونج اُٹھا۔فائر مغربی کنارے سے ہوا تھا۔اُس نے کھلے پتن کی طرف دیکھا۔حملہ آور زمین پر لیٹ چکے تھے اور گنوں کا رُخ جنت کی طرف تھا۔ وہ تعداد میں پانچ تھے۔ پروفیسر نے ایک کا نشانہ لیا، گولی چلی،نشانہ خطا گیا۔ دوسری گولی نے اپنے شکار کو جا لیا۔ ہٹ ہونے والے کے ساتھیوں نے اُس کی ستون میں موجودگی کو بھانپ لیا تھا۔اُنہوں نے بے دریغ فائرنگ شروع کر دی۔ گولیاں کنکریٹ کے ستون پر زوردار آواز کے ساتھ ٹکراتیں اور پانی میں گر جاتیں۔ پروفیسر خود کو بچاتے ہوئے جوابی فائر داغتا رہا۔

اُس نے محسوس کر لیا تھا کہ دور ٹھہری ہوئی کشتیوں سے اُس پر ایک بھی فائر نہیں کیا گیا تھا اور نہ ہی کشتیوں میں دُبکے ہوئے افراد نے چھلانگیں لگانے کی کوشش کی تھی۔

نصف گھنٹے کی دوطرفہ فائرنگ کے نتیجے میں تین حملہ آور موت کا شکار ہو چکے تھے یا اِس حد تک

زخمی ہوگئے تھے کہ اُن میں گن اُٹھانے اور فائر کرنے کی سکت باقی نہیں تھی۔ باقی دو کے پاس شاید گولیاں ختم ہوگئی تھیں، وہ اچانک زگ زیگ کے انداز میں بھاگتے ہوئے جنگل میں گھس گئے۔ پروفیسر نے بہت جلد بازی کا مظاہرہ کیا تھا مگر اُنہیں ہٹ کرنے میں نا کام رہا۔

خاموشی طاری ہوگئی۔ بینکر میں بارود کی بُو پھیل چکی تھی۔ دونوں ناک پر ہاتھ رکھے چپ کھڑے تھے۔ مصباح نے اُس کے کندھے پر اپنا سر ٹکا دیا۔ بولی ''مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

پروفیسر نے کچھ کہنے کیلئے منہ کھولا تو کھانسی آ گئی۔ ہاتھ سے بارود کا دھواں اُڑاتے ہوئے بدقّت تمام بولا ''یہ خاموشی موت کی نہیں، زندگی کی ہے۔ ڈرو مت، حوصلہ رکھو۔ اَبھی ہمارے کچھ دُشمن موجود ہیں۔''

اُس نے جھک کر سوراخ میں سے کشتی کو دیکھا۔ اُس پر سفید رَنگ کا کپڑا لہرا رہا تھا۔ دوسری کشتی پر بھی کپڑا لہراتا نظر آیا۔ پروفیسر نے بڑبڑا کر کہا ''کہیں بے غیرت کوئی چال تو نہیں چل رہے ہمارے ساتھ؟''

کچھ توقف کے بعد بولا ''تم مشرقی پتن کی طرف دیکھو۔ کیا وہ دونوں کھڑے ہیں؟''

مصباح نے پروفیسر کے بدن سے رگڑ کھاتے ہوئے پہلو بدلا۔ سوراخ میں جھانک کر دیکھا۔ بولی ''یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔''

''وہ فائرنگ کے ڈر سے چھپ گئے ہوں گے۔'' پروفیسر نے خیال آرائی کی۔ پھر کشتیوں کی طرف متوجہ ہوگیا۔ تجرباتی طور پر دو تین فائر کئے۔ اُس نے کشتی کا نشانہ نہیں لیا تھا۔ ردِعمل ظاہر ہوا۔ کشتی میں موجود تمام لوگ ہاتھ اوپر اُٹھائے کھڑے ہوگئے اور چیخ چیخ کر کچھ کہنے لگے۔ پروفیسر کو یقین ہوگیا کہ وہ نہتے ہیں اور لڑنے کیلئے نہیں آئے۔ وہ بڑبڑایا ''یہ غالباً ڈاکوؤں کے ساتھی نہیں ہیں۔''

وہ کہنیوں کے بل اوپر اُٹھا۔ مصباح پلٹ کر چمٹ گئی۔ چیختے ہوئے بولی ''آپ باہر نہ جائیں، مجھے ڈر لگتا ہے۔''

وہ آدھا بینکر کے باہر تھا۔ آدھا مصباح کی گرفت میں تھا۔ چھڑانا چاہتا تھا مگر اچانک ذہن باغی

ہو گیا۔ اُس کے لبوں پر بڑی آسودہ سی مسکراہٹ تیر گئی۔ بولا'' کاش! تم ایسے ہی مجھے ہمیشہ تھامے رکھو، میں آدھا زندہ رہوں، آدھا ساکت رہوں، زندگی کا مزہ آ جائے۔''

اُس نے جلدی سے اُسے چھوڑ دیا۔ وہ ہنس کر بینکر سے باہر آ گیا۔ پتن پر پڑے ہوؤں کو بہ غور دیکھا۔ کوئی جنبش نہ پا کر کشتی کی طرف رُخ کر کے ہاتھ کے اشارے سے قریب بلانے لگا۔ کچھ دیر کے بعد کشتی چل پڑی۔ اُس کی رفتار خاصی سست تھی۔ مُہانوں نے چپو پانی میں کھڑے رُخ روک رکھے تھے۔ ایسا کرنے سے پانی کے بہاؤ سے بھی کم رفتار میں کشتی بہا کرتی ہے۔

کشتی قریب آئی تو پروفیسر نے ہاتھ کے اشارے سے رُکنے کا حکم دیا۔ مہانوں نے کشتی کو کنارے لگا دیا۔ دوسری کشتی اپنی جگہ پر رُکی کھڑی تھی۔ پروفیسر نے چیخ کر کہا'' اے! تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو؟''

کسی نے تیز آواز میں جواب دیا'' ہم ساگر فاؤنڈیشن والے ہیں، ایک لاش کو ڈھونڈنے نکلے ہیں۔ یہاں فائرنگ کیوں ہو رہی ہے؟''

پروفیسر نے اُسے زیرِ لب گالی دی اور کہا'' دوسری کشتی میں کون ہے؟''

''وہ بھی ہمارے ساتھی ہیں۔'' جواب آیا۔

پروفیسر کی تسلی ہو گئی۔ چیخ کر بولا'' کنارے کنارے کشتی کھیتے ہوئے یہاں سے دَفع ہو جاؤ ورنہ مارے جاؤ گے۔ اپنے ساتھیوں کو بھی لنگر کھولنے کا اشارہ کر دو۔ وقت ضائع نہ کرو...... ہری اَپ......''

''تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو؟'' ایک اور تیز آواز سنائی دی۔

''میں تمہارا باپ ہوں، تم سب کا! بکواس نہ کرو اور جتنی جلدی ہو، یہاں سے بھاگ جاؤ۔'' پروفیسر کا لہجہ غیض سے معمور ہو گیا اور اُس نے بینکر میں منہ اُٹھائے کھڑی مصباح کا ہاتھ تھاما اور اُسے باہر کھینچ لیا۔

پروفیسر نے اُسے باہر کھڑا کیا۔ اپنا اسلحہ سمیٹا۔ کچھ خود تھاما، کچھ مصباح کو تھمایا اور سٹور کی طرف بڑھ گیا۔ مصباح کو کچن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا'' فرسٹ کلاس چائے بناؤ، میں اَبھی آتا ہوں۔''

دوربین اُٹھا کر پستول لہراتاہؤا مغربی جانب والی ریلنگ پر آیا۔لم لیٹ ہونے والوں کا جائزہ لیتا رہا۔اُسے یقین ہوگیا کہ وہ مرچکے ہیں۔اسی دوران کشتی اُس کے اور پتن کے بیچ حائل ہوگئی۔اُس نے دوربین کی مدد سے کشتی کے اندر بیٹھے ہوؤں کو دیکھا۔وہ واقعی این جی او کے کارکن تھے۔سبھی ڈرے ڈرے انداز میں اُس کی جنت کو دیکھ رہے تھے۔

پلٹ کر دیکھا۔دوسری کشتی بھی چل پڑی تھی۔اُس نے ہاتھ کے اشارے سے اُنہیں رفتار تیز کرنے کا حکم دیا۔بجائے رفتار تیز کرنے کے مُہانوں نے کشتی کا رُخ جنت کی طرف کردیا۔پروفیسر نے چیخ کر کہا''اَبے اُلو کے پٹھو!زندگی سے دشمنی نہ کرو،یہاں سے بھاگ جاؤ۔''

ایک آدمی کشتی کے تکونی عرشے پر کھڑا ہوکر ہاتھ لہرانے لگا۔پروفیسر نے دوربین کے لینز کو اُس کے چہرے پر فوکس کیا تو چونک پڑا۔وہ افتخار بیگ تھا۔پروفیسر کی گدی میں سرسراہٹ ہونے لگی۔وہ یہاں کیوں آیا تھا؟ساگر فاؤنڈیشن کے ساتھ یہاں آنے کا کیا مقصد ہوسکتا تھا؟وہ سوچ میں پڑ گیا۔کشتی قریب آئی تو اُس نے چیخ کر دریافت کیا''تم کیا کررہے ہو؟''

''سرجی!ہم مصباح کی لاش کو تلاش کررہے ہیں؟''

پروفیسر نے تعجب سے پوچھا''تمہیں کس نے کہا ہے کہ وہ مرچکی ہے؟''

''قریب آنے دیں سر!میں آپ کو پوری تفصیل بتاتا ہوں۔''افتخار نے کہا۔کچن میں کھڑی مصباح کے کانوں میں افتخار کی آواز پڑ چکی تھی۔وہ دوڑ کر باہر آئی۔پروفیسر نے اُسے یوں آتے دیکھ کر دانت پیسے اور پستول کا رُخ اُس کی جانب کردیا۔غرا کر بولا''کچن میں واپس چلی جاؤ ورنہ گولی ماردوں گا۔''

اُس کے لہجے میں موت کی سی سنگینی تھی۔مصباح ٹھٹک کر رُک گئی۔کبھی افتخار کی کشتی کو دیکھتی،کبھی پروفیسر کے ہاتھ میں دَبے ہوئے پستول کو دیکھتی،اچانک شکست خوردہ انداز میں سر جھکا کر کچن میں گھس گئی۔پروفیسر نے پستول والا ہاتھ کشتی کی طرف بڑھا دیا۔چیخ کر بولا''جو کررہے ہو،کرتے رہو۔اِدھر آنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ سب لوگوں کو بھون ڈالوں گا۔''

افتخار کی نظر مصباح پر شاید نہیں پڑی تھی۔اگر اُس نے دیکھا بھی تھا تو یہی سمجھا ہوگا کہ وہ پروفیسر کا

کوئی دوست ہے کیونکہ مصباح مردانہ لباس میں دور سے مرد ہی دکھائی دیتی تھی۔

افتخار نے اپنی درخواست دہرائی مگر پروفیسر ٹس سے مَس نہ ہوا۔ افتخار نے مُہانوں کو کشتی کا رُخ پھیرنے کا اشارہ کیا۔ ایسے میں پتن پر چھپ جانے والے دونوں آدمی دکھائی دیے۔ پروفیسر نے پوچھا ''اے! کیا وہ لوگ بھی تمہارے ساتھ ہیں؟''

افتخار نے اُدھر دیکھا۔ وہ پروفیسر اور پتن پر کھڑے ہوؤں کے وسط میں کھڑا تھا۔ پہچان کر جنت کی طرف منہ کر کے بولا ''وہ تو ڈاکٹر اَشولال کھڑے ہیں، شاید آپ سے ملنے کیلئے آئے ہیں۔''

پروفیسر کے منہ سے دانتوں کی کڑکڑاہٹ کی آواز برآمد ہوئی۔ کرخت لہجے میں بولا ''میں اُن سے مل لیتا ہوں، تم نکل جاؤ۔''

کشتی آگے بڑھنے کے بجائے پتن کی طرف کھسکنے لگی۔ افتخار بیگ آگے جانے کے بجائے اشولال کی طرف بڑھنے لگا۔ پروفیسر نے دانت کچکچائے اور اُسے دھمکیاں دیں مگر اُس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اشولال اور اُس کا ساتھی دونوں پانی کے بہاؤ کے رُخ پر جنوب کی طرف چلنے لگے۔

پروفیسر پستول ہاتھ میں پکڑے کچن میں آیا۔ مصباح چائے کے بھرے دو کپ ٹرے میں رکھے کچن کی عقبی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ وہ خاموشی سے رو رہی تھی۔ پروفیسر اُس کے قریب آیا۔ پستول کی نال اُس کے ماتھے پر دونوں اَبروؤں کے درمیان رکھتے ہوئے بولا ''تم اپنی زندگی مجھے دَان کر چکی ہو۔ مجھے چھوڑ کر جاؤ گی تو خون میں نہلا دوں گا۔ تمہاری لاش کا کوئی بھی وارث بن جائے، مجھے دُکھ نہیں۔ تمہارے حرارت بھرے بدن پر کوئی اپنی ملکیت کو ظاہر کرنے والی نیم پلیٹ لگائے، یہ ممکن نہیں۔''

''مجھے ایک بار افتخار سے ملنے دیں، وہ مجھے تلاش کر رہے ہیں۔''

''تجھے نہیں، تمہاری لاش کو......''

''ایسے ہی سہی، وہ میری لاش کو ہی تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ پلیز سر!'' وہ ملتجیانہ لہجے میں بولی۔

''تم مجھے چھوڑ جاؤ گی۔'' پروفیسر کی آنکھوں میں وحشت عود کر آئی۔

''میں کہیں نہیں جاؤں گی، مجھ پر اعتبار کیجئے۔'' اُس نے ٹرے رکھ کر ہاتھ جوڑ دیے ''خدا کیلئے

مجھے ایک بار ملنے دیجئے۔ میں اُن کے ساتھ کہیں نہیں جاؤں گی۔‘‘

پروفیسر نے اُس کے بندھے ہوئے ہاتھوں کو ایک جھٹکے سے علیحدہ کر دیا اور درشت لہجے میں کہا ’’میں پہلے دو مرتبہ اعتبار کا زہر اپنی روح میں اُتار چکا ہوں۔ اَب نہیں۔ میں فون پر تمہاری بات تمہارے گھر والوں سے کروا دوں گا۔‘‘

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی ’’آپ کو مجھ پر بھروسہ کیوں نہیں ہے آخر؟ کہہ تو رہی ہوں کہ کہیں نہیں جاؤں گی۔‘‘

اُس کے ہونٹوں پر سفاک مسکراہٹ اُبھری۔ چائے کا ایک کپ اُٹھا کر ہونٹوں سے لگاتا ہوا بولا ’’چائے اُٹھاؤ، بیڈروم میں چلو۔ باہر نکلنے کی کوشش کرو گی تو گولی تمہاری کھوپڑی میں اُتر جائے گی۔ چلو شاباش!‘‘

وہ سہمی سہمی سی چائے اُٹھائے بیڈروم میں چلی گئی۔ پروفیسر نے دروازہ لاک کر دیا۔فون، پستول اور چائے اُٹھا کر عرشے پر آ گیا۔فون کی سکرین پر اجنبی نمبر دیکھا۔اُس کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اُسی نمبر سے کال آ گئی۔کال ریسیو کی۔ پوچھا ’’کون؟‘‘

’’پیارا سئیں! میں اَشولال فقیر بول رہا ہوں،تم سے ملنے کیلئے میں اور مزار خان صبح سے پتن پر کھڑے ہیں۔ بھلے آدمی! اتنا بھی کوئی انتظار کرواتا ہے کیا؟‘‘

’’تم کیا کرنے آئے ہو؟‘‘ پروفیسر کا لہجہ غیر متوقع طور پر درشت تھا۔

’’تمہیں ملنے اور دیکھنے کیلئے آئے ہیں، اپنی بوٹ بھیج دو۔‘‘

’’نہیں مُرشد!‘‘ پروفیسر نے کٹیلے لہجے میں کہا ’’تم واپس چلے جاؤ۔ پھر آنا۔ بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ ناراض بھی نہ ہونا۔‘‘

اَشولال کی آواز خاموش ہوگئی۔ اُسے شاید پروفیسر کے اِس رویے کی کبھی بھی توقع نہیں رہی تھی۔ فون کے سپیکر سے کئی آوازیں سنائی دے رہی تھیں مگر اُن کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد کال منقطع کر دی گئی۔ پروفیسر نے چائے کا گھونٹ حلق میں اُتارا اور کپ ٹیبل پر رکھ کر سگریٹ سلگانے لگا۔ کشتی پتن پر ٹھہری دکھائی دے رہی تھی۔ نہ جانے سب لوگ نیچے اُتر کر کیا باتیں کر رہے

تھے۔ پروفیسر کوتشویش لاحق ہوئی۔ ڈاکٹر اَشو کے فون پر کال بیک کی۔ رابطہ ہونے پر بولا ''مرشد! ساگر فاؤنڈیشن والے یہاں کیوں ٹھہرے ہوئے ہیں؟''

اَشولال کے لہجے میں ناراضی کا عنصر نمایاں تھا ''تمہیں اِس سے کیا سئیں! تم اپنی جنت میں خوش رہو، یہ اپنی جہنم میں جلتے ہوئے یہاں سے گزر جائیں گے۔''

''تم نے اِنہیں بتایا نہیں مُرشد کہ سندھو سئیں کبھی اپنے تل سے چمٹے ہوؤں کو لوٹاتا نہیں ہے۔ یہ کیوں اپنا وقت برباد کر رہے ہیں۔'' اُس کے لہجے میں زہر ہی زہر بھرا ہوُا تھا۔ ایسے ہی وقت میں بیڈ روم کی کھڑکی سے مصباح کی آواز سنائی دی ''سر پلیز! مجھ پر اعتبار کریں۔ میں آپ کی ہوں، جہاں بھی گئی، پلٹ کر آپ کے پاس ہی آؤں گی۔ مجھے افتخار سے ملنے دیجئے۔ میں خدا کا واسطہ دیتی ہوں ......''

اُس نے گھور کر کھڑکی میں دیکھا اور پستول لہرا کر اُسے خاموش کرا دیا۔ اَشولال نے فون میں پوچھا ''تمہاری جنت میں تمہارے علاوہ اور کون موجود ہے؟''

وہ حلق کے بَل چیخا ''جو کوئی بھی ہے، تمہیں اِس سے کیا؟''

''میں جانتا ہوں سئیں!'' اَشولال کے لہجے سے برہمی عود کر رہی تھی ''تمہارے پاس کوئی اور نہیں، مصباح ہے، ہمیں جنت میں آنے دو ورنہ معاملہ بہت بگڑ جائے گا۔''

پروفیسر بھونچکا رہ گیا۔ اَشولال نے کیسے اتنے یقین سے کہہ دیا تھا کہ مصباح جنت میں ہے؟ وہ بولا ''یہاں کوئی مصباح وصباح موجود نہیں ہے، معاملہ خراب کرنا چاہتے ہو تو جی بھر کر بگاڑ لو۔ مجھے کسی کا خوف نہیں ہے۔''

یہ کہہ کر اَشولال کی بات سنے بغیر اُس نے کال منقطع کرنے والا بٹن پش کر دیا اور کپ میں موجود تمام چائے ایک ہی گھونٹ میں پی گیا۔ بیڈ روم کی طرف جاتے ہوئے بڑبڑاتا جاتا تھا ''سب ایک سے ہیں، سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ کوئی بھی میری پَل بھر کی خوشی کو برداشت نہیں کر پاتا۔ ہاہ! دُنیا کی روندی مسلی ہوئی ایک لڑکی نے اگر میری جھولی میں محبت کی خیرات ڈالنے کی جرأت کر ہی لی ہے تو سب اُلو کے پٹھے اُسے مجھ سے چھیننے کیلئے پہنچ گئے ہیں۔''

بیڈروم میں داخل ہوا۔ کھڑکی کے اَدھ کھلے طاق سے ماتھا ٹکائے ہچکیاں لے کر روتی ہوئی مصباح کو دیکھا۔ قریب آ کر بولا ''میری جان! تم چوٹی کے بالوں سے لے کر پیروں کے ناخنوں تک میری ہو۔ میری جنت کی حور ہو۔ جئو گی تو میرے ساتھ، مرو گی تو میرے ساتھ۔ میں تمہاری جدائی ایک پل کیلئے بھی برداشت نہیں کرسکتا۔ کم آن مصباح!''

وہ وہیں بیٹھی رہی۔ پروفیسر کی تشنہ بانہیں اُس کی طرف لپکیں۔ اُسے اٹھا کر ایڑیوں کے بَل گھومنے لگا۔ وہ بالکل مزاحمت نہیں کر رہی تھی۔ اُسے پیروں پر کھڑا کیا تو وہ قدموں میں گر گئی۔ پیروں کو تھام کر گھگھیانے لگی۔ اپنے پیاروں سے ملنے کی اجازت طلب کرنے لگی۔ وہ بولا ''مصباح! تم اُن لوگوں کے کام کی نہیں رہی ہو، اُنہیں بھول جاؤ۔ اِسی میں بہتری ہے۔ وہ تمہیں مُردہ سمجھ کر رو پیٹ بیٹھے ہیں۔ مجھے رُلانے کی کوشش نہ کرو۔''

وہ اچانک اُٹھ کر حلق کے بَل چیخنے لگی ''میرے دو بھائی ہیں۔ مجھ پر جان دیتے ہیں۔ عمران کبھی بھی مجھے مُردہ تسلیم نہیں کرے گا۔ اُسے جب تک میں نہیں ملوں گی، وہ چین سے نہیں بیٹھے گا۔ جب میں نے ایک بار کہہ دیا ہے کہ میں آپ کے پاس لوٹ آؤں گی تو پھر کیوں مجھے بے اعتبار سمجھ کر قید میں کئے بیٹھے ہو؟ چھوڑ دو مجھے۔ جانے دو۔ محبت قید کا نام نہیں ہے۔ محبت کسی اور جذبے کا نام ہے۔''

اُس کے آنسو تھم چکے تھے۔ آنکھوں میں وحشت عود کر آئی تھی۔ پروفیسر کو اِس سے وہ بھوکی بلی لگی۔ ایک قدم پیچھے ہٹا۔ دائیں ہاتھ کا زوردار طمانچہ اُس کے منہ پر جڑ دیا۔ پھر دوسرا، پھر کئی۔ وہ قالین پر ڈھیر ہوگئی۔ پھٹی پھٹی آواز میں کراہنے لگی ''مجھے مار ڈالو۔ مجھے قتل کردو۔ دریا میں پھینک دو۔ مجھے یہ زندگی نہیں چاہیے۔ مجھے یہ خیرات نہیں چاہیے۔''

پروفیسر نے اسے بانہوں میں بھر کر اُٹھایا اور بیڈ پر لٹا دیا۔ خود اُس کے متوازی لیٹ کر اس کے گال سہلانے لگا۔ اُس کی اپنی آنکھوں میں بھی نمی تیر رہی تھی۔ گلوگیر لہجے میں بولا ''تم بھی مجھے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتی ہو۔ میں بُرا نہیں ہوں۔ میں نفسیاتی مریض نہیں ہوں اور نہ ہی مجھے تمہارے پچھلوں سے کوئی دشمنی ہے۔ میں نے کہا ناں کہ تجھے تمہارے والدین سے ضرور ملواؤں گا۔ تمہارے بھائیوں کو یہاں بلوا کر پُراہتمام ضیافت کروں گا۔ اِس وقت ضد نہ کرو۔ اُنہیں جانے دو، پھر بیٹھ کر

بہت سی باتیں کریں گے۔تم جیسے کہوگی، ویسے کروں گا۔پلیز! مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔''

وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے پروفیسر کو دیکھ رہی تھی جو ایک پل میں تولا بن کر ٹوٹ پڑا تھا، دوسرے پل میں ماشہ بن کر زمین سے چپک گیا تھا۔ وہ اُس کے عضوعضو کو سراہ رہا تھا۔ اپنے تشدد کی معافی مانگ رہا تھا اور وہ بے جان وجود لئے خاموش لیٹی تھی۔ اُس کے پاس ایسا کچھ بھی نہیں تھا جسے بچانا ضروری خیال کرتی۔اُس کی ہیجانی شخصیت سے خوفزدہ ہونے کے باوجود اُس پر اعتماد کرتی تھی۔ وہ قاتل ہوسکتا تھا، درندہ نہیں۔

...●...

سورج نے تپش اُتارنی شروع کردی۔ ڈاکٹر اَشولال نے افتخار سے کہا''تم دوسری کشتی میں سوار اپنے ساتھیوں سے موبائل فون پر رابطہ کرو۔ اُنہیں کہو کہ وہ لمبا چکر کاٹ کر یہاں پہنچ جائیں۔جس حد تک ممکن ہو، جنت سے دور رہیں۔''

عمران اُس کے قریب ہوکر اُمید بھرے لہجے میں سوال کناں ہوا''ڈاکٹر صاحب! کیا آپ کو یقین ہے کہ مصباح اِسی کشتی میں موجود ہے؟''

ڈاکٹر نے منہ آسمان کی جانب اُٹھایا۔ چہرے پر کئی بےعنوان تاثرات پھیلے، سمٹے، بولا''بیٹا! مجھے یقین کی حد تک شبہ ہے کہ وہ پروفیسر کے پاس ہے۔''

''دکھائی تو نہیں دی۔''افتخار نے کہا۔

''میں نے بھی نہیں دیکھی مگر وہ وہیں ہے۔''

اِسی دوران میں ڈاکٹر اَشولال کے فون پر گھر سے کال آئی۔ کال موصول کرتے ہی بولا''کہو! پلاٹ میں کیا ہورہا ہے؟''

''آپ کو کشتی کی فکر ہے، بچوں کے کھلونوں کی فکر ہے مگر بچوں کی فکر کیوں نہیں ہے؟ میرا خیال ہے کہ آپ نے ہنس کی پریشانی کو سنجیدگی سے لیا ہی نہیں ہے۔'' شناں کے لہجے میں غصے کا عنصر غالب تھا۔

’’یہ وقت اِن باتوں کا نہیں ہے۔ مجھے بتاؤ، قسمت کیا کر رہی ہے؟‘‘

’’کیا کرنا ہے اُس نے؟ پوڈو اور فینی کے ساتھ باتیں کر رہی ہے اور ہنس اُس سے کچھ فاصلے پر منہ پھلائے بیٹھا ہے۔ میرے کہنے کے باوجود اُس نے اَبھی تک ناشتہ بھی نہیں کیا۔‘‘

’’قسمت سے پوچھ کر بتاؤ کہ پوڈو کے ساتھ بیٹھی ہوئی گڑیا کا نام فینی ہی ہے ناں؟‘‘ اَشولال نے کن اکھیوں سے متعجب کھڑے مزار خان کی طرف دیکھا۔

شناں نے تھکا تھکا سانس حلق سے خارج کیا۔ نہ چاہتے ہوئے قسمت سے پوچھا۔ فون اُس کے منہ کے قریب کر دیا۔ ڈاکٹر کے کانوں میں قسمت کی آواز اُتری ’’جی آنٹی! یہی تو فینی ہے۔‘‘

ڈاکٹر نے جلدی سے کہا ’’قسمت بیٹا! میں تمہارا انکل بول رہا ہوں۔ بتاؤ، کیا فینی پوڈو کے پاس ہی رہے گی یا اپنے گھر چلی جائے گی۔‘‘

قسمت کے سانسوں کی آوازیں فون کے سپیکر سے پھوٹنے لگیں۔ وہ کچھ نہیں بولی تو ڈاکٹر نے اپنا سوال دہرایا۔ وہ گلوگیر لہجے میں بولی ’’انکل! فینی کی مرضی، وہ پوڈو کے پاس رہے یا میرے ساتھ چلی جائے۔‘‘

ڈاکٹر اَشولال کو ایک ترکیب سوجھی، پیار سے بولا ’’بیٹا! فینی تو تمہاری ہے، اسے اپنے ساتھ لے جاؤ ورنہ وہ بھوک اور پیاس سے مر جائے گی۔‘‘

’’تو میں اپنے ساتھ لے جاؤں انکل!‘‘ قسمت نے معصومیت سے پوچھا۔

’’ہاں بیٹا! پوڈو بہت بُرا ہے۔ تمہاری فینی کو خراب کر دے گا۔‘‘

’’انکل! پھر ہنس کیسے کھیلے گا؟‘‘

’’وہ پوڈو کے ساتھ کھیلتا رہے گا بیٹا! تم اُس کی فکر نہ کرو۔ فینی کی فکر کرو۔ وہ تمہارے بغیر بہت اُداس ہو گی۔‘‘ ڈاکٹر اَشولال کے لہجے میں شہد گھل رہا تھا۔

’’دیکھ لیں انکل! میں فینی کو لے جاؤں گی تو آپ ناراض ہوں گے۔‘‘ قسمت نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا تو پروفیسر کا ماتھا ٹھنکا۔ تشویش بھرے لہجے میں بولا ’’میں کیوں ناراض ہوں گا؟ فینی اپنے گھر چلی جائے گی تو مجھے خوشی ہو گی۔‘‘

اچانک روتی ہوئی قسمت کھلکھلا کر ہنس پڑی۔شوخ آواز میں بولی ''آپ کو بھی نہیں پتہ انکل!''

پتن پر اضطراب کے عالم میں کھڑے سب لوگوں کی نگاہیں ڈاکٹر اَشولال پر جمی ہوئی تھیں۔وہ ایک دوسرے کو نگاہوں کے ذریعے سمجھا رہے تھے کہ اُنہوں نے اَشولال کی بات پر کان دھرتے ہوئے دانش مندی کا ثبوت نہیں دیا۔عمران نے خاصے اکھڑ لہجے میں کہا ''ڈاکٹر صاحب! کیا یہ وقت اتنا ہی غیر اہم ہے کہ آپ بچوں کے ساتھ بچگانہ باتیں کرنے بیٹھ جائیں۔ ہمارے لئے کچھ کر سکتے ہیں تو کریں ورنہ ہمیں جانے دیں۔''

مزار خان نے شکوہ کناں نگاہوں سے اُسے دیکھا۔اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں بولا ''بیٹا! مُرشد غیر ذمہ دار انسان نہیں ہیں۔وہ جو بھی کر رہے ہیں، مصباح کی سلامتی کیلئے ہی کر رہے ہیں۔''

افتخار نے منہ بنایا ''بچوں کو بہلاتے ہوئے، ہیں؟''

مزار خان کچھ کہنا چاہتا تھا کہ ڈاکٹر نے ہاتھ کے اشارے سے خاموش کرادیا۔فون منہ سے ہٹا کر بولا ''افتخار کے علاوہ آپ سب لوگ میری طرف سے آزاد ہیں، جو کرنا چاہیں، کر گزریں۔ میں جو کر رہا ہوں، میں ہی اُس کی نوعیت سے آگاہ ہوں۔''

افتخار نے آگے بڑھ کر ہاتھ تھام لیا۔فرطِ جذبات سے گلوگیر لہجے میں بولا ''ڈاکٹر صاحب! آپ ہماری ذہنی کیفیت کو مدنظر نہیں رکھ رہے۔ آپ جیسے صاحبِ درد آدمی کو ناراضی زیب نہیں دیتی۔ ہماری مصباح مر چکی ہے، آپ کی مصباح اگر زندہ ہے تو اُس کیلئے خدارا کچھ کیجئے۔ ہم پر احسان ہوگا، ہماری نسلیں بھی اس احسان کو اتار نہیں پائیں گی۔''

عمران کا چہرہ سرخ ہوگیا۔مشتعل ہوکر بولا ''تم سب بزدل ہو۔کھڑے کھڑے باتیں کرنے کے سوا کچھ کرنے کے قابل نہیں ہو۔چلو مظہر! ہم دونوں پروفیسر کی کشتی میں جاتے ہیں، اگر مصباح ہوئی تو لے آئیں گے ورنہ آگے بڑھ جائیں گے۔''

مظہر نے ایک نظر ڈاکٹر اَشولال کی طرف دیکھا اور عمران کے ساتھ قدم بڑھا دیے۔ وہ ذاتی طور پر عمران کا ہم خیال تھا۔ڈاکٹر اَشولال کا رویہ اُسے ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔کر گزرنے کا وقت باتوں میں گزر کر ضائع ہو رہا تھا۔مُہانوں نے کشتی کھینے سے انکار کر دیا۔اُنہیں علم تھا کہ پروفیسر کے پاس

جدید طرز کا اسلحہ کافی مقدار میں موجود تھا جبکہ وہ نہتے تھے۔

عمران اور مظہر دونوں نے چپو تھام لئے اور سبھی کے روکنے کے باوجود کشتی کی لانچہ کھول دی۔ اُنہیں کشتی کھینے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اُنہیں پانی کا سینہ چیرنے کا کوئی گر نہیں آتا تھا مگر اندر لگی ہوئی آگ اُنہیں پانی پر جنت کی طرف پھسلانے لگی۔ اُن کی رفتار بے حد سست تھی۔

مزار خان نے اَشولال سے کہا ''دونوں موت کے منہ میں گھس رہے ہیں، اِنہیں روکئے۔''

''عمران کو میں نہیں، قسمت روک سکتی ہے، اُس سے بات کر دیکھتا ہوں۔'' اَشولال کی پیشانی پسینے سے تر ہو گئی تھی۔

فون پر اپنی بیوی سے مخاطب ہوا۔ پوچھا ''کیا ہو رہا ہے؟''

''سامان کا بھرا ٹرک کالونی سے نکل گیا ہے، میاں بیوی اپنا ذاتی نوعیت کا سامان کار میں لا د رہے ہیں۔ قسمت اور ہنس الوداعی ملاقات کر رہے ہیں۔'' شناں نے تفصیل سے بتلایا۔

''کشتی کا منظر نامہ دکھاؤ۔''

''پوڈو اور فینی دونوں بدستور بیٹھے ہوئے ہیں۔'' شناں نے زِچ ہو کر کہا ''نہ جانے آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ آ کر دیکھیں تو سہی، میرے ہنس کی رو رو کر کیا حالت ہو رہی ہے؟''

ڈاکٹر نے ڈانٹ دیا۔ درشتی سے بولا ''کیا قسمت فینی کو اپنے ساتھ لے کر نہیں جا رہی؟''

''نہیں تو!''

''اُس سے میری بات کراؤ، ہری اَپ شناں!'' ڈاکٹر کے حلق سے چیختی ہوئی آواز برآمد ہوئی۔

اُس نے دریا کی طرف دیکھا۔ عمران اور مظہر دونوں بہت سست روی سے پانی چیر رہے تھے۔ اُن کے انداز سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کبھی بھی جنت تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ اُلٹے رُخ پر کشتی کو کھینے کیلئے مُہانوں کے فولادی بازو ہی کام آتے ہیں۔

شناں نے فون قسمت کے کان سے لگا دیا۔ اُس کی سسکیاں ڈاکٹر اَشولال کے دِل کو دہلانے لگیں۔ وہ اُس سے مخاطب ہوا ''قسمت بیٹا! تم اپنی فینی کو یہیں چھوڑے جا رہی ہو، شاید بھول گئی ہو۔''

قسمت نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ بہت کوشش کے بعد ڈاکٹر محض یہی اُگلوا سکا ''وہ یہیں ٹھیک ہے انکل!''

''نہیں بیٹا! وہ تمہارے پاس ٹھیک رہے گی۔''

''آپ سمجھتے کیوں نہیں ہیں؟'' وہ روتے روتے چیخ پڑی۔

''بیٹا پلیز! اُسے کشتی سے باہر نکال لو۔ اچھے بچے بڑوں کی بات مان لیتے ہیں۔''

''انکل! بڑوں کو بھی کبھی کبھی مان لینا چاہیے۔''

''آج تم مان جاؤ، کل میں تمہاری مان لوں گا بیٹا!'' اُس نے خوشامد کی۔

''ٹھیک ہے انکل!'' قسمت نے ہار مان لی اور فون شناں کے حوالے کر دیا۔ وہ بولی ''ڈاکٹر صاحب! ہنس دیوانوں کی طرح دوڑ کر گھر میں گھس گیا ہے۔ نہ جانے وہ کیا کرنے والا ہے؟''

''تم اُس کی فکر نہ کرو، قسمت کو دیکھو، وہ کیا کرتی ہے؟'' ڈاکٹر نے تیز لہجے میں کہا ''خدا کیلئے سنجیدہ ہو جاؤ شناں ورنہ بہت بڑا نقصان ہو جائے گا۔''

پتن پر کھڑے ساگر فاؤنڈیشن کے کارکنوں کو یقین ہو گیا کہ ڈاکٹر اَشولال محض وقت ضائع کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر رہا۔ وہ منہ بنا کر پرے ہٹ گئے اور اُس پر طنزاً رائے زنی کرنے لگے۔ مزار خان نے ڈاکٹر کا ہاتھ دَبایا ''مرشد! معاملہ بگڑ رہا ہے۔''

ڈاکٹر نے چونک کر مزار خان کی طرف دیکھا جو عمران اور مظہر عباس کی طرف متوجہ تھا۔ ڈاکٹر نے اُس کی تقلید کی۔ دیکھا اور بے اختیار چیخ اُٹھا ''عمران! رُک جاؤ، آگے مت جاؤ۔ وہ پاگل ہے، کچھ بھی کر سکتا ہے۔''

اُس کی چیخ عمران اور مظہر کے کانوں تک پہنچی، لفظ نہیں پہنچے۔ ڈاکٹر اور مزار خان نے ہاتھ لہرا لہرا کر اُنہیں واپس آنے کا اشارہ کیا مگر وہ نہیں رُکے اور آگے بڑھتے چلے گئے۔

دوسری کشتی بھی پلٹ کر اِسی طرف آ رہی تھی۔ مزار خان کے چہرے پر تشویش کے آثار دیکھ کر ڈاکٹر نے استفسار کیا۔ وہ بولا ''مرشد! دونوں کشتیوں کی حرکت دیکھ کر پروفیسر سمجھے گا کہ اُس پر حملہ کیا جا رہا ہے، وہ فائرنگ کر دے گا۔ نقصان ہو جائے گا۔''

ڈاکٹر نے ساگر فاؤنڈیشن کے ایک کارکن سے کہا ''دوسری کشتی والوں سے رابطہ کر کے اُنہیں دُور رہنے کی تاکید کرو۔''

اُس نے منہ بنا کر رُخ پھیر لیا۔ڈاکٹر نے پیر پٹخے اور دوسرے کارکن سے درخواست کی۔وہ بولا ''پلیز ہمیں ڈسٹرب نہ کریں۔ہمیں آپ کی بے مقصد حرکتوں کی سمجھ نہیں آ رہی۔''

مزار خان نے ڈاکٹر کے ہاتھ سے موبائل پکڑا، کال چل رہی تھی، رابطہ منقطع کر کے پروفیسر کا نمبر ملانے لگا۔پروفیسر نے کال اٹینڈ نہیں کی۔اُس نے جھنجلا کر فون ڈاکٹر کو تھما دیا اور زیر لب بڑبڑایا ''اللہ سوہنا خیر کرے پر خیریت کی اُمید معدوم ہوتی جاتی ہے۔''

ڈاکٹر کا پورا بدن کانپ رہا تھا۔ہونٹوں کی رنگت بدلنے لگی تھی۔شناں سے رابطہ کرتے ہوئے بولا ''مزار خان! سگرٹ سلگا کر دو۔کام بگڑ رہا ہے۔''

کام بگڑ گیا۔اچانک پروفیسر نے عرشے پر آ کر عمران اور مظہر پر برسٹ مارا۔تڑتڑاہٹ کی تیز دہشت ناک آواز نے ماحول کو خوفناک بنا دیا۔مظہر اور عمران لہرا کر کشتی میں گرے اور کشتی نے اچانک اپنی سمت بدل لی۔وہ پانی کے بہاؤ کے رُخ پر تیزی سے جنت سے دور ہونے لگی۔

پروفیسر نے گن کا رُخ دوسری کشتی کی طرف کر دیا۔اَب کے اُس نے برسٹ نہیں مارا تھا بلکہ یکے بعد دیگرے چند گولیاں داغیں۔اَشو لال گھٹنوں کے بَل زمین پر گر گیا۔مزار خان نے سہارا دے کر کھڑا کیا اور لرزتی ہوئی آواز میں کارکنوں کو عمران یا مظہر سے رابطہ کرنے کا حکم دیا۔

چند لمحوں میں ہی پتہ چل گیا کہ دونوں بال بال بچے تھے۔دوسری کشتی والے جنت کی طرف پیش قدمی کو ترک کر کے عمران کی کشتی کی طرف تیزی سے بڑھنے لگے۔

ڈاکٹر کے کانوں میں شناں کی آواز گونجی ''ڈاکٹر صاحب! ہنس لالٹین اور ماچس اُٹھا کر پلاٹ میں گھس گیا ہے۔میرا خیال ہے وہ کشتی کو طیش میں آ کر جلا دینا چاہتا ہے۔''

وہ حلق کے بل چیخا ''اُسے روکو شناں! اُسے روکو...... بھاگو......''

اچانک رابطہ منقطع ہو گیا۔ڈاکٹر اِدھر اُدھر دوڑ رہا تھا۔کبھی کسی کے پاس پہنچ کر چیختا ''اُسے روکو، وہ جنت کو آگ لگا دے گا۔''

کبھی دوسرے کے پاس جاتا'' وہ پاگل ہے، غصے میں ہے، اُسے روکو، وہ سب کچھ تباہ کردے گا۔''

اچانک پروفیسر نے عرشے پر کھڑے ہوکر پتن کی طرف چند فائر داغے۔ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اُس نے دہشت زدہ کرنے کیلئے فائرنگ کی ہے، کسی کا نشانہ نہیں لیا تھا۔ سبھی اِدھر اُدھر لڑھک گئے۔

اَشولال پھٹی پھٹی نگاہوں سے جنت کو دیکھ رہا تھا۔ وہ پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔ اُس کی حالتِ زار کو دیکھ کر کوئی بھی بہ آسانی اُس کے فاترالعقل ہونے کا دعویٰ کرسکتا تھا۔ پروفیسر نے گن دریا میں پھینک دی۔ بھاگ کر کسی کمرے میں گھس گیا۔ واپس آیا تو اُس کے ہاتھ میں تیل کا کین دَباہوُا تھا۔ ڈھکن کھول کر دوڑتے ہوئے جنت کے مختلف حصوں پر تیل چھڑکنے لگا۔ اُس نے چند ہی لمحوں میں کین خالی کرکے دریا میں پھینک دیا اور عرشے پر اُن کی جانب منہ کرکے کھڑا ہو گیا۔

مزار خان کے ہاتھ میں دَبے ہوئے موبائل فون پر پروفیسر کی کال آنے لگی۔ اُس نے جلدی سے کال ریسیو کی، حلق کے بَل چیخا'' پروفیسر! یہ کیا کر رہے ہو؟''

اَشولال نے بڑی سرعت سے فون پر جھپٹا مارا۔ اپنے کان سے لگاتے ہوئے بولا'' پروفیسر! خدا کیلئے خود کو سنبھالو۔ تم بہت بُرا کرنے چلے ہو۔''

''ہا...... ہاہاہا...... تم نے جہنم کی آگ دیکھی ہے، آج جنت کی آگ کو دیکھو۔ دُنیا کو بتانا کہ تمہاری آنکھیں دُنیا سے الگ تر ہیں جنہوں نے جنت کو بھی جلتے ہوئے دیکھ رکھا ہے۔'' پروفیسر نے ہیجانی انداز میں قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

اَشولال کا سانس سینے میں ہی اَٹکنے لگا۔ لرزتی ہوئی آواز میں بولا'' تم اپنی جنت کو کیوں آگ دکھانا چاہتے ہو، یہ کوئی معمولی پراجیکٹ نہیں تھا، تمہارا خواب تھا جسے دیکھنے کیلئے پوری دُنیا بے تاب ہے۔ خدا کیلئے اِسے آگ مت لگاؤ۔''

''تم میری فکر نہ کرو مُرشد!'' پروفیسر کی آواز آگ کا گولا بن کر اُس کے کانوں میں اُتر گئی'' مجھے دُنیا کی کوئی پرواہ نہیں۔ تم سب لوگ مجھ سے مصباح کو چھیننے کیلئے آئے ہو، میں جانتا ہوں۔ تم بھی جان لو کہ جنتی، جنت اور حور...... دُنیا، آدم اور حوا...... کسی کے نہیں، فقط آگ کے ہیں۔ کوئی مجھ سے

میری مریم کو چھین نہیں سکتا، رُباب جنت سے نکل کر نہیں جا سکتی ،تم یہاں قدم نہیں رکھ سکتے۔ یہ مصباح ہے، میری جنت کی حور، سموں نہیں ہے جسے میں نے تمہارے حوالے کر دیا تھا۔''

''ٹھیک ہے، تم مصباح کو اپنے پاس رکھو، ہم چلے جاتے ہیں۔'' ڈاکٹر نے جلدی سے کہا۔

''اَب کچھ بھی نہیں ہو سکتا مُرشد! تم لوگوں نے میری حور کے دِل میں بغاوت بھر دی ہے، تمہارے جانے کے بعد وہ بھی چلی جائے گی۔ میں یہ نہیں چاہتا۔ اُسے ہمیشہ اپنے پاس رکھوں گا...... اس کیلئے ایک ہی طریقہ باقی بچا ہے۔ وہ ہے لائٹر کا ننھا سا شعلہ۔''

''خدا کیلئے پروفیسر! بس کرو۔ اپنی جنت کو جہنم مت بناؤ۔''

''تم میری فکر نہ کرو، اپنی فکر کرو۔''

ایسے ہی وقت میں ''ٹوں ٹوں'' کی آواز نے ڈاکٹر کو بے چین کر دیا۔ شناں رابطہ کر رہی تھی۔ اُس نے جلدی سے پروفیسر کی کال منقطع کی اور شناں سے رابطہ کیا۔ پوچھا ''ہاں شناں! کیا بات ہے؟ جلدی بولو۔''

شناں رو رہی تھی۔ سسکیوں کے درمیان کہہ رہی تھی ''ہنس نے لالٹین میں بھرا ہوُا مٹی کا تیل کشتی پر چھڑک کر آگ لگا دی ہے۔ پاس بیٹھ کر اونچی آواز میں رو رہا ہے، قسمت کو بلا رہا ہے۔''

ڈاکٹر اَشولال کے ہاتھ سے فون چھوٹ کر نیچے جا گرا۔ مزار خان نے اُٹھایا، کان سے لگایا، چیخ کر بولا ''بھابھی! تم بھاگ کر پوڈو اور فینی کو کشتی سے نکال لو، ہاتھ جلنے کی پرواہ مت کرو۔''

شناں نے جواب دیا ''بھائی! قسمت بھاگ کر کشتی کی طرف جا رہی ہے، کیا اُسے روکوں؟''

''نہیں نہیں پلیز! اُسے کرنے دو، جو کرتی ہے۔''

کانوں میں شناں کی آواز پڑ رہی تھی مگر آنکھیں سامنے کا منظر دیکھ کر ٹھہر سی گئیں۔ پروفیسر نے اپنا ہاتھ فضا میں بلند کیا، لہرا کر الوداعی سلام کیا اور لائٹر کا بٹن دَبا دیا۔ ننھا سا شعلہ دور سے دکھائی نہیں دیا تھا، بھانبڑ دکھائی دینے لگا۔ آن کی آن میں پوری جنت سرخ شعلوں کی لپیٹ میں آ گئی۔ اَشولال اور مزار خان کا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ یوں لگا جیسے بھونچال آ گیا ہو۔ شعلوں کے بیچ میں دو انسان دکھائی دیے۔ دونوں بغلگیر تھے۔ پروفیسر اُس کے چہرے پر جھکا ہوُا دکھائی دیا۔ جونہی پروفیسر نے

اُسے سینے سے لگائے رکھتے ہوئے گول چکر کاٹا، اَشو اور مزار خان کو اُس کے ساتھی کی کمر پر لہراتے سیاہ بال دکھائی دیے۔ دونوں کے منہ سے بیک وقت نکلا ''ہائے مصباح!''

ایسے ہی وقت میں مزار خان کے کان میں شناں کی چیختی آواز گونجی ''قسمت نے اپنی فینی کو اُٹھا لیا ہے بھائی! اُس بے چاری کا ہاتھ بھی جھلس گیا ہے۔''

شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ پروفیسر اُسے بانہوں میں بھرے آگ کے بیچ میں ایڑیوں کے بَل گھوم رہا تھا۔ اچانک ''کڑاک'' کی زوردار آواز کے ساتھ ہی جنت کا ستون سے رابطہ ٹوٹ گیا۔ وہ لہرائی اور تیز رفتاری سے جنوب کی سمت میں بہنے لگی۔ تڑتڑاہٹ کی آواز سنائی دی۔ بجلی کے سرکٹ شارٹ ہونے لگے تھے۔

اچانک پروفیسر نے مصباح کو کندھے پر ڈالا اور دوڑتا ہوا آگ میں گھس گیا۔ اُس نے پوری قوت سے مصباح کو دریا میں اُچھال دیا تھا۔ اَشولال کے حلق سے چیخ نکلی ''مزار خان! عمران کو کہو، فوراً مصباح تک پہنچے ورنہ وہ ڈوب جائے گی۔''

مزار خان کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ رابطہ نہیں کر پایا۔ بھائی کو سمجھانا نہیں پڑتا، بہن کو دیکھ کر سمجھ جاتا ہے کہ اُسے کیا کرنا ہے۔ عمران اور مظہر نے مصباح تک پہنچنے کیلئے اپنی زندگی بھر کی توانائی بروئے کار لا دی۔

پروفیسر کے کپڑوں نے آگ پکڑ لی تھی۔ چند ہی لمحوں میں وہ جل کر خاکستر ہو گیا، نظر کی حد میں رہتے ہوئے جنت کوئلہ بن کر پانی میں ڈوب گئی۔ ساگر خاموش ہو گیا، آسمان بین کرتا رہا۔ سیاہ دھوئیں کے مرغولے تاحدِ نگاہ دکھائی دیتے رہے اور کچی لکڑی کے جلنے کی خوشبو کافی دیر تک فضا میں رَچی رہی۔

پانی میں آگ لگی کس نے دیکھی ہے؟

اَشولال نے دیکھی تھی۔ آگ کے بجھنے سے پہلے ہی وہ بجھ گیا۔ نڈھال ہو کر زمین پر گر گیا۔ مزار خان کے سنبھالنے سے پہلے ہی بے ہوش ہو گیا۔ ساگر فاؤنڈیشن کا ایک کارکن بھاگ کر گلاس میں سندھو سئیں کا پانی بھر لایا اور ڈاکٹر اَشولال کے حلق میں ٹپکانے لگا۔

مزار خان کے کانوں میں شناں کی کانپتی ہوئی آواز اُتر رہی تھی ''ڈاکٹر صاحب! قسمت اپنی فینی کو اُٹھا کر چلی گئی ہے، کشتی جل گئی ہے اور میرا ہنس میری گود میں بے ہوش پڑا ہے۔ جلدی سے گھر آ جایئے، ہنس کو آپ کی ضرورت ہے۔''

مزار خان نے فون بند کر دیا اور اپنی بھیگی ہوئی آنکھوں پر بایاں ہاتھ رکھ کر سسکنے لگا۔ اُس کا لرزتا ہوا دایاں ہاتھ مُرشد کے ہونٹوں کے گوشوں سے بہتا ہوَا میلا پانی صاف کرنے لگا۔ زیرِ لب کچھ بڑ بڑا بھی رہا تھا۔ مزار خان نے کان لگائے، سنا ''ہائے سندھو سئیں! پروفیسر ٹھیک کہتا تھا۔ تم بہت ظالم ہو گئے ہو۔ تمہیں کسی پر رحم نہیں آتا۔''

قسمت نے جاتے ہوئے نہ ماننے والی بات کو زمانے سے منوانے کی پُر قوت کوشش کر ڈالی تھی۔

...❁...

(تمت بالخیر)